Khaak-o-Khoon

خاک و خون

مصنف

نسیم حجازی

حصہ اول

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دیباچہ

اس بوڑھے درخت کے نام

جو قریبا ایک صدی سے میرے گاؤں کی زندگی کا مرکز تھا۔گاؤں کے بچے اس درخت کی شاخوں پر جھولا ڈالا کرتے تھے۔گاؤں کے جوان اور بوڑھے اس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر پرانے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔اور عورتیں اس کے نیچے جمع ہو کرنئی دلہنوں کا استقبال کیا کرتی تھیں۔یہ درخت گاؤں کے کئی بچوں کی جوانی اور جوانوں کا بڑھاپا دیکھ چکا تھا۔

شاہراہ حیات پر میری زندگی کے نقوش اس درخت کے نیچے پہنچ کر ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔میں ایک ایسے سمندر کے کنارے رک جاتا ہوں۔جس کی سطح پر لہروں کی شکنیں نہیں ہیں۔لیکن اس کی گہرائیوں سے ہلکے، میٹھے اور نہ ختم ہونے والے نغمے بیدار ہوتے ہیں۔۔میں ایسی فضاؤں میں کھو جاتا ہوں جن کی وسعتیں قوس وقزح کے رنگوں سے لبریز ہیں۔

ان نغموں کی دل کشی اور رنگوں کی دل فریبی کا موہوم سا تصور لے کر عالم شعور کی طرف لوٹتا ہوں۔مجھے اس درخت کے پتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔میں اپنے ان ساتھیوں کو دیکھتا ہوں، جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔زندگی کے چہرے کی خفیف مسکراہٹیں اچانک قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔۔۔میں

اس درخت کے نیچے کھڑا ہوں، اور اسے اپنی چھوٹی سی دنیا کی بلند ترین شے سمجھتا ہوں، مجھ سے بڑے لڑکے اس کی ٹہنیوں پر چڑھ کر مسرت کے قہقہے لگاتے ہیں، اور میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ پھر میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں، جب کہ میں خود اس کی ٹہنی ٹہنی پر گھوم آیا کرتا تھا۔ اور مجھ سے چھوٹی عمر کے بچے میری طرف دیکھ کر پریشان ہوا کرتے تھے۔

ماضی حال کو اور حال مستقبل کو جنم دیتا ہے۔ اور بچپن کی مسکراہٹیں اور قہقہے جوانی کی دھڑکنوں، ولولوں اور امنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن زندگی کا یہ تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس درخت کے پتوں سے پیدا ہونے والی دھیمی اور میٹھی راگنی ان لوگوں کی چیخوں میں دب کر رہ جاتی ہے۔ جنھوں نے اس کی چھاؤں میں ہنستا اور مسکرانا سیکھا تھا۔

اگست ۴۷ء میں جب کہ مشرقی پنجاب کی ہزاروں بستیاں ''آگ اور خون'' کا طوفان دیکھ رہی تھیں۔ اس درخت کی جڑوں پر ان لوگوں کا خون بہہ رہا تھا، جو اسے پانی دیا کرتے تھے۔ اس کے نیچے ان جوانوں کی لاشیں تڑپ رہی تھیں، جو بچپن میں اس کی شاخوں پر جھولا ڈالا کرتے تھے۔۔۔ یہ میرے ساتھی، میرے عزیز اور میرے بزرگ تھے۔ ان کی لاشیں اس درخت کے پاس ہی ایک گڑھے میں دفن ہیں۔

اب میں خواب میں اس محفل کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھا کرتا ہوں۔ جو ہمیشہ کے لئے ویران ہو چکی ہے۔۔ میں ان مسکراہٹوں کو نہیں بھول سکتا، جو زندگی کے معصوم چہرے سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہیں۔ میرے کانوں میں اب بھی

وہی قہقہے گونجتے ہیں، جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے ہیں۔ یہ درخت آج بھی اپنی جگہ کھڑا ہے۔

اگر میں ایک مغنی ہوتا اور اس درخت کی شاخ سے ایک بربط بنا سکتا تو میں فضائے بیکراں کو ان بے چین روحوں کی فریاد سے لبریز کر دیتا، جو اس درخت کے نیچے کسی قافلہ سالار کا انتظار کر رہی ہیں۔۔

نسیم حجازی

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تعارف

بھارت نے تقسیم کے عمل اور پاکستان کے قیام کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔اس کے حکمرانوں کی اولین کوشش یہ تھی کہ پاکستان کے لئے حالات اتنے ناسازگار بنا دیے جائیں کہ اس کی تعمیر کسی محکم بنا پر نہ ہو سکے۔اور جونہی موقع ملے اسے نیست ونابود کیا جا سکے۔خواہ فسادات کی آگ سے، خواہ اقتصادی حربوں سے، خواہ داخلی انتشار سے۔خواہ فوجی کاروائی سے۔

چنانچہ اگست ۱۹۴۷ء میں ہی مسلح ہندو اور سکھ جتھوں نے اتنے وسیع پیانے پر مار دھاڑ اور آتش زنی کی کہ آناً فاناً سارا مشرقی پنجاب اس کی لپیٹ میں آ گیا۔اور پھر دہلی، اجمیر، یوپی کے شمالی اضلاع اور بھرت پور سے لے کر جموں وکشمیر تک کی تمام ریاستیں اس کی زد میں آ گئیں۔وہ آبادیاں جو صدیوں سے امن کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔اور جن کے تصور میں بھی یہ قیامت خیز مناظر نہ تھے۔تباہ ہو گئیں، سارا نظام معشیت درہم برہم ہو گیا۔ہزاروں مرد،عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔لاکھوں بے گھر ہوئے اور ہجرت پر مجبور ہو گئے۔انہیں کے خون اور آنسوؤں سے پاکستان کی تعمیر ہوئی۔

یہی وہ حکایات خونچکاں ہیں جنھیں نسیم حجازی نے اپنے ناقابل فراموش ناول ''خاک وخون'' میں پیش کیا ہے۔ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے ''خاک وخون'' کی اہمیت یہی نہیں کہ یہ دستان ہمارے ماضی کے بنیادی رو سے

تعلق رکھتی ہے اور اسے پڑھنے والے کے دلوں میں ۱۹۴۷ء کی ہولناکیوں کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ اور وہ اس خطہ زمین کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے، جو ہم نے بے مثال قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ نسیم حجازی کی بصیرت نے قوم کو جن خطرات سے خبردار کیا تھا، وہ پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔

تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد آج تک ہماری آزادی اور بقا کے دشمنوں کا نصب العین اکھنڈ بھارت ہے۔ تاکہ عملاً سارے برا عظم میں ہندو تہذیب و تمدن کی برتری کا سکہ رائج ہو سکے۔ اور وہ اس مقصد کی تکمیل کا کوئی موقعہ ضائع نہ کریں گے۔

پاکستان کے مسلمانوں کے اجتماعی احساس و شعور نے جنم دیا تا کہ وہ اپنے وطن میں اسلامی اقدار کی بنا پر ایک عادلانہ نظام برقرار رکھ سکیں۔ ہم اپنے ماضی کے ان بلند حوصلوں کے امین بن کر ہی اپنے حال اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ جن کی بدولت ۱۹۴۷ء میں "آگ اور خون" کے طوفان سے سرخرو ہو کر نکلے تھے۔ اس لئے ہمارے ماضی کی یہ داستان ہمارے مستقبل کے لئے ایک مستقل پیغام بھی ہے۔

محمد علی

(سابق وزیر اعظم پاکستان)

۳۰ مارچ ۱۹۷۴ء

پہلا حصہ

مسکراہٹیں

اسماعیل رہٹ کے قریب آم کے درخت کے نیچے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔اس کا بڑا بھائی غلام حیدر باغ کے کونے سے نمودار ہوا اور کدال زمین پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا ”اسماعیل ذرا بیلوں کو ہانکتے رہو، ابھی آدھا کھیت باقی ہے۔اور اس کے بعد باغ کو بھی پانی دینا ہے۔

اسماعیل نے حقے کی نے غلام حیدر کی طرف پھیر دی اور اٹھ کر سست رفتار بیلوں کو دو چار سانٹے رسید کیے اور پھر وہیں آ کر بیٹھ گیا۔

غلام حیدر نے چند کش لگانے کے بعد کہا ”تھوڑی دیر بعد کیاری بھی دیکھ آنا۔“

اسماعیل نے سوال کیا تم کہاں جا رہے ہو؟۔

”میں ذرا مجید کا پتا کر آؤں، کل ماسٹر نے پٹواری کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ وہ دو دن سے پھر غیر حاضر ہے۔آج میں نے اسے بہت پیٹا تھا۔“

اسماعیل نے مسکراتے ہوئے کہا ”پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں، میرے خیال میں تم اس کے ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہو جاؤ۔۔۔آج بھائی جان آئیں تو میں ان سے کہوں گا کہ اگر مجید کو پڑھانا ہے تو اس کی رکھوالی کے لئے اس کے باپ کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

''بھائی جان آج آئیں گے، تمہیں کس نے بتایا؟''۔

''ان کا نوکر ابھی آیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ شام تک آجائیں گے۔یہ اچھا ہوگا ،شاید اس کے ساتھ مجید کو بھی پڑھنے کا شوق پیدا ہوجائے۔''

''لیکن سلیم ابھی بہت چھوٹا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ یہ ماسٹر بہت مارتا ہے۔''

غلام حیدر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ قریب کے ایک کھیت میں ہل چلانے والے کسان نے آواز دی ''غلام حیدر شاید تمہارا برخوردار آرہا ہے۔''

غلام حیدر اٹھ کھڑا ہوا، اور اسماعیل نے اس کی تقلید کی، اور دونوں سرسبز کھیتوں کے درمیان دوسرے گاؤں کو جانے والی پگ ڈنڈی کو دیکھنے لگے۔

پانچ چھ لڑکے گدھوں کو سرپٹ دوڑاتے چلے آرہے تھے۔یہ سوار لکھنے کی تختیوں سے چابک کا کام لے رہے تھے۔مجید سب سے آگے تھا۔کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اٹھ اٹھ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔گدھوں کا مالک ان کے پیچھے چلا آرہا تھا۔وہ آج خلاف معمول غضب ناک تھا۔اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔اور زمین سے ڈھیلے اٹھا اٹھا کر ان کی طرف پھینک رہا تھا۔

غلام حیدر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے ،لیکن اسماعیل کا قہقہ سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

رہٹ کے قریب پہنچ کر مجید گدھے سے کود پڑا، اور دوسرے بچوں نے بھی اس کی تقلید کی۔وہ سب گدھوں سے اترتے ہی اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔لیکن باپ اور چچا کو دیکھ کر مجید نے بھاگنے کی جرات نہ کی۔

ان گدھوں کے مالک خیر دین کی اس وقت سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان شریر بچوں کے والدین جہاں بھی ہوں، اس کی گالیاں سنیں۔ لیکن یہ اس کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ سانس تیز اور گلا خشک ہونے کے بعد اس کی آواز دور تک سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کی پگڑی سر سے کھسک کر گلے کا ہار بن چکی تھی۔ رہٹ سے تھوڑی دور پہلے وہ کانٹوں کی باڑ میں الجھا، پھر پانی کی نالی میں گرا۔ غرض اس کے لئے وہ تمام اسباب پورے ہو چکے تھے۔ جنہیں مہذب سوسائٹی میں خودکشی کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایک گدھے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنا قومی ترانہ شروع کیا۔ لیکن خیر دین اس کی زندہ دلی کی داد دینے کی بجائے اس پر بے تحاشا لاٹھیاں برسانے لگا۔ لاٹھی ٹوٹ گئی اور خیر دین کا غصہ آدھا جاتا رہا۔

اسماعیل ہنسی ضبط کرتے ہوئے آگے بڑھا اور بولا "خیرو آج میں ان سب کی خبر لوں گا یہ تمہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔"

غلام حیدر سانٹا ہاتھ میں لیے ہوئے مجید کی طرف بڑھا، لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اسے روک لیا۔ اور مجید کی طرف متوجہ ہو کر کہا، مجید تم کان پکڑو۔ اور مجید نے جھٹ کان پکڑ لیے۔

غلام حیدر اور اسماعیل کے سامنے خیر دین کا غصہ اور کم ہو چکا تھا۔ وہ پگڑی کو گردن سے اتار کر سر پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ "چودھری جی میں نے انہیں کبھی منع نہیں کیا۔ جب مجھے کام نہیں ہوتا تو میں پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن آج میں نے پورن ماشی کے میلے میں برتن لے جانے تھے۔ پچھلے دو تین ہفتے کام کی وجہ سے میں نے ان کا داؤ

نہیں چلنے دیا۔ جب انہیں مدرسے سے چھٹی ہوتی ہے تو میں گدھوں کی رکھوالی کیا کرتا ہوں لیکن آج یہ چھٹی سے پہلے آ گئے۔ میں بھٹی سے برتن نکال رہا تھا۔ کہ یہ گدھوں کو لے اڑے۔ پہلے انہوں نے گاؤں کے گرد چکر لگائے۔ پھر نہر کا رخ کیا۔ جب یہ واپس آ رہے تھے تو میرا خیال تھا کہ اب یہ میرے حال پر رحم کریں گے۔ میں ان کا راستہ روکنے کے لئے بھاگا۔ لیکن یہ مجھے دیکھ کر کترا کر اس طرف نکل آئے۔

اسماعیل نے کہا اچھا خیرو! آئندہ انھوں نے ایسی حرکت کی تو سیدھا میرے پاس آنا۔ اب تم وہ درانتی اٹھاؤ اور اپنے گدھوں کے لئے اس کھیت میں سے چارہ کاٹ لو۔''

خیر دین اب غصے کی بجائے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ اس نے درانتی اٹھانے سے پہلے آگے بڑھ کر مجید کو اٹھایا اور کہا ''دیکھو بھئی آج تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ جب تمہیں سواری کا شوق ہو تو میرے پاس آ جایا کرو۔ لیکن خدا کے لئے اسکول کے تمام بچوں کو لے کر نہ آیا کرو۔

مجید تذبذب کی حالت میں باپ اور چچا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے باغ کے دوسرے سرے سے آواز دی۔ ''مجید! او مجید!!۔

مجید اجازت طلب نظروں سے اپنے باپ اور چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ اسماعیل نے کہا جاؤ نالائق!''۔

مجید جلدی سے تختی اور بستہ اٹھا کر گاؤں کی طرف بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ

ایک کم سن لڑکا ٹٹو کی ننگی پیٹھ پر سوار باغ کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ مجید کے قریب پہنچ کر اس نے ٹٹو کو روکا۔

اسماعیل نے کہا "سلیم اترو نیچے میں نے تمہیں کئی بار منع کیا ہے"۔

سلیم نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے جلدی سے باگ موڑ کر ٹٹو کو ایڑ لگا دی۔ ٹٹو نے جست لگا کر پانی کی کھائی عبور کی اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

اسماعیل چلایا، سلیم اسے روکو۔ بیوقوف گر پڑو گے"۔ لیکن سلیم نے رفتار اور تیز کر دی۔۔۔ جب ٹٹو نے کھیت کی باڑ کے اوپر سے چھلانگ لگائی تو وہ گرتے گرتے بچا۔ اسماعیل اور غلام حیدر دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی دو فرلانگ دور جا کر اس نے باگ موڑ لی۔ مجید بھاگتا ہوا پگڈنڈی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر بھی ٹٹو کی رفتار وہی تھی۔

مجید کو رستے میں دیکھ کر سلیم نے ٹٹو کو روکا۔ اسے کھیت کی مینڈ کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا، مجید جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ آج میں تمہیں بہت عجیب چیز دکھاؤں گا۔

مجید مینڈھ پر پاؤں رکھ کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ دور سے غلام حیدر نے آواز دی "۔ سلیم اب نہ بھگانا اسے، تم دونوں گر پڑو گے۔

"نہیں چچا اس نے جواب دیا"۔

☆☆☆☆☆

گاؤں کی دوسری طرف ایک جوہڑ کے کنارے چند جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر سلیم اور مجید ٹٹو سے اترے۔ مجید نے لگام ایک ٹہنی کے ساتھ باندھ دی۔ اور سلیم سے پوچھا؟۔ یہاں کیا دکھاؤ گے مجھے؟۔

سلیم نے کہا پہلے وعدہ کرو کہ تم انھیں مارو گے نہیں !؟۔

کیسے؟۔

''یہ پھر بتاؤں گا پہلے وعدہ کرو''

''اچھا میں انہیں نہیں ماروں گا''۔

''یہ بھی وعدہ کرو کہ تم انہیں اٹھا کر گھر نہیں لے جاؤ گے''

''اچھا''

سلیم نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ''نہیں میں تمہیں نہیں دکھاؤں گا، تم دوسرے لڑکوں کو بتا دو گے''۔

''نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا''۔

''اچھا آؤ''

مجید سلیم کے پیچھے ہولیا۔ سلیم ایک جھاڑی کے قریب رکا اور ٹہنیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گھونسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھو فاختہ بیٹھی ہے۔'' مجید نے کہا واہ جی یہ کون سی عجیب بات ہے۔ ہمارے باغ میں بہت سی فاختائیں ہوں گی۔

سلیم نے کہا ''تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، ارے اس نے بچے نکالے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے دو بچے"۔

سلیم آگے بڑھا، فاختہ اڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے ایک بچہ اٹھایا، اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر مجید سے کہا "پرسوں تک یہ دونوں انڈوں میں تھے۔ چند دنوں تک ان کے پر نکل آئیں گے۔ پھر یہ اپنی ماں کے ساتھ اڑا کریں گے۔

مجید نے کہا۔ "واہ جی میں نے جیسے پہلے کبھی فاختہ کے بچے نہیں دیکھے، میں سمجھتا تھا تم نے کوئی عجیب شے دیکھی ہے۔ چلو گھر چلیں"۔

مجید کی اس بے اعتنائی پر سلیم پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے بچے کو گھونسلے میں رکھ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

یہ بچے جب واپس گاؤں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ سلیم نے باہر کی حویلی میں داخل ہو کر ٹٹو کو نوکر کے حوالے کیا۔ نوکر نے ٹٹو کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے "سلیم جی تمہارے چچا مجھ پر بہت خفا ہوئے ہیں۔ اگر تم گر پڑتے تو میری شامت آجاتی۔ آئندہ میں تمہارے چچا کی اجازت کے بغیر اس ٹٹو کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔"

سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے اچانک حویلی میں ایک خوب صورت گھوڑا دکھائی دیا اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ "مجید ابا جان آگئے" وہ دیکھو ان کا گھوڑا! وہ یہ کہتا ہوا حویلی کی طرف بھاگا۔ گھوڑے نے اسے دیکھتے ہی کان کھڑے کر لیے۔ اس کے نتھنوں کی آواز کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ سلیم قریب پہنچا تو

گھوڑے نے گردن ذرا نیچے کرلی۔ اور وہ اس کی پیشانی اور نتھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجید چند قدم دور کھڑا رہا۔

سلیم نے کہا مجید تم اس سے ڈرتے ہو؟۔

مجید نے کہا یہ مجھے کاٹتا ہے۔

سلیم کی وہ پریشانی جس کا باعث فاختہ کے بچے کے متعلق مجید کی بے توجہی تھی، اب دور ہو چکی تھی۔ اب اسے اس بات کا خطرہ نہ تھا کہ مجید گھر جا کر دوسرے بہن بھائیوں کے سامنے اس کا مذاق اڑائے گا۔ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ اس سے گاؤں کے سب بچے ڈرتے ہیں۔ میں نہیں ڈرتا''۔

''تم اس لئے نہیں ڈرتے کہ یہ تمہیں کاٹتا نہیں۔''

''تم جانتے ہو کہ یہ مجھے کیوں نہیں کاٹتا؟۔

مجید نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اچھا بتاؤ، یہ تمہیں کیوں نہیں کاٹتا؟۔

''میں اسے چنے اور گڑ کھلایا کرتا ہوں۔''

''میں بھی اسے چنے اور گڑ کھلایا کروں گا۔ سلیم تم کہتے تھے کہ تمہارے ابا جان گیند لائیں گے؟۔

''ہاں وہ گیند لائیں ہوں گے چلو گھر چلیں!''۔

☆☆☆☆☆

اس حویلی میں مویشیوں کے باندھنے کے کمرے اور بھوسے اور اناج کے گودام تھے۔اس کے علاوہ کاشت کاری کا سامان بھی یہاں رکھا جاتا تھا۔ایک کونے میں چھپر کے نیچے چارا کاٹنے کی مشین تھی۔صحن کے وسط میں آم کے دو درختوں کے درمیان گنے کا رس نکالنے کی مشین تھی۔دو طرف کی دیواروں کے ساتھ مویشیوں کے لئے کھرلیاں بنی تھیں۔ایک کونے میں گڑ بنانے کی بھٹی تھی۔

باہر کے پھاٹک کی مقابل کی دیوار کے درمیان پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ڈیوڑھی اور اس کے ساتھ بیٹھک تھی۔بیٹھک اور ڈیوڑھی کے دائیں بائیں کچے بر آمدے تھے۔ڈیوڑھی سے آگے دوسری حویلی تھی۔جس میں پکی اینٹوں کے بنے ہوئے مختصر مگر صاف ستھرے رہائشی مکان تھے۔بیٹھک کا ایک دروازہ گھر کے صحن اور دوسرا ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔

مجید اور سلیم جب ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو بیٹھک سے گھر کے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔مجید نے رک کر کہا تم جاؤ۔میں گھر جاتا ہوں۔

سلیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر جھانکا،بیٹھک میں لیمپ جل رہا تھا۔اور چارپائیوں پر اس کے دادا کے علاوہ گھر کے آٹھ،دس آدمی بیٹھے تھے۔یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا،سلیم جھک کر ایک چارپائی کے نیچے گھس گیا۔اور رینگتا ہوا اس چارپائی کے نیچے جا پہنچا،جس پر اس کے ابا اور دادا بیٹھے ہوئے تھے۔اس نے اپنی کمر کے ساتھ چارپائی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی،اور پھر دبک کر نیچے لیٹ گیا۔چارپائی اگرچہ ہل نہ سکی تاہم سلیم کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اس کا دادا کہہ رہا تھا۔ ''علی اکبر ذرا چارپائی کے نیچے دیکھنا، شاید کوئی کتا اندر آگیا ہے۔

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ علی اکبر نے نیچے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا'' ۔کتا نہیں ریچھ ہے جی''۔

سلیم اب پوری طاقت سے چارپائی اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دادا نے کہا یہ ریچھ نہیں شیر ہے۔ علی اکبر پھر دیکھنا۔

سلیم قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ علی اکبر نے اسے پکڑ کر گود میں بٹھالیا۔

دادا نے کہا ''علی اکبر بھئی اپنے بیٹے کو ساتھ ہی لے جایا کرو۔ یہ ہمیں بہت ستاتا ہے۔

علی اکبر نے کہا میاں جی اب یہ چھ برس کا ہوگیا ہے۔ گزشتہ سال آپ نہیں مانتے تھے۔ لیکن اب اسے سکول میں بھیج دینا چاہیئے۔ ورنہ یہ آوارہ ہو جائے گا۔ میں صبح خود جا کر اسے اسکول چھوڑ آؤں گا۔

سلیم کے قہقہے حلق میں اٹک کر رہ گئے، اور جب اس کے دادا نے یہ کہہ دیا۔'' پچھلے سال یہ اس قابل نہیں تھا۔ لیکن اب میں تمہیں منع نہیں کرتا۔'' تو سلیم نے محسوس کیا کہ اب اس فیصلے پر آخری مہر لگ چکی ہے۔

سلیم نے اسکول کے متعلق اب تک یہی سنا تھا کہ وہاں بچوں کو بری طرح مارا پیٹا جاتا ہے۔ اس کے چچا حیدر اور اسماعیل نے متواتر چار سال ماسٹروں کی مار کھائی تھی۔ گاؤں کے لوگ جب گرمیوں کی دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں اور

سردیوں میں آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر جب پرانے وقتوں کی باتیں کرتے تو چچا اسماعیل اور غلام حیدر کی طالب علمی کے زمانے کا ذکر بھی آجاتا تھا۔ وہ خود اس بات کی تصدیق کیا کرتے تھے کہ ماسٹر کان پکڑوا کر ان کی پیٹھ پر اینٹیں رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ گنے کے کھیتوں میں چھپا کرتے تھے۔ لیکن خاندان کے بزرگوں کی طرح شاید گاؤں کے باقی لوگوں کو بھی ان سے دشمنی تھی۔ وہ انہیں پکڑ کر ماسٹر جی کے حوالے کر آیا کرتے تھے۔ اس کا چچا زاد بھائی مجید اور دوسرے لڑکے بھی اسے اسکول سے واپس آکر بہت کچھ بتایا کرتے تھے۔ مجید دو سال سے پہلی جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ سلیم کے بڑے چچا غلام حیدر کا بیٹا تھا۔ وہ درخت پر چڑھنے، پانی میں تیرنے اور کھیل کود میں گاؤں کے تمام لڑکوں سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس میں سینکڑوں خوبیاں تھیں۔ لیکن سلیم حیران تھا کہ اس کے باوجود ماسٹر اس پر رحم نہیں کرتا تھا۔ سلیم نے کئی بار اپنی آنکھوں سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں کے نشان دیکھے تھے۔ اگر چچا غلام حیدر کا بس چلتا تو وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے سکول جانے پر مجبور نہ کرتا۔ لیکن سلیم کا والد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اور وہ خاندان کے بچوں کی تعلیم کے بارے میں بہت سخت تھا۔ دادا کے بعد خاندان میں سب سے زیادہ اسی کا حکم مانا جاتا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نائب تحصیل دار بن چکا تھا۔

سکول جانا اور ماسٹر سے مار کھانا، ورنہ گھر سے مار کھانا بیچارے مجید کے لئے ایک مجبوری تھی۔ اور سلیم کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی مجبوری کا باعث اس کے

اپنے ابا جان ہیں۔

سلیم نے جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانی سنی تھیں۔لیکن سکول ماسٹر اس کے لئے سب سے زیادہ خوف ناک شے کا نام تھا۔اس نے سنا تھا کہ بادشاہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔وہ جسے چاہے مار سکتا ہے۔وہ ایک بادشاہ بننا چاہتا تھا۔

بچوں کو ماسٹروں سے نجات دلانے کی یہی ایک صورت تھی۔لیکن اب وہ خود سکول جا رہا تھا۔جو کچھ ابا نے بیٹھک میں کہا تھا۔اب سارے گھر میں مشہور ہو چکا تھا۔ماں نے اس کے لئے نئے کپڑے اور نئے بوٹ منگوا رکھے تھے۔اس کی چچیاں ،پھوپھیاں اور بہنیں سب خوش تھیں۔اور خاندان میں صرف ایک دادی تھی،جس کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی۔صرف اس نے ماسٹر کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تھا۔صرف اس نے کہا تھا،بیٹا تم فکر نہ کرو۔ماسٹر تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔‘‘

گاؤں کے بچے باہر کھیل رہے تھے۔وہ اسے بلانے کے لئے آئے۔لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا۔لیکن وہ اسے کھینچ کر لے گئے۔جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو ماں نے آواز دی،بیٹا سلیم جلدی آجانا،صبح تمہیں سکول جانا ہے۔سلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے ساتھی باہر نکلتے ہی شور مچانے لگے کہ سلیم کل سکول جا رہا ہے۔اب باقی بچے بھی کھیل کا خیال چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔کیوں سلیم؟کیا یہ سچ ہے۔کیا سچ مچ تم سکول جا رہے ہو۔اور پھر جب ان کی تسلی ہو گئی تو انہوں نے مجید کی تجویز پر آنکھ مچولی، کبڈی یا چور اور کوتوال کی بجائے ماسٹر اور لڑکوں کا کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

مجید ماسٹر بن گیا۔اس نے بچوں کوایک قطار میں کھڑا کر کے کان پکڑنے کا حکم دیا۔

سکول کے تربیت یافتہ بچوں نے فورا کان پکڑ لیے۔اور دوسروں کو مجید نے اپنے گرد جمع کر کے اس فن کی مشق کرائی۔وہ کہہ رہا تھا، دیکھومیری طرف۔اس طرح جھکو، پھر گردن نیچی کرو۔پھر ہاتھوں کواس طرح لے جاؤاور کان پکڑلو۔پیٹھ اونچی رکھنا ضروری ہے۔ورنہ ڈنڈے پڑیں گے۔باتیں مت کرو۔اور دھوبی کے لڑکے یہ مدرسہ ہے۔کہ تیرے باپ کا گھر ہے۔ہنسونہیں،ورنہ دانت توڑ دوں گا۔

تمام بچے کان پکڑ چکے تھے۔لیکن سلیم کھڑا تھا۔مجید نے کہا ابے تم نے کان نہیں پکڑتے۔۔۔۔؟۔

سلیم نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا ''میں کان نہیں پکڑوں گا''۔اور پیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔۔

گھر پہنچ کر سلیم کسی سے بات کیے بغیر لیٹ گیا۔امینہ اس کی چچا زاد بہن جو اس کی ہم عمر تھی۔اس کے پاس آ بیٹھی۔اور اس نے کہا سلیم چلو دادی جان سے کہانی سنیں۔

نہیں اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

وہ سلیم کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔سلیم نے جھلا کر کہا ''جاؤ چڑیل ورنہ بال نوچ ڈالوں گا۔''

امینہ مایوس ہو کر چلی گئی۔تھوڑی دیر کے بعد سلیم کی ماں آئی اور بولی ''سلیم تم یہاں ہو، میں سمجھتی تھی کہ تم باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہوگے۔تم نے آج دودھ

نہیں پیا۔ میں لاتی ہوں۔

وہ دودھ کا گلاس لے آئی۔ لیکن سلیم نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ ماں نے اصرار کیا تو وہ بستر سے اٹھ کر بھاگتا ہوا مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر چھت کی منڈیر پر بیٹھا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیا۔

حویلی کے تمام مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ ان پر سے گزرتا ہوا ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پچھواڑے میں آم اور جامن کے کچھ درخت تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ان میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں چھت پر ان کے سائے بھی ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے کتے کوٹھے پر چڑھ کر بھونک رہے تھے۔ اور کھیتوں سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد سلیم چند کمروں کی چھت پر سے گزرتا ہوا اس کونے میں جا کھڑا ہوا۔ جہاں رہائشی مکانوں کی چھت مویشیوں کی حویلی کے برامدے کے ساتھ ملتی تھی۔ یہاں اسے وہ جوہڑ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کا کنارہ باہر کی حویلی کی دیوار سے ملتا تھا۔ اس جوہڑ کے دوسرے سرے پر شیشم کے درخت تھے۔ اور جوہڑ کے پانی میں ان کا عکس نظر آتا تھا۔ اچانک اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی:

سلیم، سلیم!

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا باپ مکان کی چھت کے دوسرے سرے پر کھڑا تھا۔

آیا ابا جان!'' یہ کہہ کر وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

باپ نے کہا سلیم بیٹے یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟۔

کچھ نہیں ابا جان۔

''تمہاری ماں کہتی ہے کہ تم سکول ماسٹر سے بہت ڈرتے ہو۔؟۔

سلیم خاموش رہا۔

علی اکبر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، بیٹا تمہیں کسی نے یونہی ڈرا دیا ہے۔ ماسٹر اچھے بچوں کو نہیں مارا کرتے۔ صرف وہی بچے پٹتے ہیں، جو کام نہیں کرتے۔ میں بھی اسی سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ایک دن بھی مار نہیں کھائی۔ استاد اچھے لڑکوں کو تو پیار کرتے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم دل لگا کر پڑھو۔ تم ساری عمر کھیل کود میں نہیں گزار سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑے آدمی بنو۔ اب میں تمہیں سارا دن گاؤں کے بچوں کے ساتھ آوارہ گردی کی اجازت نہیں دوں گا۔ تمہیں دنیا میں نام پیدا کرنا ہے۔ اس سکول کے بعد تم شہر کے بڑے سکول میں جاؤ گے۔ پھر کالج جاؤ گے۔ پھر تمہیں بہت دور ولایت جانا پڑے گا۔''

جب سلیم نیچے اتر کر بستر پر لیٹ گیا تو اس کی ماں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اسے تسلی دینے آئی۔ اس نے کہا بیٹا ماسٹر تمہیں نہیں مارے گا۔ میں تمہیں روز کا سبق یاد کرا دونگی۔ تمہیں وقت پر سکول بھیج دیا کرونگی، تمہیں صاف ستھرے کپڑے پہنایا کروں گی۔ اس کے باوجود بھی اگر اس نے تمہیں پیٹا تو تمہارا باپ اس کی مرمت کرے گا۔

سلیم کو اپنے مستقبل کے متعلق کافی اطمینان ہو چکا تھا۔ تاہم اسے دیر تک نیند نہ آئی۔ بار بار اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں گاؤں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکوں گا۔ ابا جان کہتے ہیں کہ میں بڑا آدمی بنوں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بڑا آدمی کیا ہوتا ہے؟۔ وہ کیا مجبوری ہے کہ پہلے اسے ساتھ والے گاؤں کے سکول، پھر اس سے دور شہر کے سکول اور اس کے بعد کہیں بہت دور جانا پڑے گا۔ اب تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ سب چیزیں جن کی وہ خواہش کر سکتا ہے۔ اس کے گاؤں میں موجود ہیں۔ اس کے گاؤں میں سرسبز درخت جھومتے تھے۔ پھول کھلتے تھے۔ ہوائیں چلتی تھیں۔ بادل آتے تھے۔ سرسبز کھیت لہلہاتے تھے۔

یہاں اس کے پرندے اڑتے تھے۔ چڑیاں چہچہاتی تھیں۔

یہاں آم، انار، نارنگی، امرود اور ناشپاتی کے باغات تھے۔ زمین پر اس کی ندیاں تھیں۔ اس کی جھیلیں تھیں۔ یہاں سے وہ ان پہاڑوں کو دیکھ سکتا تھا۔ جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ اور آسمان پر اس کا سورج تھا۔ اس کا چاند اور تارے تھے۔ اسے کسی سے یہ سننا گوارہ نہ تھا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ وہ تمام عمر اپنی دنیا کو ایک بچے کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے زندگی اس وقت کتنی مکمل تھی، جب وہ اپنے مکان کی چھت سے چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد یہ محسوس کرتا تھا کہ زمین ایک گول دائرہ ہے۔ جس کا کنارہ حد نظر سے آگے آسمان کے گنبد سے جا ملتا ہے۔ اور اس کا گھر اس گول دائرے کا مرکز ہے۔ یہ دنیا اس وقت

کتنی مختصر اور حسین تھی۔ جب وہ اپنے بازو پھیلا کر کہتا تھا کہ سورج اتنا بڑا ہے۔ چاند صرف اتنا ہے۔ اور ستارے اس قدر چھوٹے ہیں۔ وہ اپنی معلومات پر کس قدر مطمئن تھا۔ جب وہ اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو سمجھایا کرتا تھا۔ کہ چاند، سورج اور ستارے بھی ہماری طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ شام کے وقت سورج آسمان سے اتر کر زمین کے کسی جنگل میں روپوش ہو جاتا ہے۔ چاند اور ستارے اسے ساری رات تلاش کرتے ہیں۔ لیکن وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا زمین کی دوسری طرف پہاڑوں میں پہنچ جاتا ہے۔ صبح کے وقت کوئی ہوشیار ستارہ اسے چھو لیتا ہے۔ پھر ستارے کہیں چھپ جاتے ہیں، اور سورج دن بھر انہیں تلاش کرتا ہے۔

وہ کس قدر مسرور تھا۔ جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ بادل آسمان کے وہ گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی ہیں۔ جن پر فرشتے سواری کرتے ہیں۔ اور پہاڑ ان عجیب وغریب جانوروں کی چراگاہیں ہیں۔ لیکن بڑوں کی باتوں نے اسے اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اس کے لئے چاند اور ستارے وہ کھلونے نہ تھے۔ جن کی طرف وہ ماں کی گود میں بیٹھ کر ہاتھ بڑھایا کرتا تھا۔ بادل وہ عجیب وغریب جانور نہ تھے، جن پر سواری کرنے کی تمنا اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتی تھیں، وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جائے گا۔ کائنات کے حسین اور دلفریب چہرے سے نقاب اترتے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

ماسٹر جی حقہ پیا کرتے تھے، کھانسا کرتے تھے اور بچوں کو پیٹا کرتے تھے۔ انہیں زندگی کی ہر تلخی گوارہ تھی، لیکن بچوں کا ہنسنا اور بولنا اور ادھر ادھر دیکھنا ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ محکمہ تعلیم کی بیس سالہ خدمت نے انہیں اس دنیا میں مسکرانے اور ہنسنے والی انسانی صورتوں سے نفرت کرنا سیکھا دیا تھا۔ انہیں پندرہ یا بیس روپے ماہوار پر ملازمت ملی تھی۔ اور انہیں ایک روپیہ فی سال کے حساب سے ترقی مل رہی تھی۔ لیکن اس ترقی کے مقابلے میں ان کا جسمانی اور ذہنی انحطاط کہیں زیادہ تیز تھا۔ جب انہوں نے ملازمت شروع کی تھی تو وہ تنہا تھے۔ اس کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ اور اب وہ چھ بچوں کے باپ تھے۔ اور پھر ان سے چند ایسی غلطیاں بھی ہوئیں، جن کی سزا ہر شریف آدمی کو ملتی ہے۔ ایک دفعہ انسپکٹر صاحب معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ تو ماسٹر جی نے انہیں مرغی کھلانے کی بجائے دال پیش کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک ان کی ترقی رکی رہی۔ اس کے بعد ایک اور انسپکٹر ان سے خفا ہوا تو اس نے بھی ایک سال کے لئے ان کی ترقی روک دی۔ غرض اس طرح بیس سال کی ملازمت کے دوران تین سال تک ان کی ترقی بند رہی۔

ماسٹر جی سے ایک گناہ اور بھی ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی مستقل رہائش کے لئے اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان بنوالیا تھا۔ کسی طرح انسپکٹر صاحب کو اس بات کا علم ہوگیا۔ اور انہوں نے جھٹ ان کی تبدیلی کا حکم صادر فرما دیا۔ اب گاؤں میں کوئی مکان کا خریدار نہ تھا۔ ماسٹر جی نے منت وزاری کی، لیکن انسپکٹر صاحب نہ مانے۔ جب انھوں نے آنسو اور آہیں بے کار دیکھیں تو مرغیوں، گھی اور انڈوں سے

کام لیا۔

یہ انسپکٹر صاحب تبدیل ہوتے ،تو جاتے جاتے اپنے جانشین کو ماسٹر کی زندگی کے اس کمزور پہلو کا پتہ دے گئے۔ چنانچہ ماسٹر جی کا اندازہ تھا کہ اگر وہ ساٹھ سال کی عمر تک وفات نہ پا گئے تو اس مکان کی قیمت کے برابر مرغیاں اور انڈے انسپکٹروں اور کلرکوں کو بطور ٹیکس دینا پڑیں گے۔ان کی ملازمت کی زندگی کے دوران صرف دو تین ایسے انسپکٹر آئے۔ جو ماسٹروں کے گھر سے دودھ کا گلاس پینا بھی حرام سمجھتے تھے۔لیکن ماسٹر جی کو یہ گلہ تھا کہ ایسے نیک لوگوں کا جلد ہی ٹرانسفر کر دیا جاتا تھا۔

سلیم کا باپ اسے اسکول میں داخل کرنے کے لئے آیا تو اس نے جاتے وقت مصافحہ کرتے ہوئے دس روپے کا نوٹ ماسٹر جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ماسٹر جی نے کہا۔ ''نہیں نہیں چوہدری صاحب آپ کی بڑی مہربانی لیکن،،،،

علی اکبر نے انہیں اپنا فقرہ پورا کرنے کا موقع نہ دیا اور کہا ماسٹر جی استاد کا حق کوئی نہیں دے سکتا۔آپ دعا کریں خدا سلیم کو آپ کی خدمت کے قابل بنائے۔''

☆☆☆☆☆

یہ گاؤں جس میں پرائمری سکول تھا۔سلیم کے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔اردگرد کے پانچ، چھ دیہات کے لڑکے یہاں تعلیم پاتے تھے۔اوران کی مجموعی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔مجید اگر چہ دوسری جماعت میں تھا۔لیکن وہ تین سال

سے سکول میں داخل تھا۔عمر کے لحاظ سے صرف چھ سات لڑکے اس سے عمر میں بڑے تھے۔لیکن داؤد کے سوا سب لڑکے اس سے خوف کھاتے تھے۔داؤد دوسرے گاؤں کے تیلی کا لڑکا تھا۔اور اس کے باپ نے اسے اسوقت تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی تھی۔جب وہ دس برس کا ہو چکا تھا۔اب وہ چوتھی جماعت میں تھا۔اور ماسٹر کی غیر حاضری میں سب بچوں پر تھانے داری کرتا تھا۔عمر کے علاوہ قد و قامت میں بھی وہ سب بچوں پر فوقیت رکھتا تھا۔چہرے کے مقابلے میں اس کا سر قدرے چھوٹا نظر آتا تھا۔شاید اسے اس لیے قینچی کی بجائے نائی کا استرا زیادہ پسند تھا۔ منڈے ہوئے سر پر تیل پالش کا کام دیتا تھا۔اس کی چھوٹی سے پگڑی اکثر اس کے سر سے کھسک جایا کرتی تھی۔اگر کوئی اور لڑکا اس طرح سر منڈا کر آتا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔لیکن کسی میں یہ جرات نہ تھی کہ وہ داؤد کے سر کو چھو سکے۔یہ وہ بلند مقام تھا جہاں صرف ماسٹر صاحب کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔

داؤد جتنا بڑا تھا۔اسی قدر کند ذہن بھی تھا۔چوتھی جماعت میں دو بار فیل ہو چکا تھا۔لیکن ماسٹر جی کا خوش کرنے کے لئے وہ گاؤں سے ان کے لئے اپلے لاتا، ان کے گھر میں پانی بھرتا۔ان کا حقہ تازہ کرتا اور کبھی کبھی ان کی گائے کے لئے چارہ بھی لے آتا تھا۔یہ سکول اردگرد کے دیہات کے لئے پوسٹ آفس کا کام بھی دیتا تھا۔ہر گاؤں کی ڈاک وہاں کے بچوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ماسٹر جی نے چٹھیوں پر مہریں لگانے، ڈاک کی تھیلیاں کھولنے اور بند کرنے کا کام داؤد کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے سکول میں ماسٹر جی کا نائب تھا۔لیکن سکول میں صرف دو لڑکے ایسے

تھے،جن کے معاملات میں وہ دخل دینے سے پرہیز کرتا تھا۔ یہ مجید اور موہن سنگھ تھے۔مجید پہلا لڑکا تھا،جس نے داؤد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت ماسٹر جی گھر گئے ہوئے تھے۔اور داؤد لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔اس کی پگڑی سر سے کھسک کر اس کی گود میں پڑی تھی۔لڑکے اپنی پگڑیوں کے کوڑے بنا کر کھیلنے لگے۔ مجید اس دن ٹوپی پہن کر آیا تھا۔اس نے چپکے سے داؤد کی پگڑی اٹھالی اور کوڑا بنا کر بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو گیا۔

جب داؤد کی آنکھ کھلی تو تمام لڑکے دبک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔لیکن مجید کو سکول میں داخل ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔اور مدرسے میں اسے داؤد کے اختیارات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔تھوڑی دیر بے پرواہی سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے کوڑا داؤد کی طرف پھینک دیا اور کہا ”یہ لو اپنی پگڑی“

میری پگڑی؟۔داؤد یہ کہتے ہوئے اٹھا اور کوڑا اٹھا کر مجید کو مارنے لگا۔چند کوڑے کھانے کے بعد مجید نے اس کا دوسرا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا۔داؤد نے دو تین معمولی جھٹکوں کے بعد اپنے مدمقابل کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ کوڑا کھینچا،مجید نے اچانک کوڑا چھوڑ دیا۔داؤد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔اس کی ٹانگیں ایک لڑکے کے ساتھ ٹکرائیں اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔لیکن پھر جلد ہی غضب ناک ہو کر اٹھا اور اپنی پوری طاقت سے مجید پر جھپٹ پڑا۔اب دونوں کی کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔مجید اس کی کمر کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔اور داؤد اس

کی پیٹھ پر مکے مار رہا تھا۔مجید نے اچانک اسے اپنی ٹانگ سے اڑنگا دے کر فرش پر گرا دیا۔اب وہ نیچے تھا اور مجید اوپر لیکن تھوڑی دیر بعد پھر داؤد کا پلہ بھاری تھا۔مجید کا کرتا پھٹ چکا تھا۔اس کے گال مکوں اور طمانچوں سے سرخ ہو چکے تھے۔اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔لیکن پھر بھی وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔وہ مار کھاتا، گرتا، اور پھر اپنے مد مقابل کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتا۔داؤد کا غصہ اب پریشانی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔کیونکہ اس وقت اس کے سامنے اپنے وقار کو بچانے یا مد مقابل پر اپنی جسمانی برتری ثابت کرنے کا مسئلہ نہ تھا۔بلکہ سوال یہ تھا کہ لڑائی کس طرح ختم کی جائے۔وہ اب مجید کو مارنے یا گرانے کی بجائے اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔! دیکھو اب بیٹھ جاؤ۔ورنہ بہت ماروں گا۔میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں تم نے میری پگڑی کا کوڑا کیوں بنایا تھا؟،، تم باز نہیں آتے، دیکھو ابھی ماسٹر صاحب آ جائیں گے۔داؤد بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔لیکن مجید اس کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

بالآخر داؤد نے اسے زور سے دھکا دے کر گرا دیا۔اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔مجید کے سر اور پیٹھ پر کافی چوٹ آئی، لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا۔داؤد اب چند قدم دور کھڑا کہہ رہا تھا۔"اب آرام سے بیٹھ جاؤ، اب میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔

مجید نے ایک لمحہ کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد ایک تختی اٹھائی اور آگے بڑھتے ہوئے کہا، اب کہاں جاؤ گے۔

داؤد نے اپنے ہاتھوں پر اس کا وار روکنے کی کوشش کی، لیکن تختی کا کنارہ اس کی

کلائی پر لگا۔ داؤد اس کے دوسرے وار کی زد سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹا، لیکن مجید نے نیچے جھک کر اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں پر دو تین وار کیے۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری ٹانگ پر ناچ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ تختی چھیننا چاہی، لیکن پھر چوٹ کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بھاگ کر دوسری تختی اٹھانے کی کوشش کی لیکن ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ مجید نے اس کی کمر پر اتنے زور سے تختی ماری کہ وہ بلبلا اٹھا۔ داؤد میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن مجید اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

اب قریباً تمام لڑکے مجید کی حمایت پر تھے۔ داؤد کی ہوا اکھڑ چکی تھی اور وہ بد حواس ہو کر مجید کے آگے آگے سکول کی چاردیواری کے اندر بھاگ رہا تھا۔

ادھر لڑکوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اتنے میں باہر کے دروازے پر کسی لڑکے نے آواز دی ''، ماسٹر جی آ گئے۔ لڑکے بھاگ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مجید ماسٹر جی کو دیکھ کر آخری ضرب لگاتے لگاتے رک گیا۔

، ماسٹر جی نے آتے ہی گرج کر کہا۔ مجھے گھر میں تمہارا شور سنائی دے رہا تھا۔ داؤد تم انہیں چپ نہیں کراتے میں نے تمہیں مانیٹر کس لیے بنایا تھا۔

پیشتر اس کے کہ داؤد کوئی جواب دیتا، ماسٹر جی کی نگاہ مجید پر پڑی اور انھوں نے دوسرا سوال کر دیا کہ اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔

مجید اس سوال کے جواب میں خاموش رہا۔

، ماسٹر جی نے جھلا کر کہا میں پوچھتا ہوں اس کا کرتا کس نے پھاڑا ہے۔ اور اس کے گال بھی سرخ ہیں۔ اسے کس نے مارا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں؟۔

ایک لڑکے نے ہمت کر کے کہا،، ماسٹر جی مجید اور داؤد آپس میں لڑ رہے تھے۔‘‘

،ماسٹر جی نے کچھ اور پوچھے بغیر دو، تین چھڑیاں داؤد کے رسید کر دیں’’ تیلی کے بچے تجھے بچوں کے ساتھ لڑتے شرم نہیں آتی۔؟‘‘

ماسٹر جی کی غلط فہمی نے داؤد کو دنیا کا مظلوم ترین آدمی بنا دیا تھا۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا’’ ،ماسٹر جی ان لڑکوں سے پوچھیے، میں نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے۔لیکن اس نے مجھے تختی سے مارا ہے۔‘‘

تمہیں مجید نے مارا ہے؟۔

داؤد نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے پاجامے کے پائنچے اوپر اٹھا کر پنڈلیوں پر ضربوں کے نشان دکھائے۔

،ماسٹر جی نے کہا آخر تیلی نکلے نا۔

مجید نے کہا، ماسٹر جی میں نے اس کا لحاظ کیا ہے۔

داؤد کے زخم مجید کی قمیض کی تلافی کرنے کے لئے کافی تھے۔، ماسٹر جی نے دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد داؤد اور مجید ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔

سکول میں دوسرا لڑکا جس سے مجید مرعوب ہو چکا تھا، موہن سنگھ تھا۔موہن سنگھ کا باپ نہ صرف اس گاؤں کا زمین دار تھا۔ بلکہ ارد گرد کے بہت سے دیہاتوں میں بھی اس کی زمینیں تھیں۔ گاؤں میں اس کا قلعہ نما مکان تھا۔موہن سنگھ آٹھ سال کی عمر میں بھی نوکر کے کندھے پر سوار ہو کر سکول آتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر لڑکے کو گالیاں

دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے داؤد کو بھی گالی دی۔ داؤد نے موہن سنگھ کو چپت رسید کی۔ ماسٹر جی کہیں گئے ہوئے تھے۔ موہن سنگھ روتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے باپ کے دو نوکر ساتھ لے آیا۔ وہ داؤد کو پکڑ کر سکول سے باہر لے گئے اور بری طرح پیٹا۔

داؤد کا باپ سردار جی کے پاس شکایت لے کر گیا کہ آپ کے نوکروں نے میرے بیٹے کو پیٹا ہے۔ سردار صاحب اس وقت نشے میں تھے، ان کے لئے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ یہ شخص داؤد کا باپ ہے۔ اور داؤد نے ان کے فرزندار جمند کو گالی کا جواب تھپڑ سے دیا تھا۔ چنانچہ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ جوتوں سے اس کی مرمت کرو۔ اس کے بعد داؤد کو زندگی کی ان مجبوریوں کا احساس ہوا، جو ہر شخص کو گالی کا جواب تھپڑ سے دینے کی اجازت نہیں دیتیں۔

☆☆☆☆☆

چند دنوں میں سلیم سکول کے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ اس کے لئے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ ماسٹر جی بچوں کو بلا وجہ نہیں مارتے تھے۔ بلکہ وہ شور مچانے، سبق یاد نہ کرنے والے اور غیر حاضر رہنے والے بچوں کو مارتے تھے۔ اور سزا دیتے تھے۔

اسکول سے باہر زندگی کی ہزاروں دلچسپیاں تھیں۔ جو ماسٹر جی کی مار پیٹ کے باوجود بہت سے لڑکوں کو غیر حاضر رہنے پر آمادہ کر دیتی تھیں۔ اسکول سے باہر

سرسبز کھیت اور باغات تھے۔ کھلی فضا میں پرندوں کے غول اڑتے تھے۔ جھیلیں تھیں ،جن میں کنول کھلتے تھے۔ وہ ندیاں اور نالے تھے، جن میں برسات کا پانی بہتا تھا۔ اسکول سے باہر فلک بوس پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اسکول سے باہر ہنسنے ، کھیلنے اور بولنے کی آزادی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اسکول کی ایک محدود چار دیواری تھی۔ جس کے اندر دو کمرے تھے، ان کے آگے برامدہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جس کے غلیظ پانی میں لڑکے تختیاں دھویا کرتے تھے۔ سکول میں لکھنے کے لئے قلمیں ، دواتیں اور تختیاں تھیں۔ پڑھنے کے لئے کتابیں تھیں۔

سلیم چھت کی کڑیوں سے لے کر اسکول کی ہر چیز کا معائنہ کر چکا تھا۔ دیوار پر چند بوسیدہ نقشے اور پرانی تصویریں تھیں۔ اور یہ سب سلیم کے دل پر نقش ہو چکی تھیں۔ وہ بیٹھنے کی چٹائیوں پر سیاہی کے دھبوں کے نشان اور چھت پر مکڑی کے جالے گن چکا تھا۔ دو تین ہفتوں کے بعد اسکول کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس کی توجہ جذب کر سکتی۔ اب اسکول اس کے لئے ایک نئی دنیا نہ تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا قید خانہ تھا۔

جس کمرے میں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی ایک کھڑکی شمال کو کھلتی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے قریب بیٹھ جاتا۔ جہاں اسے باہر کے ہرے بھرے کھیت دکھائی دیتے تھے۔ اور دور افق پر کانگڑہ کے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ جنہیں قریب جا کر دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ یہ کھڑکی وہ چھوٹی سی گزرگاہ تھی

جس کے راستے وہ اس تنگ ماحول سے فرار ہو کر سپنوں کی حسین دنیا میں پہنچ جاتا وہ پہاڑ کی گود میں سونے والے بادلوں کو نیند سے جگاتا اور ان پر سوار ہو کر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں اڑتا۔ اچانک ماسٹر جی کی آواز سنائی دیتی ''سلیم! تم کیا دیکھ رہے ہو؟'' اور اس کی رنگین دنیا درہم برہم ہو جاتی۔ وہ چونک کر کہتا ''جی کچھ نہیں''

''سبق یاد کیا تم نے؟''

''جی ہاں!''

''اچھا تختی لکھو!''

سبق یاد کرنا اور تختی لکھنا اس کے لیے معمولی بات تھی لیکن دن کے چھ سات گھنٹے اس تنگ ماحول میں سر جھکا کر بیٹھنا اس کے لیے ایک بہت بڑی سزا تھی۔

☆☆☆☆☆

سلیم عام بچوں سے بہت زیادہ ذہین تھا۔ چھ ماہ میں اس نے پہلی جماعت پاس کر لی اور ماسٹر جی نے اسے دوسری جماعت کے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ ابتدا میں اس نے مجید کی ترغیب پر چند دن غیر حاضر رہنے کی کوشش کی لیکن ماسٹر جی بڑی جماعت کے لڑکوں کو ان کے گاؤں بھیج دیا کرتے تھے اور گھر کے آدمی انہیں کسی کھیت یا باغ سے تلاش کر کے اسکول میں چھوڑ آیا کرتے تھے۔ تلاش کے بعد سلیم کو چھوٹا سمجھ کر معمولی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد معاف کر دیا جاتا لیکن مجید کی خوب مرمت کی جاتی۔ مجید کا باپ انہیں ماسٹر جی کے سپرد کرتے ہوئے کہتا ''ماسٹر جی سلیم ابھی

بچہ ہے، یہ سارا قصور مجید کا ہے۔"

غیر حاضر رہنے کی چند ناکام کوششوں کے بعد سلیم نے مجید کے مشوروں پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ جس دن مجید کی نیت بگڑتی وہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ چل پڑتا۔ سلیم کے داخل ہونے سے پہلے گاؤں کے دوسرے لڑکوں پر مجید کی حکومت تھی، جب اس کی نیت خراب ہوتی تھی تو وہ ان سب کو روک لیا کرتا تھا، وہ بڑ آسانی سے ان کے دلوں میں نہر یا جھیل میں نہانے کا شوق پیدا کر دیا کرتا تھا اور جب وہ اس کا ساتھ دینے سے پس و پیش کرتے تو وہ انہیں مار پیٹ کر اپنی قیادت تسلیم کروالیا کرتا تھا۔ لیکن جب سلیم نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ غیر حاضر نہیں رہے گا تو مجید نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی صورتحال کا سامنا کر رہا ہے۔ سلیم کو ورغلانے میں اس کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوتی۔ پہلے دن جب سلیم نے اس سے کہا "اچھا تم نہ جاؤ میں تو ضرور جاؤں گا" تو مجید نے اسے راستے میں دھوبی کے کتے سے ڈرانے کی کوشش کی سلیم اس پر بھی متاثر نہ ہوا تو مجید نے اسے مور کے انڈے دکھانے کا لالچ دیا لیکن سلیم اس لالچ میں بھی نہ آیا۔

جب مجید نے یہ دیکھا کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کرتا تو اس نے دوسرے لڑکوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کیے کہ وہ سلیم کو اپنا لیڈر بنا چکے ہیں، غصے میں آ کر اس نے ایک لڑکے کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم اس کے آگے کھڑا ہو گیا:

"دیکھو مجید! اگر تم نے کسی کو مارا تو میں تم سے لڑوں گا تم نے دادا جان کے ساتھ

وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تم غیر حاضر نہیں رہو گے۔''

''تم مجھ سے لڑو گے؟'' مجید نے یہ کہہ کر اس کے منہ پر ہلکا سا چپت رسید کر دیا سلیم چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ پہلا چپت تھا جو اس نے مجید کے ہاتھ سے کھایا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کی نگاہیں مجید کے چہرے پر مرکوز تھیں سلیم اچانک مڑا اور کسی سے بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے دوسرے لڑکے جلال، بشیر، رام لال اور گلاب سنگھ اس کے پیچھے چل دیے۔

مجید کچھ دیر بے حس وحرکت کھڑا رہا، اس کا غصہ ندامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ اس کی اور سلیم کی پہلی لڑائی تھی۔ اس نے سلیم کو گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں جلال نے ایک دفعہ اسے گالی دی تھی اور اس نے اپنی تختی سے اس کا سر پھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ طرز عمل مجید کے لیے ایک معما تھا۔ اسے ان ہاتھوں سے شکایت تھی جو اس کی چپت کے جواب میں اس کا گریبان پھاڑنے کے لیے نہ اٹھے۔ اسے ان آنکھوں سے گلہ تھا جن میں غصے یا نفرت سے زیادہ مروت تھی۔

سلیم اور اس کے ساتھی تین چار کھیت آگے جا چکے تھے مجید ''سلیم! سلیم!'' کیا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔ سلیم کے ساتھی اس کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے لیکن سلیم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی مجید کا خیال تھا کہ وہ اس کی آواز سن کر بھاگ نکلے گا۔ سکول پہنچنے سے پہلے وہ اسے پکڑ لے گا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے

لیکن سلیم اپنی معمولی رفتار سے چلتا رہا۔

اس نے قریب پہنچ کر پھر آواز دی ''سلیم! ٹھہرو! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں''

سلیم نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا ''تم میرے ڈر سے اسکول مت جاؤ، میں دادا جان اور چچا جان سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا۔''

سلیم آگے چل پڑا مجید مایوسی اور پریشانی کی حالت میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سارا راستہ وہ سلیم کو منانے کی مختلف ترکیبیں سوچتا رہا۔ اسکول کے قریب پہنچ کر اس نے کہا ''سلیم! تم مجھ سے صلح نہیں کرو گے؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی مجید نے کہا:

''اچھا یونہی سہی میں چھٹی کے دن تمہارے ساتھ نہر پر نہیں جاؤں گا!''

سلیم نے اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا مجید نے پھر کہا ''میں چھٹی کے بعد واپس آ کر مور کے انڈے توڑ ڈالوں گا، میں تمہارے بگلے کے بچے بھی مار ڈالوں گا میں ان کے گلے میں رسی ڈال کر درخت سے لٹکا دوں گا۔''

سلیم کی رفتار سست ہو گئی اور وہ مڑ مڑ کر مجید کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجید کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتا۔

مجید نے کہا ''اور میں تمہاری بلی کے بچوں کو اٹھا کر درخت کی چوٹی پر رکھ آؤں گا کنوئیں کے پاس جامن کے سب سے اونچے درخت کی چوٹی پر پھر تم انہیں اتار نہیں سکو گے۔''

سلیم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک اپنا بستہ اور تختی ایک

طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا اور منہ بسورنے لگا۔

مجید اور باقی لڑکے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ جلال نے کہا ''چلو سلیم اب دیر ہو رہی ہے!''

سلیم نے زمین سے گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے کہا ''میں نہیں جاؤں گا''

مجید ہنستا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا منہ چڑانے لگا۔ سلیم اچانک غضب ناک ہو کر اٹھا اور مجید پر پل پڑا۔ کچھ دیر سلیم کو مکے مارنے اور بال نوچنے کا موقع دینے کے بعد مجید اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سلیم کی دونوں کلائیاں اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیں سلیم کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا وہ مجید کو ٹھڈے مار رہا تھا لیکن مجید ہنس رہا تھا۔

جلال نے آگے بڑھ کر انہیں چھڑانے کی کوشش کی لیکن مجید نے اسے دھکا دے کر پیچھے گراتے ہوئے کہا ''تم دور رہو، سلیم کو اپنا غصہ نکال لینے دو'' سلیم موقع ملتے ہی کھیت سے مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اسے مارنے لگا۔ مجید ادھر ادھر بھاگ کر اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ ایک ڈھیلا مجید کے سر پر لگا اور وہ اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ سلیم ایک اور ڈھیلا اٹھا کر قدرے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اپنا ہاتھ بلند کیا لیکن وہ ادھر ادھر بھاگنے کی بجائے ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ''مارتے کیوں نہیں؟'' اس نے کہا سلیم نے ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔

مجید نے زمین سے سلیم کی ٹوپی اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر دونوں نے

اپنے اپنے بستے اٹھا لیے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجید مسکرا رہا تھا اور سلیم اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجید نے کہا "لاؤ میں تمہارے کپڑے جھاڑ دوں" اور سلیم کھلکھلا کر ہنس پڑا وہ سب ہنس رہے تھے

جلال نے کہا "سلیم! مجید بگلے اور بلی کے بچوں کو نہیں مارے گا یہ تمہیں یونہی ڈرا رہا تھا۔"

"میں جانتا ہوں" سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا

مجید نے کہا "لیکن جلال کے بچے، تمہاری مرغی نے بچے نکالے ہیں اور میں انہیں نہیں چھوڑوں گا میں انہیں سلیم کی بلی کے آگے ڈال دوں گا وہ مرغی کے بچوں کو کھا لیتی ہے۔"

جلال کو اب سکول سے زیادہ اپنی مرغی کے بچوں کی فکر تھی وہ سوچ رہا تھا "کاش میں ان کی باتوں میں دخل نہ دیتا!"

سلیم نے اسے مغموم دیکھ کر اس کے کان میں کہا "جلال مجید تمہیں یونہی ڈرا رہا ہے"

جب یہ بچے اسکول میں داخل ہوئے تو داؤد گھنٹی بجا رہا تھا۔ اس نے مجید کو دیکھتے ہی کہا "مجید میں نے آج ایک درخت پر طوطے کے بچے دیکھے ہیں، آج چھٹی کے بعد وہاں چلیں گے۔"

سلیم نے کہا "میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا"

داؤد نے کہا "وہاں بہت سے بچے ہیں میں تمہیں بھی ایک دوں گا"

جلال نے کہا ''اور مجھے؟''

داؤد نے کہا ''میں تم سب کو ایک ایک بچہ اتار دوں گا لیکن بولنے والا طوطا میرا ہوگا!''

سلیم نے کہا ''بولنے والا کیسا ہوتا ہے؟''

''اس کے گلے میں دھاری ہوتی ہے؟''

☆☆☆☆☆

تیسرے پہر اسکول میں چھٹی ہوئی اور داؤد کی رہنمائی میں لڑکے طوطے کے بچوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ سلیم نے اسے ایک آنہ دیا اور جلال نے اسے ایک پیسے کی مونگ پھلی خرید دی تھی۔ گلاب سنگھ اور بشیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل اسے اپنے گھروں سے گڑ لا دیں گے اور داؤد اس کے عوض انہیں طوطے کا ایک ایک بچہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مجید سے اس نے کوئی قیمت نہیں مانگی تھی تاہم وہ داؤد کے بعد دوسرا بہترین طوطا حاصل کرنے کے لیے اسے مور کا ایک انڈا دینے کا لالچ دے چکا تھا۔ دو لڑکے داؤد کے اپنے گاؤں کے تھے اور اس نے پہلے ہی ان سے شرائط طے کر رکھی تھیں۔

راستے میں مجید نے داؤد سے پوچھا ''اگر بچے تھوڑے ہوئے تو؟''

داؤد نے جواب دیا ''نہیں اس درخت پر کئی گھونسلے ہیں صرف چڑھنا ذرا مشکل ہے۔''

مجید نے کہا ''تم کہتے تھے کہ بولنے والا طوطا تم کسی کو نہیں دو گے؟''

داؤد نے جواب دیا ''اگر دو ہوئے تو میں ایک تمہیں دے دوں گا''

سلیم نے کہا ''اور مجھے نہیں دو گے؟''

''اگر زیادہ ہوئے تو تمہیں بھی دوں گا''

سلیم نے کہا ''داؤد! درخت پر چڑھ کر تمام گھونسلے اچھی طرح دیکھنا!''

داؤد نے جواب دیا ''دیکھوں گا لیکن وہ طوطے جن کے گلے میں دھاری ہوتے ہے، زیادہ نہیں ہوتے۔''

سلیم نے کہا ''دیکھو داؤد مجھے دھاری والا طوطا چاہیے میں کل تمہیں ایک آنہ اور لا دوں گا اور گڑ بھی لا دوں گا''

مجید کو یہ بات پسند نہ تھی کہ سلیم اس کی موجودگی میں کسی اور کی منت کرے اس نے کہا ''سلیم! اگر اس نے تمہیں دھاری والا طوطا نہ دیا تو میں خود درخت پر چڑھ کر تمہیں طوطا اتار دوں گا''

داؤد نے کہا ''میں شرط لگاتا ہوں تم اس درخت پر نہیں چڑھ سکتے اس کا تنا بہت موٹا ہے صرف ایک ٹہنی ہے جسے پکڑ کر اوپر چڑھا جا سکتا ہے لیکن تم میں سے کسی کے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس ٹہنی کو پکڑنے کے لیے مجھے بھی تمہارا سہارا لینا پڑے گا۔''

مجید نے کہا ''سلیم! اگر تمہیں دھاری والا طوطا نہ ملا تو میں تمہیں اپنا طوطا دے دوں گا میں دوسرا لے لوں گا۔''

پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر لڑکوں نے اپنے بستے زمین پر رکھ دیے مجید اور جلال نے داؤد کو سہارا دینے کے لیے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ لیں۔ ایک لڑکا ان کے قریب زمین پر ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ داؤد نے ایک پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور دوسرا پاؤں مجید اور جلال کی کلائیوں پر رکھ دیا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں ان کی کلائیوں پر رکھ دیے۔ بوجھ سے جلال کی کمر جھک رہی تھی لیکن مجید نے اس کی کلائیاں پکڑ رکھی تھیں۔

جلال کہہ رہا تھا ''داؤد جلدی کرو!''

داؤد نے مجید اور جلال کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی اس نے درخت کی شاخ پر ہاتھ نہیں ڈالے تھے کہ جلال اپنی جگہ سے ہل گیا۔

''جلال کے بچے تم۔۔۔۔'' داؤد اپنا فقرہ پورا نہ کرسکا اور پیٹھ کے بل گرا لیکن گرتے ہی اٹھ بیٹھا لڑکے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہے تھے داؤد نے اپنی پگڑی جواب ڈھیلی ہو چکی تھی، اتار کر پھینک دی اور بھاگ کر دونوں ہاتھوں سے جلال کے کان پکڑ لیے۔

مجید نے جلدی سے آگے بڑھ کر جلال کو چھڑاتے ہوئے کہا ''داؤد یہ تمہارا قصور ہے، تمہیں اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی اب ہم پھر تمہیں سہارا دیتے ہیں اب کے زیادہ بوجھ مجھ پر رکھنا''

داؤد دوبارہ ہمت آزمائی کے لیے تیار ہو گیا تاہم اس نے کہا ''جلال کے بچے! اگر اب کی بار تم نے مجھے گرایا تو تمہیں طوطا نہیں ملے گا۔''

اس مرتبہ جلال میں ذمہ داری کا احساس نسبتاً زیادہ تھا داؤد کسی او حادثہ کے بغیر درخت پر چڑھ گیا۔

درخت کا درمیانی تنا جس میں داؤد کے اندازے کے مطابق جا بجا طوطوں کے گھونسلے تھے، بہت موٹا تھا لیکن اس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داؤد ان شاخوں سے سیڑھیوں کا کام لے کر تنے کے گرد چکر لگاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

ایک سوراخ سے دو طوطے اڑے داؤد نے خوش ہو کر اندر ہاتھ ڈالا اور تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد کہا ''اس کے اندر کچھ بھی نہیں، میرے خیال میں بچے بڑے ہو کر اڑ گئے ہیں''

لڑکوں کو مایوسی ہوئی سلیم نے کہا ''داؤد اوپر بہت سے سوراخ ہیں، ان میں بچے ضرور ہوں گے تم اچھی طرح دیکھو!''

مجید نے جواب دیا ''تم فکر نہ کرو''

ایک اور سوراخ سے طوطا اڑا اور داؤد اندر ہاتھ ڈال کر چلا اٹھا ''مل گئے! مل گئے!! دو! نہیں تین'' اس کے بعد تین بچے نکال کر ٹہنی پر رکھ دیے اور انہیں غور سے دیکھنے کے بعد کہا ''ان میں سے کسی کے گلے میں بھی دھاری نہیں اور یہ بہت چھوٹے ہیں ان کے پر ابھی اچھی طرح نہیں نکلے۔''

چند لڑکے انہیں حاصل کرنا ہی اپنے لیے کافی سمجھتے تھے لیکن سلیم نے نیچے سے آواز دی ''دیکھو! داؤد انہیں وہیں رہنے دو یہ بہت چھوٹے ہیں یہ مر جائیں گے۔''

داؤد نے تینوں بچے گھونسلے میں رکھ دیے اور کہا ''میں اور اوپر دیکھتا ہوں''

ایک اور گھونسلے سے داؤد کو دو بچے ملے لیکن اسے کسی کے گلے میں دھاری نظر نہ آئی تاہم یہ کافی بڑے تھے نیچے لڑکے اپنی جھولیاں تانے کھڑے تھے لیکن داؤد نے کہا "میں واپسی پر انہیں اپنی جھولی میں ڈال لاؤں گا، ابھی اوپر اور گھونسلے ہیں"

چوٹی کے قریب پہنچ کر داؤد کو ایک اور گھونسلا دکھائی دیا اور وہ چلایا "مجید اوپر دیکھو چوٹی پر کسی بڑے جانور کا گھونسلا ہے۔"

مجید نے تھوڑی دیر غور سے دیکھنے کے بعد کہا "یار یہ بہت بڑا گھونسلا ہے کہیں چیل کا تو نہیں؟"

جلال نے کہا "داؤد میری ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے"

مجید نے کہا "تم بکتے ہو بھلا چیل سونا کہاں سے لاتی ہے۔"

جلال نے کہا "سچ کہتا ہوں مجید! ماں کہتی تھی کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے"

مجید نے کہا "اگر نہ ہوا تو؟"

جلال کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا لیکن سلیم نے کہا "ہاں مجید! جلال جھوٹ نہیں کہتا چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے تمہیں وہ کہانی یاد نہیں؟ ایک رانی نہا رہی تھی، اس نے اپنا ہار اتار کر مکان کی چھت پر رکھ دیا اور چیل اسے لے کر اڑ گئی۔ ایک آدمی جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تو اسے چیل کے گھونسلے سے سونے کا ہار مل گیا۔ وہ ہار اٹھا کر راجہ کے پاس لے گیا اور راجہ نے اسے بہت سا انعام دیا۔"

جلال نے کہا "دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ چیل کے گھونسلے میں سونا ہوتا ہے"

مجید نے داؤد کو آواز دی "دیکھو داؤد شاید تمہیں بھی ہار مل جائے"

لیکن داؤد سلیم کی کہانی سن چکا تھا اسے اب کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی وہ تیزی سے چوٹی کی طرف چڑھ رہا تھا اب اس کی نگاہ میں دھاری والے طوطے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔۔۔ داؤد سونے کے ہار کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا لیکن جونہی اس نے گھونسلے کے قریب پہنچ کر ہاتھ بلند کیا، گھونسلے میں پھڑ پھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور ایک چیل اس کے سر پر جھپٹا مار کر ایک طرف اڑ گئی۔ داؤد نے زندگی میں پہلی بار سر کے بالوں کی ضرورت محسوس کی۔ وہ ابھی اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ چیل نے دوسری بار فضا میں غوطہ لگایا اور اس کے سر میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی داؤد نے زور سے ہاتھ مار کر اسے پھر ایک بار اڑا دیا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا لیکن چیل اس پر بار بار جھپٹ رہی تھی تھوڑی دیر میں داؤد چوٹی کی پتلی اور خطرناک ٹہنیوں سے اتر کر قدرے مضبوط شاخوں پر پاؤں رکھ چکا تھا لیکن اتنی دیر میں مادہ چیل کی چیخیں سن کر نر بھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا تھا اور وہ دونوں یکے بعد دیگرے اس پر جھپٹ رہے تھے اور ان کے ٹھونگوں اور پنجوں کا ہدف داؤد کی استرے سے منڈی ہوئی چمکدار کھوپڑی تھی نیچے اس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اوپر سے چلا رہا تھا "جلال کے بچے تمہاری ماں نے چیل کے گھونسلے میں سونا۔۔۔"

چیل نے اس کے سر پر جھپٹا مارا اور وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔

مجید بار بار کہتا "آئی، آئی! چیل آئی!!"

اور داؤد اپنے ایک ہاتھ سے ٹہنی پکڑ کر دوسرے ہاتھ اور بازو کو اپنے سر اور

آنکھوں کے لیے ڈھال بنالیتا۔ پھر وہ تیزی سے چند قدم نیچے آجاتا مجید پھر چلایا''

اب دوسری آئی!''

داؤد نے گرتے، سنبھلتے، چیختے، چلاتے درخت کی نچلی ٹہنی پر پہنچ کر زمین پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے سر میں چیلوں کے پنجوں اور ٹھونگوں کے نشان تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ لڑکوں کے قہقہے اب بند ہو چکے تھے۔ داؤد تھوڑی دیر بے حس و حرکت زمین پر بیٹھا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا''

جلال کے بچے تم بھی ہنستے تھے!''

جواب نہ پا کر اس نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا، جلال وہاں نہ تھا، رام لال نے ایک طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا''ارے جلال وہ جا رہا ہے!''

''کہاں؟'' داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا

''وہ دیکھو!''

داؤد چلایا''ٹھہرو! جلال کے بچے!''

لیکن جلال بغل میں بستہ دبائے سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کی رفتار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں پہنچے بغیر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔

☆☆☆☆☆

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ لڑکے مدرسے کے صحن میں کھڑے اوپر بادلوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مغرب سے اٹھنے والی گھٹا کی رفتار کافی تیز تھی۔ تاہم

بچوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر ماسٹر جی کی آمد سے پہلے بارش شروع نہ ہوگئی تو انہیں چھٹی نہیں ملے گی سیاہ رنگ کے بادل ابھی تک سورج سے کچھ دور تھے۔ گزشتہ شب کافی مینہ برس چکا تھا اور دن کے وقت بھی بارش کے آثار دیکھ کر دوسرے دیہات سے آنے والے بہت سے لڑکے غیر حاضر تھے۔

سلیم، مجید اور ان کے گاؤں کے دوسرے لڑکے اب شاذونادر ہی غیر حاضر رہا کرتے تھے۔ لیکن ایسے دنوں میں آم اور جامن کے درختوں کے نیچے یا جھیلوں اور برساتی ندیوں کے کنارے ان کے لیے دلچسپی کے ہزاروں سامان تھے جب رات کے وقت بارش ہو رہی تھی تو انہیں سو فیصدی یقین تھا کہ صبح انہیں سکول نہیں جانا پڑے گا اور وہ سارے دن کے لیے کھیلنے، کودنے، تیرنے اور نہانے کے پروگرام بنا چکے تھے۔ لیکن علی الصباح بارش تھم گئی اور مشرق کی طرف آسمان کے کونے پر بادلوں نے ادھر ادھر سمٹ کر سورج کے لیے جگہ خالی کر دی۔ انہیں مایوسی ہوئی تاہم جب وہ گاؤں سے نکلے تو جنوب مغرب کے کونے سے کالی گھٹا اٹھ رہی تھی وہ اس امید پر چلتے رہے کہ یہ گھٹا ان کے سکول پہنچنے سے پہلے برس پڑے گی اور وہ ہنستے، اچھلتے او رکودتے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ انہوں نے یہ فاصلہ کافی سست رفتار سے طے کیا لیکن بارش نہ ہوئی مدرسے کی چاردیواری کے قریب پہنچ کر مجید نے کہا ’’آج بہت کم لڑکے آئے ہوں گے، ابھی تک گھنٹی نہیں بجی، اگر آدھے لڑکے غیر حاضر ہوئے تو ماسٹر جی چھٹی دے دیں گے۔ اگر تھوڑی دیر گھنٹی نہیں بجی تو بارش شروع ہو جائے گی ماسٹر جی پھر بھی چھٹی دے دیں گے۔‘‘

سکول پہنچ کر وہ باقی لڑکوں کی طرح بے قراری سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے بادل اب آسمان کے مشرقی کونے میں پہنچ چکے تھے اور سورج چھپ چکا تھا۔ اودے اور کالے رنگ کے بادل ایک دوسرے میں گھل مل جانے کے بعد ایک دھندلے رنگ کے نقاب میں تبدیل ہو رہے تھے۔ سکول کی ایک طرف ایک جوہڑ میں مینڈکوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور دوسری طرف آم کے درخت پر پپیہا بول رہا تھا۔

داؤد ماسٹر جی کا حقہ اٹھائے اندر داخل ہوا اور لڑکوں کے چہروں پر مایوسی چھا گئی۔

داؤد نے اندر جا کر حقہ ماسٹر جی کے چبوترے پر رکھ دیا اور باہر نکل کر گھنٹی بجا دی لڑکے قطاریں باندھ کر صحن میں کھڑے ہو گئے اور داؤد کے حکم سے ترانہ شروع ہوا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

لیکن کم سن بچوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ شمع کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ وہ صرف آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے ان کے دلوں میں فقط ایک ہی تمنا تھی اور وہ یہ کہ بارش ہو جائے اور ماسٹر جی گھر سے اپنے حقے کا پیچھا نہ کریں۔

لیکن ماسٹر جی آ گئے وہ پٹواری کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے دونوں پھاٹک پر رک گئے وہ کسی اہم موضوع پر بحث کر رہے تھے اور عام حالات میں ان کی بحث بہت طویل ہوا کرتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے پٹواری نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ’’ماسٹر جی یہ بادل

ضرور بر سے گا رات بھی خوب بارش ہوئی ہے۔''

ماسٹر جی نے بھی آسمان کی طرف دیکھا اور پھر صحن میں لڑکوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''آج بہت سے لڑکے غیر حاضر ہیں۔''

دعا ختم ہوئی ماسٹر جی کے حکم سے داؤد اندر سے حاضری کا رجسٹر اٹھا لایا۔ عام حالات میں ماسٹر جی اپنے چبوترے پر بیٹھ کر حقے کے دو چار کش لگانے کے بعد حاضری لگایا کرتے تھے لیکن آج انہوں نے صحن میں کھڑے کھڑے حاضری لی پٹواری ان کے قریب کھڑا رہا مسٹر جی نے حاضری لیتے لیتے آسمان کی طرف دیکھا ایک دو بوندیں ان کے رجسٹر پر گریں اور انہوں نے جلدی سے حاضری ختم کر کے رجسٹر داؤد کے ہاتھ میں دے دیا۔

پٹواری نے کہا ''ماسٹر جی آج چھٹی کریں''

ماسٹر جی نے جواب دینے کی بجائے آسمان کی طرف دیکھا۔ مجید نے سلیم کے بازو پر چٹکی لی اور اس نے ایک لڑکے کے پیچھے منہ چھپا کر بلند آواز میں کہا ''چھٹی! چھٹی!!''

دوسرے کونے سے کسی اور لڑکے نے اس کی تقلید کی اور تمام لڑکے نعرے لگانے لگے چھٹی، چھٹی، چھٹی!

اگر ماسٹر جی کے دماغ پر موسم کے خوشگوار اثرات نہ ہوتے تو وہ شاید ڈنڈا اٹھا لیتے یا انہیں کان پکڑنے کا حکم صادر فرماتے لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور اس کے ساتھ ہی لڑکوں کے نعرے اور زیادہ بلند ہو گئے ماسٹر جی نے پٹواری کی

طرف دیکھا۔

پٹواری نے کہا ''ماسٹر جی آج آم کھانے کا دن ہے۔''

ماسٹر جی نے پھر لڑکوں کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا ''بہت نالائق ہو تم اچھا جاؤ! لیکن کل کوئی غیر حاضر نہ رہے۔''

☆☆☆☆☆

لڑکے سکول سے نکل کر گاؤں سے باہر ایک جوہڑ کے کنارے جمع ہو گئے۔ گدلے پانی کا یہ جوہڑ ایک چھوٹے سے برساتی نالے کے شفاف پانی سے بھر چکا تھا۔ تھوڑی دیر پانی میں تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد لڑکوں نے کبڈی کھیلنی شروع کر دی۔ سکول والے گاؤں کے لڑکے تعداد میں زیادہ تھے اور باہر کے دیہات سے آنے والے لڑکوں کی تعداد تھوڑی تھی، اس لیے فریقین کی تعداد برابر کرنے کے لیے سکول والے گاؤں کے چند لڑکے باہر سے آنے والے لڑکوں کی طرف ہو گئے۔ داؤد اور مجید کو کھیل میں شریک کرنے سے تمام لڑکے گھبراتے تھے، اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ مجید ایک طرف ہو گا اور داؤد اس کے مخالف کھیلے گا اور وہ چھوٹے بچوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ایک طرف سے اگر مجید کبڈی کے لیے آئے گا تو اس کا مقابلہ صرف داؤد کے ساتھ ہو گا، اس طرح داؤد کا مقابلہ صرف مجید کرے گا۔ کھیت کے درمیان دو بستے رکھ کر لکیر کھینچ دی گئی لیکن کھیل شروع ہونے والا تھا کہ مجید کو جوہڑ کے کنارے خیر دین کے گدھے نظر آ گئے اور وہ داؤد کو اپنے ساتھ لے کر اس طرف

چل دیا۔

سلیم نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو مجید؟"

اس نے کہا "تم کھیلو سلیم ہم ابھی آتے ہیں"

مجید کی غیر حاضری میں سلیم اپنی طرف کے کھلاڑیوں کا لیڈر تھا۔ دوسری طرف اس کا مد مقابل موہن سنگھ تھا۔ کبڈی کی ابتدا موہن سنگھ نے کی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی مخالف ٹیم کے ایک لڑکے کو ہاتھ لگا کر چلا گیا۔ اس کے جواب میں سلیم کی طرف سے گلاب سنگھ کبڈی کے لیے نکلا اور ایک لڑکے کو پچھاڑ آیا۔ موہن سنگھ دوبارہ ایک لڑکے کو چھو گیا۔ پھر سلیم کی باری آئی اور وہ اپنے مد مقابل کو پچھاڑ کر توازن پورا کر آیا لیکن تھوڑی دیر میں سلیم نے محسوس کیا کہ جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آتا ہے تو اس کے اپنے گاؤں کے لڑکوں میں سے کوئی اسے پکڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ گلاب سنگھ نے سلیم کے کان میں کہا "سلیم لڑکے موہن سنگھ سے ڈرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مقابلہ کیا تو اس کے باپ کے نوکر انہیں ان کے گھروں میں جا کر پیٹ آئیں گے انہوں نے ہمارے آدھے ساتھیوں کو بٹھا دیا ہے، یہ جلال، رام لال اور بشیر بھی ڈرتے ہیں۔"

سلیم نے کہا "اے جلال تم موہن سنگھ سے ڈرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "جب میں کبڈی کے لیے جاتا ہوں تو وہ مجھے گالیاں دیتا ہے۔"

"اچھا اب کی بار میں اس کی خبر لوں گا؟"

سلیم کو یوں بھی اس سے نفرت تھی جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ موہن سنگھ نے داؤد کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا اور اپنے باپ سے داؤد کے باپ کی بے عزتی کروائی تھی وہ اسے بہت حقیر سمجھتا تھا۔

جب موہن سنگھ کبڈی کے لیے آیا تو سلیم آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا موہن سنگھ نے پوری طاقت سے اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس کے جواب میں سلیم کا ہاتھ اس کی گردن پر لگا اس نے الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر دو ہتڑ ماری اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا موہن سنگھ نے گرتے ہی ''کبڈی کبڈی'' کی بجائے گالیوں کی گردان شروع کر دی یہ دونوں کے لیے نیا تجربہ تھا موہن سنگھ کے ساتھ کھیل کود میں کسی نے آج تک اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور سلیم کو کسی نے گالی نہیں دی تھی۔ دونوں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ موہن سنگھ نیچے گر کر بھی گالیاں دے رہا تھا اور سلیم ہر گالی کے جواب میں اسے ایک مکا رسید کر دیتا تھا۔ ایسی حالت میں زمیندار کے صاحبزادے کی مدد کرنا اس کے گاؤں کے غریب لڑکوں کے لیے ایک مجبوری تھی۔ پانچ چھ لڑکے سلیم پر پل پڑے لیکن گلاب سنگھ اور بشیر بھاگ کر اپنی تختیاں اٹھا لیں۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی باہر کے دیہات کے تین اور لڑکے سلیم، گلاب سنگھ، اور بشیر کے طرف دار بن گئے اور باقی غیر جانبدار ہو گئے۔ جلال حسب عادت اپنا بستہ اٹھا کر پوری رفتار سے اپنے گاؤں کا رخ کر رہا تھا۔

سلیم نے کھیت کی چکنی مٹی اٹھا کر موہن سنگھ کے منہ پر تھوپ دی اور اسے چھوڑ کر

اپنے ساتھیوں کی صف میں کھڑا ہوگیا۔

موہن سنگھ، سلیم کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا "دیکھو! اب یہ بھاگ نہ جائیں، انہیں گھیر لو!"

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اتنی دیر میں رام لال جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر دہائی دے رہا تھا "دوڑو! مجید! لڑائی ہوگئی! دوڑو، دوڑو! وہ گدھوں پر ڈنڈے برساتے چلے آ رہے تھے اور خیر دین حسب معمول ان کے پیچھے تھا۔"

موہن سنگھ کے ساتھ اس کے حکم کے مطابق کھیت کے چاروں طرف گھیرا ڈال چکے تھے۔

سلیم اور اس کے ساتھی مشورہ کرنے کے بعد اچانک اس طرف ٹوٹ پڑے جدھر موہن سنگھ کھڑا تھا۔ گلاب سنگھ کی تختی ایک لڑکے کے بازو پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلا، بشیر نے دوسرے کے گھٹنے پر ضرب لگائی اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باقی ادھر ادھر ہٹ گئے سلیم کا رخ موہن سنگھ کی طرف تھا، وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ چکا تھا۔ اس نے بھاگ کر ان تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن سلیم نے اس کا راستہ روک لیا۔ مجبوراً اس نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ سلیم نے اس کی پیٹھ پر ایک تختی رسید کی اور اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ دھوبی کے گھر تک سلیم نے اس کا پیچھا کیا لیکن جب دھوبی کا کتا گھر سے نکل کر بھونکتا ہوا موہن سنگھ کے پیچھے ہو لیا تو سلیم ہنستا ہوا واپس آ گیا۔

اتنی دیر میں مجید اور داؤد پہنچ چکے تھے اور موہن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو کان پکڑنے کا حکم دے چکے تھے۔ سلیم نے کہا ''داوے دان کا کوئی قصور نہیں انہوں نے ہمیں کچھ نہیں کہا یہ موہن سنگھ کے خوف سے ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ موہن سنگھ اپنے نوکروں سے پٹوائے گا۔''

داؤد نے کاہ ''اچھا چھوڑ دو کان''

ایک لڑکے نے کہا ''سلیم! اب تم بھاگ جاؤ موہن سنگھ تم سے مار کھا کر گیا ہے وہ اپنے باپو اور نوکروں کو لے آئے گا!''

''بھاگنے والے ڈرپوک ہوتے ہیں'' اس نے غصے سے لال پیلا ہو کر جواب دیا

مجید نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا ''دیکھو داؤد! میرا بھائی ہے نا آخر!''

داؤد نے کہا ''دیکھو مجید! اس کے باپ یا نوکروں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے تمہارا ساتھ دینا پڑے گا اور تم جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دفعہ مجھے پیٹا تھا اور میرے باپ کی بے عزتی کی تھی۔''

مجید نے تن کر کہا ''آج اگر وہ آئے تو ہم تمہارا بدلہ لیں گے''

''لیکن مجھے اس کی سزا ضرور ملے گی، وہ کہیں گے یہ سب میری شرارت ہے''

سلیم نے کہا ''دیکھو داؤ د تم چلے جاؤ ہم نہیں جائیں گے''

داؤد نے بگڑ کر کہا ''چلا جاؤں، تمہیں اور مجید کو چھوڑ کر، نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ میرے باپ کی بے عزتی کریں گے لیکن اس کے بدلے

میں میں موہن سنگھ کے سر کا ایک بال نہیں چھوڑوں گا۔''

سکول والے گاؤں کے لڑکوں کو ایک طرف اس بات کا احساس تھا کہ موہن سنگھ اپنے باپ اور نوکروں کو لے کر ضرور آئے گا۔ دوسری طرف وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مجید، سلیم اور ان کے ساتھی بھاگنے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ ان میں سے بعض دور سے تماشا دیکھنے کے شوق میں قریب ہی ایک بڑ کے درخت پر چڑھ گئے داؤد اور مجید کے آ جانے سے باہر کے دیہات کے وہ لڑکے جو پہلی لڑائی میں غیر جانبدار رہے تھے اب ان کے ساتھ ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

مجید کے مشورے پر لڑکوں نے اپنے بستے اٹھا کر پاس ہی گنے کے ایک کھیت میں چھپا دیے اور جوہڑ کے کنارے بیٹھ گئے۔

مجید نے کہا ''دیکھو! جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اٹھے، جب کوئی آئے گا میں خود اس کے ساتھ بات کروں گا۔''

مجید نے اپنی پگڑی اتار کر اسے دوہرا کیا اور پھر کوئی دو سیر گیلی مٹی لے کر اس کا گولہ بنایا اور ایک سرے میں باندھ دیا اس کے بعد وہ اٹھا اور ایک طرف ہو کر بولا۔''

داؤد جانتے ہو یہ کیا ہے؟''

داؤد کی خاموشی پر اس نے خود ہی جواب دیا ''یہ ایک ہتھیار ہے میں نے یہ چچا

افضل سے سیکھا ہے چچا افضل نے ایک دفعہ اس کے ساتھ ایک ڈاکو کو اس کے گھوڑے سمیت گرا لیا تھا۔"

"کیسے؟" داؤد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا

مجید نے پگڑی کا ایک سرا دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اسے اپنے سر سے اوپر گھماتے ہوئے بولا "دیکھو! اب یہ لاٹھی سے زیادہ خطرناک ہے اگر کوئی اس کی لپیٹ میں آجائے تو وہیں گر پڑے گا" مجید نے عملی ثبوت دینے کے لیے پگڑی کو تیزی سے گھماتے ہوئے مٹی والا سرا زمین پر دے مارا۔ اس سے گیلی اور نرم زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا پڑ گیا۔ مجید لڑکوں کے قریب آبیٹھا اور ان کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

داؤد نے جلدی سے اپنی پگڑی اتاری اور دونوں ہاتھوں سے مٹی کھودتے ہوئے کہا "ارے یہ تو بہت اچھا ہتھیار ہے لیکن ----- یہ مٹی نرم ہے اگر اس کی بجائے!" وہ اپنا فقرہ پورا کیے بغیر اٹھ کر ایک کنوئیں کی طرف بھاگا اور ٹوٹی ہوئی منڈیر سے دو اینٹیں اٹھا لایا۔ اس نے ایک اینٹ اپنی پگڑی کے ساتھ باندھ لی اور دوسری مجید کو دیتے ہوئے کہا "مٹی کی بجائے یہ ٹھیک ہے مجید!"

باقی لڑکے بھی اپنے اپنے لیے اینٹیں اٹھا لائے تھوڑی دیر میں وہ سب اس جدید قسم کے ہتھیار سے مسلح ہو چکے تھے لیکن سلیم کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ پگڑی جیسی کارآمد چیز کی بجائے اپنے سر پر ٹوپی پہن کر آیا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر پڑی خیر دین کمہار گدھوں کے

پیچھے بھاگنے کے بعد تازہ دم ہونے کے لیے جوہڑ میں نہا رہا تھا۔اس کے کپڑے کنارے پر پڑے ہوئے تھے عام حالات میں سلیم شاید ایسی حرکت نہ کرتا لیکن معاملہ نازک تھا، بھاگتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خیر دین کی پگڑی اٹھالی خیر دین دوسری طرف منہ کر کے ڈبکیاں لگا رہا تھا اس لیے اس کی نگاہ سلیم پر نہ پڑی۔

جب سلیم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو موہن سنگھ اور اس کے تیس نوکر گاؤں سے نکل کر جوہڑ کا رخ کر رہے تھے۔اب اینٹ مہیا کرنا مشکل تھا۔اس لیے سلیم کو مٹی پر اکتفا کرنا پڑا۔

موہن سنگھ کے ہاتھ میں ہاکی تھی اور اس کے نوکروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔داؤد نے کہا "مجید اس کالی پگڑی والے نے میرے باپ کو جوتے مارے تھے۔اس کے ساتھ میں نپٹوں گا۔"

مجید نے کہا "لیکن جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی نہ اٹھے"

جب وہ قریب آ گئے تو مجید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔نوکروں نے جب دیکھا کہ ان بچوں کے پاس ان لاٹھیوں کا کوئی جواب نہیں تو اطمینان سے ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

ایک آدمی نے کہا "موہن سنگھ کو کس نے مارا ہے؟"

موہن سنگھ سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا "مجھے اس نے مارا ہے"

مجید نے کہا "تم انہیں کیوں لائے ہو اپنے باپو کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

موہن سنگھ نوکروں کی طرف دیکھ کر پھر چلایا ''یہ سلیم کا بھائی ہے اور یہ تمام لڑکے اس کے ساتھی ہیں، ان سب کو پکڑ لو!''

نوکر نے کہا ''تم سب ہمارے ساتھ سردار جی کے پاس چلو''

مجید نے بے پروائی سے کہا ''ارے دیکھے ہیں تمہارے سردار جی! نہیں جاتے ہم اس کے پاس۔''

نوکر کو اس غیر متوقع جواب نے ایک لمحہ کے لیے پریشان کر دیا وہ مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا کالی پگڑی والا پست قامت آدمی کچھ دیر غور سے داؤد کی طرف دیکھنے کے بعد اچانک چلا اٹھا ''ارے یہ نور دین تیلی کا لڑکا ہے ابے تیلی کے بچے، تمہیں وہ مار بھول گئی؟''

سلیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''داؤد پر تمہیں اس لیے غصہ آتا ہے کہ اس کا باپ غریب ہے موہن سنگھ کو میں نے مارا ہے اور جب بھی یہ گالی دے گا میں اسے ماروں گا۔''

نوکر نے سلیم کو ڈرانے کی نیت سے لاٹھی اٹھائی لیکن اس سے قبل مجید کے ہاتھ حرکت میں آ چکے تھے پگڑی کے ساتھ تیزی سے گھومتی ہوئی اینٹ اس کو پسلی پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹ کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ پسلی پر رکھ کر کراہنے لگا۔ اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے مجید نے اچانک اس کی لاٹھی اٹھا لی ایک آدمی نے مجید کو لاٹھی مارنے کی کوشش کی لیکن وہ جست لگا کر ایک طرف ہو گیا اتنی دیر میں مجید کے باقی ساتھی میدان میں آ چکے تھے

مجید کے مدمقابل نے اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے لاٹھی بلند کی لیکن پیچھے سے گلاب سنگھ کی پگڑی کے ساتھ گھومتی ہوئی اینٹ اس کی گردن پر لگی اور اس کے ساتھ ہی مجید نے اس کی ٹانگ پر لاٹھی ماردی مجید نے دوسری بار لاٹھی اٹھائی تو وہ بھاگ نکلا۔

وہ آدمی جس نے سب سے پہلے مجید سے چوٹ کھائی تھی اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چار لڑکے اس کے گرد کھڑے تھے ایک اینٹ اس کے سر پر لگی اور وہ منہ کے بل لیٹ گیا۔

موہن سنگھ شکست کے آثار دیکھ کر چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا سلیم آنکھ بچا کر ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد اس کے قریب جا پہنچا موہن سنگھ اس وقت خبردار ہوا جب وہ سلیم کی زد میں آچکا تھا جست لگانے سے پہلے اس کی ٹانگیں پگڑی کی لپیٹ میں آگئیں اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ سلیم کے دو چار گھونسے کھانے کے بعد وہ اٹھا اور اپنی پگڑی اور آدھی قمیض سلیم کے ہاتھوں میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

سلیم بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو لڑائی کا آخری حصہ ایک دلچسپ مشغلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کالی پگڑی والے ٹھنگنے قد کے آدمی پر داؤد نے قسمت آزمائی کی تھی، وہ اینٹ کی ضرب سے تو بچ گیا لیکن داؤد کی پگڑی اس کی گردن کے گرد لپٹ چکی تھی داؤد نے پگڑی کو زور سے جھٹکا دیا اور وہ زمین پر آرہا۔ داؤد اسے گھسیٹ رہا تھا اور اس نے گلا گھٹ جانے کے خوف سے پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔

داؤد کا یہ کھیل دلچسپ سمجھ کر باقی لڑکے بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

موہن سنگھ کا دوسرا نوکر جو زمین پر لیٹا ہوا اپنے چاروں طرف گھومنے والی پگڑیوں کو لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ رہا تھا، اپنے پہریداروں کی توجہ دوسری طرف مبذول ہوتی دیکھ کر اٹھا اور کسی توقف کے بغیر گاؤں کی طرف بھاگ نکلا اور مجید نے جاتے جاتے اس کی پشت پر ایک لاٹھی رسید کر دی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا فتح حاصل کرنیوالوں کو مال غنیمت میں دو لاٹھیاں، دو جوتے، ایک پگڑی اور پھٹی ہوئی قمیض کا ایک ٹکڑا ہاتھ لگا۔ اس کے علاوہ ایک قیدی بھی تھا جسے داؤد نے زندہ گرفتار کر لیا تھا۔ کالی پگڑی والا ٹھنگنے قد کا آدمی اپنی زندگی میں پہلی بار یہ محسوس کر رہا تھا کہ پگڑی جیسی بے ضرر چیز کا اگر غلط استعمال کیا جائے تو یہ ایک خوفناک ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اسے اس بات کا عملی تجربہ ہو رہا تھا کہ لڑکے خاص کر سکولوں کے لڑکے غصے کی نسبت خوشی کی حالت میں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے زمین پر ناک کے ساتھ لکیریں نکال چکا تھا لیکن اس کے بعد کسی نے کہہ دیا کہ اس کی پگڑی کالی ہے، اس کا منہ بھی کالا کر دو۔ چنانچہ آٹھ دس دواتوں کی سیاہی اس کے منہ پر مل دی گئی پھر کسی نے قہقہہ لگایا اور وہ سمجھ گیا کہ اب کوئی نئی مصیبت آئے گی چنانچہ قہقہہ لگانے والے نے یہ کہہ کر خدشات پورے کر دیے کہ اب اسے جوتے لگاؤ اور اس کے سر پر جوتوں کی بارش ہوئی۔

پھر کسی نے کہا ”چلو اسے اپنے گاؤں لے چلیں۔ بچے اسے دیکھ کر خوش ہوں

گے''اس کا دل بیٹھ گیا مکے، گھونسے، لاتیں اور جوتے کھانے کے بعد اس میں بچوں کے کسی نئے گروہ کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی سکت نہ تھی۔ داؤد نے کہا'' اچھا قسم کھاؤ کہ تم پھر سکول کے کسی لڑکے سے نہیں لڑو گے!''

اس نے کہا''میں قسم کھاتا ہوں''

''اچھا کہو کہ تم ایک بندر ہو''

اس نے کہا''میں ایک بندر ہوں''

''اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں''

''اور میں بندر کی طرح ناچ سکتا ہوں''

مجید نے اس کی پگڑی اس کے گلے میں باندھ دی اور کہا''شاباش! میرے بندر اب ناچ کر دکھاؤ!''وہ بے بسی کی حالت میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا لڑکے شور مچانے لگے'' اسے ناچنا نہیں آتا، اس نے جھوٹ بولا ہے ماسٹر جی جھوٹ بولنے والوں کے کان پکڑواتے ہیں۔''

داؤد نے کہا''اچھا کان پکڑو!''

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کان پکڑ لیے لڑکے اب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

مجید نے کہا''ارے بندر، یوں نہیں گلاب سنگھ تم اسے کان پکڑ کے دکھاؤ۔ گلاب سنگھ نے اس کے سامنے نمونہ پیش کر کے اسے اس سیدھے سادھے مسئلے کی پیچیدگیوں کا احساس دلایا۔''

وہ کان پکڑے سوچ رہا تھا کہ اب اس کے ساتھی سردار جی کے پاس پہنچ گئے ہوں گے، وہ تھوڑی دیر میں آدمیوں کا نیا جتھہ لے کر پہنچ جائیں گے۔ جب اسے بہت زیادہ کوفت ہونے لگی تو وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی موسلا دھار بارش شروع ہو جائیگی اور لڑکے بھاگ جائینگے۔ جب تکلیف نا قابل برداشت ہوگئی تو وہ چلا تھا ''مجھے چھوڑ دو، سردار جی تھوڑی دیر میں گاؤں کے تمام آدمیوں کو لے کر آ جائیں گے۔ تم بھاگ جاؤ''

لڑکے اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

داؤد نے کہا ''چلو مجید! گاؤں کے آدمیوں سے ہم نہیں لڑ سکتے، اگر تم لڑائی کرنا چاہتے ہو تو ایک لڑکے کو اپنے گاؤں بھیج دو''

کسی نے پیچھے سے بارعب آواز میں کہا ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

لڑکے ادھر ادھر ہٹ گئے اور کان پکڑنے والا اس آواز کو تائید غیبی سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ سلیم کا چچا افضل تھا اور اس کے ساتھ گلاب سنگھ کا باپ شیر سنگھ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور لڑکوں کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ انہیں جلال نے بھیجا ہے۔

افضل اور شیر سنگھ نے جنگی قیدی کے چہرے پر سیاہی دیکھ کر قہقہہ لگایا اور بچوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا ''یہ کون ہے؟''

اس کے جواب میں سلیم نے ساری سرگزشت سنا دی۔

افضل اور شیر سنگھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے شیر سنگھ نے کہا ''چرن سنگھ بڑا کمینہ ہے یہ دوسروں کے بچوں کو کیا سمجھتا ہے۔ چلو اس کے پاس چلیں''

افضل نے کہا ''یہیں ٹھہرو! اب وہ زیادہ آدمی لے کر آئے گا''

سلیم نے کہا'' چچا جی اس سے پہلے اس نے داؤد اور اس کے باپ کو اپنے نوکروں سے پٹوایا تھا، آج داؤد نے ہمارا ساتھ دیا ہے اگر آپ نے اسے نہ روکا، تو وہ پھر اس کے باپ کی بے عزتی کرے گا۔''

''ہم اسے ٹھیک کر دیں گے'' یہ کہہ کر افضل سردار کے نوکر کی طرف متوجہ ہوا'' کیوں بدمعاش تمہیں لڑکوں کے مقابلے میں لاٹھیاں اٹھا کر آتے ہوئے شرم نہ آئی؟''

اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا ''چودھری جی! ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کے بچے ہیں''

''دیکھو بدمعاش! بچے سب ایک جیسے ہیں آئندہ اگر تم نے کسی لڑکے پر ہاتھ اٹھایا تو تمہاری خیر نہیں!''

''نہیں چودھری جی!''

''اچھا جاؤ جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرو''

نوکر چند قدم دور جا کر جوہڑ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی گاؤں سے آدمیوں کا شوروغوغا سن کر افضل اور شیر سنگھ چند قدم دور ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ افضل اور شیر سنگھ کی موجودگی میں لڑکوں کو کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ اطمینان سے کبڈی کھیل رہے تھے۔

موہن سنگھ کا باپ چرن سنگھ قریباً دس آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا وہ چیختے چلاتے اور گالیاں دیتے چلے آرہے تھے چرن سنگھ کہہ رہا تھا ''دیکھو یہ بھاگ نہ جائیں ان سب کو پکڑ لو'' اس کے ساتھی لڑکوں کو پکڑنے یا مارنے سے زیادہ انہیں بھگانے کے خواہش مند تھے۔ گاؤں سے نکلتے وقت ان کی زبانیں کافی جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہی تھیں انہیں یقین تھا کہ اگر لڑکے پہلے ہی بھاگ نہیں گئے تو انہیں دیکھ کر بھاگ جائیں گے لیکن وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ کبڈی کھیل رہے تھے اور گاؤں کے آدمیوں کا جوش وخروش پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

چرن سنگھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ گستاخ لڑکے اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں انہوں نے اس کے لڑکے پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے نوکروں کے ہاتھوں مار کھانے کی بجائے الٹا انہیں پیٹ ڈالا تھا وہ ایک ہزار ایکڑ کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دس جنگجو آدمی تھے۔ وہ گلا پھاڑ کر اپنے خوفناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے۔ صرف اس کے گاؤں کی حدود میں ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے کھیت میں، ان کی بے پروائی اور بے توجہی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس گاؤں کے مالک ہیں۔ یہ زمین ان کی ہے اور انہیں گالیاں اور دھمکیاں دینے والے کسی اور ملک کے باشندے ہیں اور وہ ان پر حملہ

کرنے کی بجائے یونہی شور مچاتے ہوئے ان کے قریب سے گزر جائیں گے۔ چرن سنگھ کے نوکر جو تھوڑی دیر پہلے شکست کھا کر گئے تھے، اسے بتا چکے تھے کہ ان کی پگڑیاں لاٹھیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ لیکن اب وہ خالی ہاتھ کھیل رہے تھے۔ حملہ آور جوں جوں محاذ جنگ سے قریب آ رہے تھے، ان کی رفتار اور گفتار میں سنجید گی آ رہی تھی۔

جب وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھے تو افضل اور شیر سنگھ جھاڑی کے عقب سے نکلے اور چند قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

حملہ آوروں پر اچانک ایک سکوت طاری ہو گیا۔ ان کی بجائے اب لڑکے چلا رہے تھے۔

افضل نے لڑکوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور چرن سنگھ اس حرکت کو ایک اچھا شگون سمجھ کر چند قدم آگے بڑھا اس نے کہا "چودھری افضل! ان لڑکوں نے میرے لڑکے اور میرے نوکروں کو مارا ہے۔"

افضل نے جواب دیا "اگر تمہارے لڑکے اور نوکروں نے ان لڑکوں کو اس قسم کی گالیاں دی تھیں جیسی تم ابھی دے رہے ہو تو انہوں نے بہت اچھا کیا ہے۔"

شیر سنگھ نے کہا "چرن سنگھ ہمارا خیال تھا کہ تم اپنے گاؤں کے سارے آدمی لے کر آؤ گے۔ تمہارے بال سفید ہو گئے لیکن عقل نہ آئی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لڑکے کے سوا باقی تمام بچے لاوارث ہیں تو ان میں سے کسی کو ہاتھ لگا کر دیکھو!"

چرن سنگھ نے فدویانہ انداز میں کہا "شیر سنگھ تمہارے ساتھ میری کوئی لڑائی نہیں

لیکن ان لڑکوں نے میرے لڑکے کو بہت مارا ہے۔''

شیر سنگھ نے کہا ''تمہارے لڑکوں کو صرف دو لڑکوں نے مارا ہے ان میں سے ایک میرا لڑکا ہے اور دوسرا افضل کا بھتیجا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں کو گالیاں نہیں سکھائیں لیکن گالیوں کا جواب دینا ضرور سکھایا ہے۔ تمہارے لڑکے نے انہیں گالیاں دی تھیں، اب تمہیں اس بات کا افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ اسے گالیوں کا جواب دیا گیا ہے۔ اگر تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو ہمت کرو، تمہارے ساتھ دس آدمی ہیں ہم صرف دو ہیں اگر تم کہو تو ہم اپنی لاٹھیاں بھی پھینک دیتے ہیں لیکن یہ فوج جو تم اپنے ساتھ لے کر آئے ہو لڑنے والی نظر نہیں آتی۔''

افضل نے کہا ''چرن سنگھ کو صرف بچوں پر غصہ آتا ہے۔ سلیم! گلاب! مجید! ذرا آگے ہو جاؤ۔ سردار جی اپنا غصہ نکال لیں۔''

یہ تینوں لڑکے آگے بڑھ کر چرن سنگھ کے قریب کھڑے ہو گئے چرن سنگھ انتہائی پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اگر اس کے سامنے کوئی اور ہوتا تو وہ کب کا آپے سے باہر ہو گیا ہوتا لیکن افضل اور شیر سنگھ کا معاملہ مختلف تھا۔ بالآخر جہاں طاقت نے جواب دے دیا وہاں عقل کام آئی۔ اس نے کہا ''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ موہن سنگھ نے تمہارے بچوں کو گالیاں دی ہیں تو میں خود اس کی مرمت کرتا۔''

افضل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا ''بچے اپنے باپ اور نوکروں سے گالیاں سیکھتے ہیں اب جاؤ سردار جی ہم تمہارے ساتھ لڑنے نہیں آئے تھے یہ بچوں کا معاملہ تھا کل یہ پھر ایک ہو جائیں گے بڑوں کو ان کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے اگر تم اپنے

لڑکے کے کہنے پر لوگوں کے ساتھ لڑتے پھروگے تو اپنی عزت خراب کروگے۔"

اس کے بعد فریقین میں تھوڑی دیر تک مصالحانہ باتیں ہوتی رہیں سردار چرن سنگھ، افضل اور شیر سنگھ کو اپنے گھر کا پانی پلانے اور اپنے باغ کے آم کھلانے پر اصرار کر رہا تھا اور وہ معذرت کر رہے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی وہ اپنے گاؤں کا رخ کرنے والے تھے کہ جوہڑ کے دوسرے کنارے کسی کی چیخ و پکار نے انہیں اس طرف متوجہ کر دیا۔ پنڈت رام پرشاد چلا رہا تھا "خیرو کے بچے! یہ بے زبان ہے، ارے پاپی اسے نہ مارو!" اور خیرو بے تحاشا اس کی گائے پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ گائے بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور خیرو اسے گھیر گھیر کر مار رہا تھا۔

لوگوں نے بارہا گدھوں پر خیرو کا عتاب دیکھا تھا لیکن پرائی گائے کے ساتھ اس کا یہ سلوک ان کے لیے ایک معما تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ سب جوہڑ کے دوسرے کنارے پہنچ کر خیرو کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور خیرو کہہ رہا تھا "سردار جی! چودھری جی! میری بھی سنو۔ یہ گائے میری پگڑی نگل گئی ہے غضب خدا کا سات گز کی پگڑی۔ بالکل نئی، بہاری لال سے پوچھو۔ میں نے پچھلے مہینے اس سے خریدی تھی مجھے پگڑی کا اتنا افسوس نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک تعویذ بندھا ہوا تھا اور میں نے اس کے لیے پیر ولایت شاہ کو پانچ روپے دیے تھے۔"

افضل نے کہا "ارے تم پاگل تو نہیں ہو گئے گائے تمہاری پگڑی کیسے نگل گئی؟"

اس نے کہا ''چودھری جی خدا کی قسم میری پگڑی گائے نے کھالی ہے میں کپڑے اتار کر نہا رہا تھا۔۔۔۔اور گائے کے سوا کوئی یہاں نہیں تھا۔''

چرن سنگھ نے کہا ''ارے کہیں پانی میں گر گئی ہو گی۔''

''سردار جی، میں کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔''

افضل نے کہا ''تو پھر کسی اور جگہ رہ گئی ہو گی جاؤ جا کر گھر میں تلاش کرو''

''جی میں گھر میں بھی دیکھ آیا ہوں میں آس پاس کے کھیتوں میں بھی تلاش کر چکا ہوں۔۔۔۔پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میری پگڑی پانی میں گر گئی ہے۔ میں دوبارہ کپڑے اتار کر پانی میں تلاش کر رہا تھا تو یہ گائے آ کر میری چادر کا کونہ چبا رہی تھی۔۔۔۔دیکھو!'' اس نے کنارے پر پڑی ہوئی چادر اٹھا کر ایک کونہ انہیں دکھاتے ہوئے کہا ''اگر میں فوراً نہ چھڑاتا، تو وہ اسے بھی نگل جاتی۔''

سلیم، خیرو کی پگڑی بغل میں دبائے ایک طرف کھڑا تھا اس نے مجید کے کان میں کچھ کہا مجید نے داؤد سے سرگوشی کی اور اس نے سلیم سے پگڑی لے کر اپنی قمیض کے دامن میں چھپا لی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد چپکے سے جوہڑ کے کنارے رکھ دی۔

سکول کے لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسی کرنے کے بعد ہنس رہے تھے اچانک خیرو کے گاؤں کے ایک آدمی نے کہا ''ارے وہ کیا ہے؟''

''ابے خیرو کے بچے اندھے تو نہیں ہو گئے تم'' دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر خیرو کی پگڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

کیچڑ اور مٹی سے خیرو کی پگڑی کا حلیہ بہت حد تک بدل چکا تھا لیکن اس کے ساتھ بندھا ہوا تعویذ دیکھ کر اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ پگڑی میری ہے تاہم وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس سے پہلے پگڑی یہاں سے غائب تھی پنڈت رام پرشاد جس نے انتہائی صبر سے گزشتہ صورت حال کا سامنا کیا تھا اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

بارش کی رفتار نے لوگوں کو زیادہ دیر ہٹنے کا موقع نہ دیا جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو سلیم نے آگے بڑھ کر دبی زبان میں افضل سے کہا "چچا یہ داؤد پر غصہ اتاریں گے"

"بیٹا! تم فکر نہ کرو" یہ کہہ کر افضل آگے بڑھا اور چرن سنگھ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا کچھ دیر دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔

جب افضل اور شیر سنگھ بچوں کو لے کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے تو داؤد بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر افضل نے کہا "داؤد! بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ میں نے تمہارے متعلق اس کے کان کھول دیے ہیں اگر وہ اب بھی تمہیں کچھ کہے تو میرے پاس چلے آنا۔"

اگلے دن لڑکوں نے موہن سنگھ کے طرز عمل میں ایک غیر متوقع تبدیلی محسوس کی لڑکے اسے کل کے واقعات سنا سنا کر چھیڑ رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے پڑوس کے لڑکوں نے بتایا کہ اس کے باپ نے گھر پہنچ کر سارا غصہ اس پر نکالا تھا۔

☆☆☆☆☆

افضل اور شیر سنگھ کے سامنے چرن سنگھ کا احساس مرعوبیت بلاوجہ نہ تھا۔ علاقے میں کسی کو بھی ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی ان کی دوستی اور بہادری کی داستانیں دور دور تک مشہور تھیں۔ دونوں چھ چھ فٹ کے تنومند اور خوش شکل جوان تھے دونوں کو کشتی لڑنے، گتکا کھیلنے اور گھوڑوں پر سواری کرنے کا شوق تھا۔

افضل اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا جب سے اس کا بڑا بھائی علی اکبر تحصیلدار رہا تھا اس نے اپنی جیب سے افضل کی خاطر دو نوکر رکھ دیے تھے اور افضل کو کھیتی باڑی کے کاموں سے بہت حد تک چھٹی مل گئی تھی۔

شیر سنگھ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کے چھوٹے اسے کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔

افضل نے پرائمری تک تعلیم پائی تھی اور وہ ہیر وارث شاہ پڑھ لیتا تھا شیر سنگھ نے دوسری جماعت سے اسکول چھوڑ دیا تھا اور اسے ''الف آم'' ''ب بکری'' اور ''ت تختی'' کے سوا سب کچھ بھول چکا تھا۔

تاہم افضل کی زبان سے بار بار سننے کی وجہ سے اسے بھی ہیر وارث شاہ کے کئی اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھ لیتا اور افضل سے سیکھی ہوئی لے میں وارث شاہ کے شعر سنانے لگتا۔ اس کے لیے ہر کتاب وارث شاہ کی ہیر تھی۔ ایک دفعہ سلیم نے اس کے ہاتھ میں دوسری جماعت کی کتاب دیتے ہوئے کہا ''چچا پڑھ کر سناؤ'' اور شیر سنگھ نے یونہی کتاب کھول کر ہیر کے پندرہ بیس شعر سنا دیے۔

علاقے کے دیہاتی میلے افضل اور شیر سنگھ کے بغیر بے رونق سمجھے جاتے، وہ میلوں میں جاتے، کشتی لڑتے، کبڈی کھیلتے اور اگر کوئی مجبوری پیش آ جاتی تو لٹھ بازی بھی کر لیتے، دیہاتی میلے کبھی کبھی لڑائی کا اکھاڑہ بھی بن جاتے تھے مشہور و معروف ڈاکو اپنے حریفوں کے ساتھ طاقت آزمائی کے لیے میلوں میں آتے، ایک شراب کے نشے میں لاٹھی بلند کر کے پکارتا کہ فلاں کہاں ہے؟ دوسری طرف سے اس کے چیلنج کا جواب ملتا پھر دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے، لاٹھیاں آپس میں ٹکراتیں، سر پھٹتے، دکانداروں کی چھابڑیاں الٹ جاتیں کمزور آدمی پیروں کے نیچے مسلے جاتے ایک گروہ اپنے لیڈر سمیت بھاگ نکلتا دوسرا اس کا پیچھا کرتا۔ پھر جب معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا تو پولیس پہنچ جاتی اور چند آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگ جاتیں۔

لیکن جب سے افضل اور شیر سنگھ نے میلوں میں آنا شروع کیا تھا اس قسم کی وارداتیں بہت کم ہو گئی تھیں وہ لڑنے والوں کے بیچ میں کود پڑتے لیکن جب مصالحانہ کوششیں کامیاب نہ ہوتیں تو وہ لاٹھیاں اٹھا لیتے اور وہ نوجوان جو کشتی لڑنے یا کبڈی کھیلنے کی نیت سے میلے میں آتے تھے ان کا ساتھ دیتے۔

افضل اور شیر سنگھ کے خاندانوں میں تین پشتوں سے دشمنی چلی آتی تھی لیکن ان دونوجوانوں کی دوستی نے ان کے خاندانوں کی پرانی رنجشیں مٹا دیں۔

ان کی دوستی کی ابتدا بھی عجیب تھی:

☆☆☆☆☆

گاؤں میں مشہور تھا کہ افضل کی گھوڑے علاقے کی تمام گھوڑیوں سے تیز بھاگتی ہے شیر سنگھ کے پاس معمولی گھوڑی تھی ایک دن شیر سنگھ اپنے بھائیوں اور باپ کے ساتھ کھیت میں چارا کاٹ رہا تھا کہ افضل اپنی گھوڑی بھگاتا ہوا قریب سے گزرا۔ شیر سنگھ اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر گھوڑی کی طرف دیکھتا رہا اس کے بھائی بھی کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

شیر سنگھ کے باپ اندر سنگھ نے کہا ''کیا دیکھتے ہو شیر سنگھ! تم نے گھوڑی کبھی نہیں دیکھی؟''

شیر سنگھ نے کہا ''باپو! یہ گھوڑی بڑی اچھی ہے''

اندر سنگھ نے کہا ''افضل کو اس گھوڑی پر بڑا گھمنڈ ہے اس نے تمہیں دکھانے کے لیے گھوڑی کو تیز کیا تھا''

شیر سنگھ نے کہا ''باپو ایک دن میں اپنے گھوڑے پر شہر کی طرف جا رہا تھا افضل میرے پاس سے گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ وہ میری طرف مڑ مڑ کر دیکھتا اور ہنستا تھا۔''

اندر سنگھ درانتی زمین پر پھینک کر کھڑا ہو گیا اور پھر اپنی چادر اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے بولا ''شیر سنگھ افضل کا بھائی اگر تحصیل دار ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میں تمہیں ایسی دس گھوڑیاں خرید کر دے سکتا ہوں۔ میں آج ہی رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔''

چوتھے دن اندر سنگھ اپنے بیٹے کے لیے ایک نئی گھوڑی خرید کر لے آیا۔

گاؤں میں پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ اندر سنگھ نئی گھوڑی خریدنے کے لیے گیا ہے اور اس کا بیٹا اسے افضل کی گھوڑی کے ساتھ بھگائے گا۔ چنانچہ گاؤں سے باہر کھیتوں میں ان دو گھوڑیوں کا مقابلہ ہوا۔ شیر سنگھ کا باپ اور اس کے بھائی بڑی امیدوں کے ساتھ مقابلہ دیکھنے کے لیے آئے تھے گاؤں کے جہاندیدہ لوگوں اور خاص کر چودھری رمضان نے شیر سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ تمہاری گھوڑی عربی نسل کی ہے اور مقابلے میں افضل کی گھوڑی سے آگے نکل جائے گی لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو شیر سنگھ کی گھوڑی نے لوگوں کا شوروغوغا سن کر آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پاؤں پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ شیر سنگھ نے اسے چھڑی ماری تو وہ تیخ پا ہوگئی۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے شیر سنگھ نے اور دو تین چھڑیاں رسید کیں اور گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر ہوائی دولتیاں چلانی شروع کر دیں۔

اتنی دیر میں افضل کوئی آدھ میل کا چکر لگا کر واپس آ چکا تھا۔ اس نے کہا ''بات یہ ہے کہ لوگوں کا شور سن کر شیر سنگھ کی گھوڑی گھبرا گئی ہے۔''

چودھری رمضان اپنا حقہ اٹھائے آگے بڑھا اور بولا ''افضل ٹھیک کہتا ہے تم لوگ شور مچاتے ہو ورنہ یہ گھوڑی خالص عربی نسل کی ہے شیر سنگھ ذرا اسے تھپکی دے کر ٹھنڈا کرو۔ افضل تم بھی اپنی گھوڑی کو دم لینے دو پھر مقابلہ ہوگا۔''

افضل اپنی گھوڑی سے اتر کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور چودھری رمضان اسی طرح حقہ ہاتھ میں لیے شیر سنگھ کو ہدایات دے رہا تھا وہ کہہ رہا تھا ''دیکھو شیر سنگھ! بھگاتے وقت اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینا چھڑی اس وقت تک نہ مارنا جب تک یہ

بھاگنا نہ شروع کر دے۔اب اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہو۔عربی نسل کے جانور میں غصہ زیادہ ہوتا ہے۔''

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر گھوڑی کو چمکارتے ہوئے اس کی پشت پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی حقے کی چلم کا ڈھکنا اور ایک چھوٹا سا چمٹا جو لوہے کی باریک زنجیر کے ساتھ چلم سے بندھے ہوئے تھے، آپس میں ٹکرا کر کوئی ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جو شاید اس ناتجربہ کار جانور کے لیے بارگوش ثابت ہو رہی تھی جونہی چودھری رمضان نے گھوڑی کی پشت کی طرف ہاتھ بڑھایا، گھوڑی نے پچھلی ٹانگیں اٹھا کر چلم کے ڈھکنے اور چمٹے کی آواز کا خیر مقدم کیا۔چودھری رمضان بال بال بچ گیا لیکن حقہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چند قدم دور جا پڑا۔چودھری رمضان انتہائی بدحواسی کی حالت میں لوگوں کے قہقہے سن رہا تھا۔

افضل کے بڑے بھائی اسماعیل نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر کہا'' کیوں چودھری رمضان! گھوڑی عربی ہے نا؟''

شیر سنگھ کے باپ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اس نے غصے سے کانپتے ہوئے بھاگ کر یکے بعد دیگرے دو تین لاٹھیاں گھوڑی کی ٹانگوں پر رسید کر دیں اور گھوڑی اچھلنے،کودنے اور تیخ پا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلی۔افضل جلدی سے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس کے پیچھے ہو لیا لیکن کوئی تین سو گز بھاگنے کے بعد شیر سنگھ کی گھوڑی اچانک کھڑی ہوگئی اور جب افضل کی گھوڑی قریب پہنچی تو اس نے اس کی طرف دولتیاں اٹھا لیں۔افضل نے اپنی گھوڑی کو ایک طرف ہٹا لیا لیکن شیر سنگھ کی

گھوڑی اندھا دھند فضا میں دولتیاں چلاتی رہی۔ اندر سنگھ پھر غضب ناک ہو کر آگے بڑھا لیکن اسماعیل نے بھاگ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا ''چچا جانے دو تمہاری گھوڑی الھڑ ہے، افضل اسے ٹھیک کر دیگا''

اندر سنگھ نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا ''اگر افضل گھوڑے کی سواری جانتا ہے تو میرے بیٹے نے گدھے پر سواری نہیں کی میں اسے دوسری گھوڑی لا کر دوں گا۔۔۔۔ پھر دیکھوں گا شیر سنگھ سے کون جیتتا ہے؟''

اسماعیل نے کہا ''لیکن عربی گھوڑا نہ لے کر آنا چاچا!''

اندر سنگھ نے اگلے دن اپنا ایک کھیت گروی رکھا اور اس گھوڑی کو بیچنے اور نئی گھوڑی کو خریدنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

پندرہ دن کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے نیچے بادامی رنگ کا ایک خوبصورت گھوڑا تھا جس کے عوض اس نے اپنی گھوڑی اور تین سو روپے نقد دیے تھے گاؤں میں پہنچتے ہی اس نے چودھری رمضان کو چودھری رحمت علی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ چار دن کے بعد دوڑ ہو گی، اگر ہمت ہے تو اپنی گھوڑی شرط بد کر دوڑا لو۔

چوتھے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لیے اس گاؤں کے علاوہ دوسرے دیہات کے بہت سے لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے اندر سنگھ نے کہا ''چودھری رحمت علی! خالی گھوڑے دوڑانے سے کیا فائدہ، کوئی شرط لگاؤ!''

رحمت علی نے جواب دیا ''اب ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے ہیں اندر سنگھ!

شرط لگانا عقل کی بات نہیں''

''بس چودھری گھبرا گئے؟''

اسماعیل نے کہا ''اگر شرط کا شوق ہے تو شیر سنگھ سے کہو افضل کے ساتھ شرط باندھ لے۔''

اندر سنگھ نے کہا ''شیر سنگھ! لگاؤ افضل کے ساتھ پگڑی پگڑی کی شرط!''

افضل نے کہا ''تم گھاٹے میں رہو گے میں شیر سنگھ کی پگڑی کے عوض اپنی گھوڑی کی شرط لگاتا ہوں۔''

اندر سنگھ نے کہا ''اگر ہار گئے تو؟''

افضل سنگھ نے کہا ''اگر ہار گیا تو گھوڑی تمہاری''

اندر سنگھ نے کہا ''اپنے باپ سے پوچھ لو''

رحمت علی نے کہا ''مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، یہ گھوڑی افضل کی ہے، اسے اس کے بھائی نے لے کر دی ہے۔ ہار جائے گا تو اور لے دے گا۔''

گھوڑ دوڑ شروع ہوئی سواروں نے ایک میل کے فاصلے پر پیپل کے درخت کے اوپر سے چکر کاٹ کر آنا تھا۔ دوسری طرف گاؤں کے چند عمر رسیدہ آدمی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ درخت تک پہنچنے میں شیر سنگھ کا گھوڑا آگے رہا لیکن واپسی پر افضل اس سے آملا۔ چودھری رمضان پہلے کی طرح اب بھی یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا ہری سنگھ لوہار اور کاکو عیسائی نے بھی اپنی اپنی پگڑی کی شرط لگائی تھی کاکو عیسائی نے دعویٰ کیا تھا کہ افضل کی گھوڑی جیتے گی اور ہری سنگھ لوہار نے دعویٰ کیا تھا

کہ شیر سنگھ کا گھوڑا جیتے گا۔

درخت کی طرف جاتے ہوئے جب شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو ہری سنگھ لوہار چلایا ''او کاکو کے بچے لاؤ پگڑی'' کاکو نے چپکے سے اپنی پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی لیکن جب واپسی پر دونوں برابر ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد افضل کی گھوڑی آگے نکلنے لگی تو کاکو نے کہا ''او ہری سنگھ جلدی کر، اپنی پگڑی اتار!''

ہری سنگھ نے کہا ''ارے ابھی وہ پانچ چھ کھیت دور ہیں شیر سنگھ ضرور آگے نکلے گا۔''

''تو نے دوڑ ختم ہونے کا انتظار کرنے سے پہلے میری پگڑی اتروالی تھی، اب اتار اپنی پگڑی ورنہ میں خود اتار لوں گا!''

کاکو نے ہری سنگھ کے جواب کا انتظار نہ کیا اس نے ایک ہاتھ سے اپنی پگڑی چھینتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ہری سنگھ کی پگڑی اتار لی ایسے معاملات میں ہری سنگھ کو کاکو کی جسمانی طاقت لالحاظ کرنا پڑتا تھا۔

دوڑ ختم کرنے سے پہلے افضل شیر سنگھ سے ایک کھیت آگے نکل چکا تھا۔ اندر سنگھ غصے اور ندامت کی حالت میں اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ شیر سنگھ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے افضل کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور اپنی پگڑی اتارنے کے لیے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن افضل نے کہا ''شیر سنگھ اپنی پگڑی اپنے سر پر رہنے دو کسی کی پگڑی اتروانا بہادروں کا کام نہیں۔''

چودھری رحمت علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے بیٹا! اپنی پگڑی نہ

اتارو تمہارے باپ نے مجبور کیا تھا ورنہ شرط لگانا عقل مندوں کا کام نہیں۔“

لیکن شیر سنگھ نے اپنی پگڑی اتار کر افضل کی طرف پھینک دی اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

اسماعیل نے آگے بڑھ کر چودھری رمضان کی چلم اتاری اور اسے اطمینان سے زمین پر رکھ کر لاٹھی اٹھاتے ہوئے کہا ”چودھری رمضان! میں نے اپنے دل میں ایک شرط لگائی تھی اور وہ یہ کہ اگر شیر سنگھ کا گھوڑا آگے نکل گیا تو میں تمہارا حقہ توڑ ڈالوں گا اور اگر ہماری گھوڑی آگے نکل گئی تو صرف تمہارے حقے کی چلم توڑ دوں گا خدا کا شکر کرو کہ تم بڑے نقصان سے بچ گئے ہو۔“

رمضان چلایا ”ارے ایسا نہ کرنا میں کل ہی لایا تھا“

اس نے آگے بڑھ کر چلم چھیننے کی کوشش کی لیکن اسماعیل کی لاٹھی اپنا کام کر چکی تھی۔ ہری سنگھ لوہار کے لیے اس گھوڑ دوڑ کا نتیجہ کچھ کم پریشانی کا باعث نہ تھا۔ کاکو عیسائی اپنے سر پر اس کی پگڑی باندھ کر لوگوں کو دکھا رہا تھا۔ مردوں کی تو خیر اور بات تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ معاملہ گاؤں کی عورتوں تک پہنچنے والا تھا۔ ہری سنگھ کو اس بات میں ذرہ بھر شبہ نہ تھا کہ کاکو لڑکوں کا جلوس اپنے پیچھے لگا کر سارے گاؤں میں پھرے گا وہ اپنی زندگی کے اس دن کو بہت منحوس سمجھتا تھا جب اس نے کاکو کے ساتھ مذاق شروع کیا تھا۔ کاکو نے اسے بار بار نیچا دکھایا تھا ایک دفعہ اس نے تنگ آ کر اپنے کتے کا نام کاکو رکھ دیا تھا جب کاکو اس کی بھٹی کے سامنے سے گزرتا تو وہ اپنے کتے کو آواز دیتا ”کاکو! کاکو! کاکو! توے توے توے“

ہری سنگھ کے باپ کا نام سنتو تھا اور کاکو نے ایک بھینسا پال رکھا تھا، اس نے چند دن کے غور و فکر کے بعد اس بھینسے کا نام سنتو رکھ دیا جب کبھی ہری سنگھ اس کے پاس سے گزرتا تو وہ فوراً اٹھ کر اپنے بھینسے کو ڈنڈے مارتے ہوئے کہتا ''او سنتو تو مر جائیں تینوں بوچڑ لے جان او سنتو۔۔۔'' اور وہ سنتو کو ایسی گالیاں دیتا جو ہری سنگھ کے لیے ناقابل برداشت ہوتیں۔ ہری سنگھ نے اس کے گھر کے قریب سے گزرنا ترک کر دیا لیکن کاکو اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا وہ دن میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی بہانے اپنے بھینسے کا رسا پکڑ کر اس کی بھٹی کے سامنے سے گزرتا اور اسے سنتو کے نام سے نئی نئی گالیاں دیتا۔

گاؤں کے لڑکے اس کے گرد جمع ہو کر پوچھتے ''کاکو! سنتو کو آج کہاں لے جا رہے ہو؟''

اور وہ جواب دیتا ''بوچڑ خانے لے جا رہا ہوں'' ہری سنگھ دانت پیس کر رہ جاتا۔

بالآخر ہری سنگھ نے کتے کو گھر سے نکال دیا اور کاکو نے اپنے بھینسے کا نام تبدیل کر لیا۔

☆☆☆☆☆

گھوڑ دوڑ سے چند روز بعد ایک دن ہری سنگھ ہل کی پھالی بنا رہا تھا۔ شیر سنگھ اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا افضل آیا اور اس نے کہا ''ہری سنگھ! کل میں نے اپنی گھوڑی کی

زنجیر کی چابی اس کے قفل میں ہی رہنے دی۔۔۔۔شاید کسی بچے نے گم کر دی ہے۔میں تمھیں زنجیر لا دیتا ہوں، اس کے لیے نئی چابی بنا دو"

"اچھا بنا دیتا ہوں لیکن چابی کا خیال رکھا کرو کسی برے آدمی کے ہاتھ لگ گئی تو کہیں گھوڑی نہ لے اڑے پرسوں سردار چرن سنگھ کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔اس کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی لیکن چور نے چابی لگا کر کھول لی۔"

افضل نے کہا"اس زنجیر کے تالے بھی کچھ اچھے نہیں میرا خیال ہے کہ کسی دن شہر جا کر کوئی مضبوط سی زنجیر لے آؤں لیکن ابھی تم اس کی چابی بنا دو"

افضل چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد کالو وہاں سے گزرا، اس کے سر پر وہی پگڑی تھی جو اس نے ہری سنگھ سے شرط میں جیتی تھی۔

ہری سنگھ نے شیر سنگھ سے کہا"میں نے سنا ہے کہ افضل نے تمھاری پگڑی تمھارے گھر بھیج دی ہے لیکن یہ کالو بڑا بدمعاش ہے یہ روز میری پگڑی دکھانے کے لیے ادھر سے گزرتا ہے۔"

شیر سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا"ہری سنگھ اگر تم بیس روپے کمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ ایک سودا کر لو"

بیس روپے کا نام سن کر ہری سنگھ کا ہتھوڑا رک گیا۔اس نے کچھ سوچ کر کہا"اگر تم میری گائے خریدنا چاہتے ہو تو میں تیس سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گا۔"

شیر سنگھ نے کہا"نہیں بیس روپے میں تمھیں ایسی چیز کے دوں گا جس کی قیمت دو پیسے سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

’’تم مذاق کرتے ہو؟‘‘

’’میں مذاق نہیں کرتا‘‘

’’اچھا بتاؤ کیا چیز ہے وہ؟‘‘

’’پہلے قسم کھاؤ تم کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گے!‘‘

’’میں باپو کی قسم کھاتا ہوں‘‘

’’نہیں گوروگرنتھ کی قسم کھاؤ!‘‘

ہری سنگھ نے دو پیسے کی چیز بیس روپے کے عوض فروخت کرنے کے لالچ میں قسم کھالی، تو شیر سنگھ نے کہا ’’افضل کی گھوڑی کی زنجیر کی ایک چابی مجھے بنادو۔‘‘

ہری سنگھ تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آگیا اس نے کہا ’’تم۔۔۔۔؟‘‘

’’ہاں! میں اس گھوڑی کو دریا کے پار پہنچانا چاہتا ہوں‘‘

ہری سنگھ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ’’لیکن اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ پھنس جاؤں گا‘‘

شیر سنگھ نے کہا ’’میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا‘‘

ہری سنگھ نے کہا ’’چوری پاپ ہے‘‘

’’تمہیں اس سے کیا تم مجھے چابی بنادو‘‘

ہری سنگھ نے کسی طرح اپنے ضمیر کی رضامندی حاصل کر لی تاہم اس نے کہا ’’جب تم گھوڑی لے کر کہیں جاؤ گے تو تمہیں گاؤں میں نہ پا کر وہ تم پر شک کریں گے‘‘

’’تم فکر نہ کرو میرا کام گھوڑی کو ان کی حویلی سے باہر نکالنا ہو گا۔ اسے لیجانے

والے یہاں موجود ہوں گے۔''

''اچھا تم جاؤ۔افضل تمہیں میرے پاس بیٹھا دیکھ کر شک کرے گا میں پھالی کے ساتھ چابی بھی تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔''

''لیکن چابی صرف مجھے دینا میرے باپو کو بھی نہ بتانا''

''اور پیسے کب ملیں گے؟''

شیر سنگھ نے اٹھتے ہوئے جواب دیا''جس دن گھوڑی نکل جائے گی۔''

☆☆☆☆☆

رات کے دو بجے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی شیر سنگھ بیرونی دیوار پھاند کر حویلی کے اندر داخل ہوا اس نے دبے پاؤں پھاٹک کی طرف چلتے ہوئے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور کنڈی ٹٹولنے لگا وہ ابھی تاریکی میں ہاتھ مار رہا تھا کہ بجلی چمکی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کنڈی میں تالا نہیں تھا۔

دو دن پہلے بھی اس نے قسمت آزمائی کی تھی لیکن پھاٹک کے اندر کی طرف کنڈی میں تالا لگا ہوا تھا اور اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا آج ہری سنگھ لوہار اور رام سنگھ ڈاکو نے اسے پندرہ بیس چابیاں مہیا کر دی تھیں۔لیکن کنڈی کا تالا غائب تھا اس نے سوچا شاید گھر کے آدمی تالا لگانا بھول گئے ہوں اور ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کنڈی کھول دی لیکن دروازے کو اسی طرح بند رہنے دیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا مویشی خانے میں داخل ہوا بجلی کی چمک میں وہ حویلی کے دوسرے سرے پر

برآمدے میں سونے والے آدمیوں کی چارپائیاں دیکھ چکا تھا لیکن بارش کی تیزی کے باعث اسے اطمینان تھا کہ وہاں اگر کوئی جاگ بھی رہا ہو تو صحن کے دوسرے سرے پر معمولی آہٹ اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی تاہم اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

کچھ دیر تذبذب کی حالت میں مویشی خانے کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہا۔اس نے اپنی لاٹھی دروازے کے ساتھ لگا کر رکھ دی، جیب میں ہاتھ ڈال کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کی چابی نکالی اور چابیوں کا بڑا گچھا وہیں ڈال دیا۔

بجلی کی ایک اور چمک کے بعد وہ اپنے گردوپیش کا جائزہ لے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔کھونٹے سے گھوڑی کی گردن کا رسا کھولنے کے بعد وہ بیٹھ کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر کھولنے لگا اندھیرے میں اس نے انگلیوں سے ٹٹول کر تالے کا سوراخ تلاش کیا۔اس کے دل کی دھڑکن لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے بارش کے باعث موسم میں کافی حد تک اعتدال آچکا تھا تاہم اسے پسینہ آ رہا تھا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک طرف کا تالا کھولا۔گھوڑی کے دوسرے پاؤں تک ہاتھ لے جانے کے لیے وہ دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر آگے بڑھا وہ دوسرے تالے کا سوراخ ٹٹول رہا تھا کہ گھوڑی نے اچانک گردن ہلائی اور ایک سم زمین پر مارتے ہوئے نتھنوں سے ''کھر رکھر ر'' کی آواز نکالنے لگی۔

شیر سنگھ نے گھوڑی کے گلے کا رسہ اپنی بغل میں لے لیا اور اسے چمکارنے اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے کے بعد پھر اسی طرح بیٹھ کر تالا کھولنے میں مصروف ہو

گیا وہ چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھمار رہا تھا کہ اسے اپنے قریب ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی چادر کا ایک کونہ گھوڑی کے پاؤں کے نیچے آچکا تھا۔ اس نے گھوڑی کو پیچھے ہٹا کر اس کے سم کے نیچے سے اپنی چادر نکالنے کی کوشش کی لیکن کسی کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے بازو پر شیر سنگھ کے بدن میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا ایک ثانیہ کے بعد اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس آہنی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں پہلا خیال جو اس کے دماغ میں آیا، یہ تھا کہ حملہ آور افضل کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ حملہ آور نے اچانک اس کی گردن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی اور مروڑ کر اس کی پیٹھ کے ساتھ لگا دی۔ شیر سنگھ نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ذرا اور زور دیا تو اس کا بازو ٹوٹ کر اس کے کندھے سے الگ ہو جائے گا پکڑنے والے نے اپنی جسمانی برتری کا ایک ثبوت دینے کے لیے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اچانک اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اوپر اٹھایا اور اچھال کر کھرلی میں پھینک دیا اور پیشتر اس کے کہ شیر سنگھ اٹھ کر بیٹھتا۔ حملہ آور اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔

''میں تمہارا دو راتوں سے انتظار کر رہا تھا، تم اب نہیں جا سکتے!'' یہ افضل کی آواز تھی جس میں غصے یا اضطراب سے کہیں زیادہ خود اعتمادی تھی وہ خود اعتمادی جس کی بدولت مرد شیر کے گلے میں دستا ڈال دیتے ہیں۔

شیر سنگھ کو پہلی بار بزرگوں کے اس قول کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ چور کے

پہلو میں دل نہیں ہوتا۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر افضل کے سامنے اس کی حیثیت ایک چور کی نہ ہوتی تو وہ اس قدر بودا ثابت نہ ہوتا۔وہ اپنی قوت مدافعت کو اس حویلی کی چار دیواری سے باہر چھوڑ آیا تھا۔اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر افضل دوراتوں سے اس کا انتظام کر رہا تھا تو اس کے تمام انتظامات مکمل ہوں گے اس لیے جدوجہد فضول ہے اور افضل جیسے اس کے دل کی آواز سن رہا تھا وہ بولا''اگر بھاگنے کی کوشش کروگے تو تم دیکھو گے کہ میرے ہاتھ بہت بے رحم ہیں لیکن تم میں تھوڑی بہت سمجھ ضرور ہوگی اچھا بتاؤ تم ہو کون؟''

شیر سنگھ خاموش رہا افضل نے اس کی پگڑی اتار کر اس کی ٹانگیں باندھ دیں اور پھر اسے الٹا کر کے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اس کام سے فارغ ہو کر وہ گھوڑی کی طرف متوجہ ہوا۔اس نے جھک کر گھوڑی کے پاؤں کی زنجیر ٹٹولی اور بولا''اوہو!تم تو اپنا کام ختم کر چکے تھے خیر اب یہ زنجیر تمہارے کام آئیگی۔''

افضل نے زنجیر اٹھا کر اس کے پاؤں میں ڈال دی اور اسے کھرلی میں سیدھا لٹاتے ہوئے کہا''دیکھو میں شور مچا کر گھر کے آدمیوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا اب سیدھی طرح میری باتوں کا جواب دو تم کس گاؤں سے آئے ہو اور تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟''

شیر سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔

افضل نے پھر کہا''میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم اکیلے یہاں تک نہیں پہنچے ہمارے گاؤں سے کوئی تمہیں راستہ دکھانے والا ضرور ہے میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں لیکن

اپنے گاؤں کے بدمعاش کو نہیں چھوڑوں گا اگر وہ کسی جگہ باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے تو مجھے بتاؤ!‘‘

شیر سنگھ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

باہر بجلی چمکی دروازے کے راستے آنے والی روشنی میں افضل کو شیر سنگھ کے چہرے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور وہ چلا اٹھا ’’شیر سنگھ!‘‘

چور اس پر بھی خاموش رہا افضل بھاگتا ہوا باہر نکلا تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی چند لمحے وہ خاموشی کی حالت میں شیر سنگھ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے لالٹین دیوار کے ساتھ لٹکا دی اور کھرلی پر ایک پاؤں رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا شیر سنگھ بدترین سزا کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن افضل کی خاموشی اس کے لیے صبر آزما تھی بالآخر افضل بولا ’’تو پرسوں بھی تم ہی نے ہماری دیوار پھاندی تھی، اگر میں دیوار پر اکھڑی ہوئی مٹی اور نیچے دونوں طرف پاؤں کے نشان نہ دیکھتا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔ اس دن شاید تم پھاٹک کی کنڈی میں تالا دیکھ کر واپس چلے گئے تھے میں نے کل رات تالا اتار لیا تھا۔ لیکن کل تم نہ آئے میں سمجھ گیا تھا چور ایک رات جاگنے کے بعد اگلی رات کو آرام کرتا ہے مجھے یقین تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔۔۔ لیکن مجھے تم پر رحم آتا ہے گھوڑ دوڑ میں ہار جانا اس قدر شرمناک بات نہ تھی کہ تم چوری پر اتر آتے تمہاری صورت چوروں جیسی نہیں اگر آج تم چوری کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو کل کسی کے گھر ڈاکہ ڈالتے، اس کے بعد کسی کو قتل کرتے اور کسی دن دنیا تمہیں پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھتی شیر سنگھ تمہارا باپ ہمارا

دشمن ہے لیکن وہ بہادر ہے اور ایک بہادر آدمی یہ سننا پسند نہیں کرے گا کہ اس کا بیٹا چور ہے۔''

الفاظ کے یہ میٹھے مگر جگر دوز نشتر شیر سنگھ کے لیے نا قابل برداشت تھے اس نے کہا ''افضل! اب باتوں سے اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالو۔ دروازے کے پاس میری لاٹھی پڑی ہوئی ہے وہ اٹھا لو اب اگر تم مجھے مار بھی ڈالو تو پولیس والے تمہیں نہیں پکڑیں گے میں تمہارا چور ہوں اگر تم میں لاٹھی اٹھانے کی ہمت نہیں تو اپنے آدمیوں کو بلاؤ تمہاری آواز سن کر گاؤں جمع ہو جائے گا اور اگر میرا باپو مجھے اس حال میں دیکھ لے تو وہ بھی یہی کہے گا کہ اس نے میرے منہ پر سیاہی ملی ہے، اسے مار ڈالو''

افضل نے کہا ''آہستہ بات کرو سامنے برآمدے میں میرے بھائی اور نوکر سو رہے ہیں۔''

''تو تم مجھے ترسا ترسا کر مارنا چاہتے ہو اگر تم انہیں نہیں بلاؤ گے تو میں انہیں آواز دوں گا۔''

افضل نے کہا ''شیر سنگھ تم میرے ہاتھ دیکھ چکے ہو میں آسانی سے تمہارا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ میری مرضی کے بغیر تمہاری آواز تمہارے ہونٹوں سے باہر نہیں آ سکتی۔''

افضل نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ شیر سنگھ نے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی۔

دونوں تھوڑی دیر خاموشی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

افضل اچانک تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گھوڑی کی زین اور لگام تھی۔ اس نے اطمینان سے گھوڑی کی پیٹھ پر زین رکھ کر اسے لگام دی اور پھر زین کستے ہوئے بولا ''شیر سنگھ! تم نے کسی آدمی کو پھانسی پر لٹکتے ہوئے نہیں دیکھا میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن بھائی کے ساتھ جا کر دلاور علی ڈاکو کی لاش دیکھی تھی۔ پھانسی کے بعد اس کی زبان منہ سے بالشت بھر باہر آ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی باہر آ چکی تھیں، اور اس کی گردن! توبہ میری توبہ! میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں ڈرا لیکن اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا کہتے ہیں کہ وہ پہلے چوری کرنے کے جرم میں ایک سال کے لیے قید ہوا تھا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ ڈاکو بن گیا۔ پھر اسے سات سال کی سزا ہوئی دوسری بار رہا ہونے کے بعد اس کا دل بڑھ چکا تھا اور اس نے تین آدمیوں کو قتل کر دیا پھر اسے پھانسی کی سزا ہوئی''۔ افضل زین کسنے کے بعد گھوڑی کا رسا کھول کر اس کی گردن کے ساتھ لپیٹ رہا تھا۔

شیر سنگھ نے کہا ''تم تھانے جا رہے ہو؟''

افضل نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا ''نہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ دلاور علی کی طرح تمہاری گردن بھی کسی دن پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے میں نے اس کی ماں اور بیوی کو روتے دیکھا تھا میں نہیں چاہتا کہ میں تمہارے ماں باپ کو بھی اسی طرح روتا ہوا دیکھوں۔ میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں تمہارے دونوں بازو توڑ ڈالوں، تاکہ تم پھر کسی کی دیوار نہ پھاند سکو۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ اگلے مہینے تمہاری شادی ہونے والی ہے، شیر سنگھ! اگر میں تمہیں آج چھوڑ دوں تو پھر بھی تم چوری کرو

گے؟''

شیر سنگھ کی خاموشی پر افضل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا ٹھہرو!'' یہ کہتے ہوئے افضل نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیر اور پگڑی کی گرفت سے آزاد کر دیے شیر سنگھ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا افضل نے کہا ''اٹھو!''

وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

افضل نے پھر کہا ''تم اس گھوڑی کے لیے آئے تھے، یہ اب تمہاری ہے اب تم اس پر سوار ہو کر جاؤ گے لیکن اس شرط پر کہ یہ گھوڑی تم اپنے پاس رکھو گے، کسی ڈاکو کے حوالے نہیں کرو گے۔''

شیر سنگھ کو یقین تھا کہ اب اچانک افضل ایک قہقہہ لگائے گا اور اس کی چھاتی پر چڑھ جائے گا۔

افضل نے کہا ''تم سوچ رہے ہو کہ جب تم باہر نکلو گے تو میرے آدمی تم پر ڈٹ پڑیں گے۔۔۔تم شاید یہ بھی سوچتے ہو گے کہ ابا کی اجازت کے بغیر میں تمہیں یہ گھوڑی نہیں دے سکتا تم بہت بے وقوف ہو، شیر سنگھ یہ گھوڑی میری ہے اور میں تم جیسے نوجوان کو پھانسی سے بچانے کے لیے یہ گھوڑی دے سکتا ہوں میں کہوں گا کہ میں نے اسے تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اپنی پگڑی باندھو اور میرے ساتھ آؤ صبح ہونے والی ہے جلدی کرو!''

شیر سنگھ جلدی سے پگڑی اپنے سر پر لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ افضل نے ایک ہاتھ

سے گھوڑی کی باگ پکڑلی اور دوسرے ہاتھ سے شیر سنگھ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آیا بارش کا زور اسی طرح تھا اور صحن پانی سے بھرا ہوا تھا پھاٹک کے قریب پہنچ کر افضل نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور کہا ''دروازہ کھولو!''

شیر سنگھ نے قدرے تذبذب کے بعد دروازہ کھول دیا

پھاٹک سے باہر نکل کر افضل نے گھوڑی کی باگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو اب سوار ہو جاؤ!''

بجلی چمکی، شیر سنگھ نے افضل کا چہرہ دیکھا مسکراتا ہوا دلفریب چہرہ، اس کے توہمات مٹ چکے تھے ''افضل سچ مچ؟''

شیر سنگھ کی آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔۔۔۔۔وہ افضل کے پاؤں پر گر پڑا۔وہ سسکیاں لے رہا تھا وہ رو رہا تھا ایک بچے کی طرح ''افضل! افضل! مجھے معاف کر دو نہیں نہیں، مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو!''

افضل نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ''میں تمہیں معاف کر چکا ہوں شیر سنگھ اور اسکے ثبوت میں میں تمہیں یہ گھوڑی دے رہا ہوں۔''

''بھگوان کے لیے اس گھوڑی کا نام نہ لو اس سے پہلے میں انسان نہیں تھا لیکن حیوان بھی نہیں ہوں مجھے اس بدمعاش نے ورغلایا تھا وہ روز میرے پاس آتا تھا۔''

افضل نے پوچھا ''کون ہے وہ؟''

''امر سنگھ ڈاکو''

''کہاں ہے وہ؟''

''وہ ہماری حویلی کے دروازے پر میرا انتظار کر رہا ہوگا''

افضل نے کہا ''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں''

''نہیں، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے!'' یہ کہہ کر شیر سنگھ افضل کے جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگ گیا۔

☆☆☆☆☆

افضل نے گھوڑی کو پھر اصطبل میں باندھ دیا اور پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گیا صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی وہ اونگھ رہا تھا کہ گاؤں کے دوسرے سرے پر لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور حویلی سے باہر نکل آیا اب بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جب افضل شیر سنگھ کی حویلی کے قریب پہنچا تو اسے چودھری رمضان واپس آتا ہوا ملا۔

افضل نے سوال کیا ''کیا ہوا چودھری؟''

''حد ہوگئی'' رمضان نے جواب دیا

''کیا ہوا آخر؟''

''چودھری افضل! اندر سنگھ کے لڑکے نے حد کر دی''

''ارے بتاؤ بھی؟''

''تم نے پار والے امر سنگھ ڈاکو کا نام سنا ہے؟''

''ہاں کیا ہوا اسے؟''

''شیر سنگھ نے اس کے دونوں بازو توڑ دیے ہیں''

''سچ!''

''خدا کی قسم! شیر سنگھ سورما ہے پتہ ہے اس نے امر سنگھ کے بازو کس طرح توڑے ہیں؟''

''کس طرح توڑے ہیں؟''

''مروڑ کر لوگوں نے بڑی مشکل سے اس کی جان چھڑائی ہے یہ بہت اچھا ہوا اس نے کچھ دنوں سے اندر سنگھ کے گھر میں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی واردات ضرور ہوگی لیکن اب وہ اس گاؤں کا رخ نہیں کرے گا۔''

رمضان اور افضل باتیں کر رہے تھے کہ شیر سنگھ کی حویلی میں پھر شور سنائی دیا۔

افضل نے کہا ''اب کیا ہو رہا ہے؟''

رمضان نے جواب دیا ''اب لوگ یونہی شور مچا رہے ہیں امر سنگھ تو بازو تڑوا کر جا چکا ہے۔''

''نہیں، شاید کسی کو مار پڑ رہی ہے''

رمضان نے کہا ''نہیں وہ ہنس رہے ہیں چلو مجھے تو بارش میں سردی لگ رہی ہے''

افضل اور رمضان وہاں سے کھسکنے کو تھے کہ کاکو عیسائی بھاگتا ہوا آیا وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا ہے کاکو؟'' افضل نے سوال کیا

اس نے جواب دیا ''چودھری جی آج مزا آ گیا سالا ہری سنگھ بھی کیا یاد کرے گا''

''آخر کیا ہوا؟''

''شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر گن کے بیس جوتے مارے ہیں''

''ارے وہ کیوں؟''

''پتہ نہیں اس کی قسمت ہی ایسی ہے لوگ اس کی حویلی میں جمع ہو رہے تھے وہ بھی معتبری دکھانے کے لیے وہاں آ گیا شیر سنگھ کو اس کی شکل دیکھتے ہی غصہ آ گیا اس نے کہا ''ہریا! آ تو تمہیں بیس روپے دوں'' یہ کہتے ہی اس نے جوتا اتار لیا اور ہری سنگھ کو بالوں سے پکڑ کر کیچڑ میں بٹھا لیا۔ اس نے بہتیرا شور مچایا۔ لوگوں نے بھی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس نے بیس جوتے لگا کر ہی چھوڑا اور خدا کی قسم بارش اور کیچڑ کی وجہ سے اس کے جوتے کا وزن دو سیر سے کم نہ تھا۔''

☆☆☆☆☆

جو کچھ افضل کی حویلی میں ہوا تھا، اس کا دو آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن شیر سنگھ کے ہاتھوں علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو کا پٹنا اور ہری سنگھ کا جوتے کھانا گاؤں کے لوگوں کے لیے معمولی واقعات نہ تھے ایسے حادثات کے بعد گاؤں کے لوگ بھگت رام کی دکان یا چودھری رحمت علی کی حویلی کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے جمع ہو کر تبصرے اور قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے کوئی درخت کے نیچے چبوترے پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور کوئی اپنی چارپائی اٹھا لاتا۔ سردیوں کے دنوں میں ایسی

محفلیں سائیں اللہ رکھا کے تکیے میں منعقد ہوتیں گاؤں کی ہر محفل اسماعیل کے بغیر نا مکمل سمجھی جاتی اگر وہ خاموش ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اسے کوئی نئی تدبیر سوجھ رہی ہے اور جب وہ اچانک گردن اٹھا کر کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ اب کسی کی شامت آنے والی ہے ادھر اس کی زبان ہلتی ادھر لوگوں کے قہقہے بلند ہونے لگتے۔ لچھمن سنگھ کو ذرا اونچا سنائی دیتا تھا وہ عام طور پر اس کے قریب بیٹھتا لیکن اس کے باوجود جب کبھی اسماعیل کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تو وہ بھی قہقہہ لگانے میں دریغ نہ کرتا۔ جب لوگ خاموش ہو جاتے تو وہ کسی سے سرگوشی کے انداز میں کہتا۔ ''کیا کہا اسماعیل نے؟'' لوگ اسے بلند آواز میں سمجھاتے اور اسے دوسرا قہقہہ لگانا پڑتا۔

اسماعیل گاؤں کے لیے ایک دائمی مسکراہٹ اور ایک مسلسل قہقہہ تھا لیکن چودھری رمضان اس سے بے حد نالاں تھے جب اسماعیل کو کوئی نہ سوجھتی تو اس کی توجہ چودھری رمضان پر مبذول ہو جاتی وہ ایسے موقعوں پر انتہائی دانشمندی سے لیتا لیکن اس کے منہ سے جو بھی بات نکلتی، اسماعیل اسے اہل محفل کے قہقہوں کا موضوع بنا دیتا۔ بارہا چودھری رمضان نے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اسماعیل کے قریب نہیں بیٹھے گا لیکن لوگوں کے قہقہے اس کے لیے صبر آزما ثابت ہوتے اور اسے اپنے ارادوں کے خلاف گھر سے نکل کر محفل میں شریک ہونا پڑتا کبھی کبھی وہ گھر میں بیٹھ کر حقے سے دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن لوگ اپنی محفل میں اس کی کمی محسوس کرتے اور کوئی نہ کوئی اسے بلانے کے لیے آ جاتا۔

آج اگر بارش کا زور نہ ہوتا تو گاؤں کے بڑے بوڑھے یقیناً بڑ کے بڑے درخت کے نیچے جمع ہو جاتے اور اسماعیل اپنے مخصوص انداز میں یہ معما حل کرتا کہ شیر سنگھ نے ہری سنگھ کے سر پر بیس جوتے کیوں مارے رمضان اور کا کو کسی نہ کسی بہانے ہری سنگھ کو اٹھا کر محفل میں لے آتے لیکن بارش جو صبح کے وقت قدرے کم ہو گئی تھی، اب پھر زوروں پر تھی گاؤں کے ایک جوہڑ کا پانی بڑ کے درخت کے نیچے مٹی کے چبوترے تک اور دوسرے جوہڑ کا پانی عیسائیوں کے گھروں تک پہنچ چکا تھا چودھری رمضان کا صحن پانی میں ڈوبا ہوا تھا اس کی حویلی کی ایک دیوار گر گئی اور اس کا ایک بھینسا نیچے دب گیا اور وہ چلا رہا تھا کہ چھمن سنگھ اور اس کے ساتھ دیوار کو پیچھے سے دھکا دے کر گرا گئے ہیں۔

لوگوں کو اپنے گھروں اور کھیتوں کی فکر تھی اس لیے وہ سب کسی جگہ جمع ہو کر تازہ واقعات پر اسماعیل کا تبصرہ نہ سن سکے۔

صرف آٹھ دس آدمی مویشیوں والی حویلی کے برآمدے میں اسماعیل کے گرد جمع ہو کر گپیں ہانک رہے تھے بارش کی رفتار کے ساتھ سیلاب کا خطرہ بڑھ رہا تھا اسماعیل حسب معمول قہقہے لگا رہا تھا آج اس کے ساتھ افضل بھی ہنس رہا تھا لیکن اس کی ہنسی کی وجہ کچھ اور تھی

چودھری رحمت علی سر پر چھتری تانے گھر کی ڈیوڑھی سے نکل کر برآمدے میں داخل ہوا اور بولا ''تم یہاں کیا کر رہے ہو اگر سیلاب کے پانی نے کھیتوں کا رخ کر لیا تو مکئی اور ماش کی فصل تباہ ہو جائے گی جاؤ دیکھو کوئی نالے کا بند ہی نہ توڑ دے!''

غلام حیدر نے کہا ''میں ابھی چکر لگا کر آیا ہوں''

چودھری رمضان شور مچاتا ہوا حویلی میں داخل ہوا صحن میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو گیا اسماعیل نے قہقہہ لگایا اور باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

چودھری رحمت علی نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا ''بہت بے شرم ہو تم، تمہیں بڑوں کا ذرا بھی لحاظ نہیں'' چودھری رمضان نے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا ''چودھری جی یہاں بیٹھے دانت نکال رہے ہیں اور اندر سنگھ اپنے محلے کے سارے آدمیوں کو لے کر نالے کا بند توڑنے جا رہا ہے میں نے ان کی باتیں سنی ہیں، وہ لڑائی کے لیے تیار ہو کر گئے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے گاؤں کے چھ سات بدمعاش بھی ہیں۔ چودھری جی اگر انہیں نہ روکا گیا تو آپ کے ساتھ میری فصل بھی برباد ہو جائے گی۔''

رحمت علی نے کہا ''اچھا اندر سنگھ شرارت سے باز نہیں آتا، پچھلے سال انہوں نے اپنی زمین کی حفاظت کے لیے بند نہیں لگایا تھا۔ اب پانی آ گیا ہے تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہماری فصل بھی برباد ہو جائے۔''

رمضان نے کہا ''ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کا بند توڑ دیا جائے تو ان کے کھیتوں کی طرف نالے کے پانی کا زور کم ہو جائے گا آج گاؤں کے تمام سکھ اس کے ساتھ ہیں اور وہ سب شراب سے بدمست ہو کر گئے ہیں ان کے پاس لاٹھیاں اور برچھیاں ہیں اور شاید پستول بھی ہو''

''ہم نے کئی بار ان کی بہادری دیکھی ہے، غلام حیدر! جاؤ نور محمد اور علی محمد کو خبر

دو۔۔۔۔۔۔اور اسماعیل تم باقی آدمیوں کو بلا لاؤ!‘‘

نور محمد اور علی محمد چودھری رحمت کے چھوٹے بھائی تھے ان کی حویلیاں اور رہائشی مکانات گاؤں سے باہر تھے نور محمد کے پانچ اور علی محمد کے تین بیٹے تھے۔

آن کی آن میں رحمت کی حویلی کے اندر پچیس آدمی جمع ہو گئے۔

چودھری رمضان ایسے معاملات میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا کرتا تھا لیکن اندر سنگھ کے محلے سے آنے والے چند اور آدمیوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ آج اندر سنگھ کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

گاؤں سے باہر برساتی نالے کے کنارے فریقین ایک دوسرے کے سامنے کدالیں، لاٹھیاں اور برچھیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ مصالحانہ گفتگو ختم ہو چکی تھی اندر سنگھ بند توڑنے پر بضد تھا۔

گاؤں کے پانچ چھ سکھوں کے سوا جو چودھری رحمت علی کی طرفداری کا اعلان کر چکے تھے، باقی سب اندر سنگھ کے ساتھ تھے پڑوس کے گاؤں کے چھ نوجوان بھی اس کے ساتھ تھے لیکن اندر سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ جسے وہ مدت سے اس دن کے لیے تیار کر رہا تھا، کہیں غائب تھا اس کے ساتھی دوسری طرف افضل کو دیکھ کر گھبراتے تھے اور وہ انہیں تسلی دے رہا تھا کہ افضل کے لیے شیر سنگھ کافی ہے، وہ آ ہی رہا ہو گا۔

چودھری رمضان نے زبانی جنگ میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن جب

فریقین جسمانی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے قراری ظاہر کرنے لگے تو ادھر ادھر دیکھ کر وہ نالے کے کنارے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

فریقین کے درمیان حد فاصل کم ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے پر پل پڑیں، اچانک شیر سنگھ جھاڑیوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور ان کے درمیان کھڑا ہو کر چلایا ''ٹھہرو! ٹھہرو!! یہ لڑائی نہیں ہوگی!''

لوگوں پر ایک لمحہ کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

شیر سنگھ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''باپو میں نے گھر میں آپ کو منع کیا تھا جب آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ان لوگوں کے آنے سے پہلے بند کی حفاظت کے لیے یہاں چلا آیا۔''

اندر سنگھ کا دوسرا لڑکا چلایا ''باپو! شیر سنگھ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

شیر سنگھ نے کہا ''کل تک میرا دماغ خراب تھا لیکن آج نہیں تم میرے دودھ کے بھائی ہو لیکن افضل میرا دھرم کا بھائی ہے جو لاٹھی افضل کی طرف اٹھے گی، میں اسے اپنے سر پر روکوں گا!''

گاؤں میں کسی نے برسوں سے شیر سنگھ اور افضل کو ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تھا، وہ حیران تھے۔

اندر سنگھ غصے سے کانپتا اور گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے شیر سنگھ کو ایک لاٹھی ماردی۔ لاٹھی شیر سنگھ کی ران پر لگی لیکن وہ چٹان کی طرح کھڑا رہا اندر سنگھ نے دوسری بار لاٹھی اٹھائی لیکن اتنی دیر میں افضل نے بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اندر سنگھ

اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔

شیر سنگھ نے کہا "افضل! یہ میرا باپ ہے، تم اس کے ہاتھ نہ پکڑو، اسے اپنا غصہ نکال لینے دو۔ چھوڑ دو افضل، باپ کی لاٹھیوں سے کوئی مرا نہیں کرتا۔"

افضل نے قدرے تذبذب کے بعد اندر سنگھ کا ہاتھ چھوڑ دیا اندر سنگھ نے دوبارہ لاٹھی اٹھائی لیکن اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا بیٹے نے اپنی پگڑی اتار کر اس کے آگے سر جھکا دیا اور باپ کے ہاتھوں سے لاٹھی گر پڑی۔ ایک لمحہ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اندر سنگھ گاؤں کی طرف چل دیا اس کی رفتار ہر قدم پر تیز ہو رہی تھی، یہاں تک کہ وہ بھاگ رہا تھا اندر سنگھ کے دونوں چھوٹے بیٹے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیے۔

افضل نے کہا "شیر سنگھ جاؤ اپنے باپ کو تسلی دو!"

شیر سنگھ نے پگڑی اپنے سر پر رکھ لی اور چپکے سے گاؤں کی طرف چل دیا وہ لوگ جو اندر سنگھ کی حمایت پر لڑنے کے لیے آئے تھے۔ حیران و ششدر کھڑے تھے۔

چودھری رحمت علی آگے بڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا "دیکھو بھئی! خدا کی یہ مرضی نہ تھی کہ ہمارے درمیان لڑائی ہو اس میں سب کی بھلائی ہے ہم نے پچھلے سال بند باندھ دیا تھا تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہے۔ اب اگر تمہارے کھیتوں میں پانی چڑھ آیا ہے تو یہ ہمارا قصور نہیں اب اگر بند توڑ دیا جائے تو ہمارا نقصان ضرور ہو گا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا بھی نقصان نہ ہو اور تم بھی بچ جاؤ اس وقت یہاں ساٹھ سے زیادہ آدمی ہیں اگر تم سب مل کر ہمت کرو تو تمہارے کھیتوں کو بچانا مشکل نہیں ہم

سب تمہاری مدد کرتے ہیں اگر ابھی بند باندھ دیا جائے تو تھوڑی دیر میں کھیتوں سے پانی اتر جائے گا اور فصل بچ جائے گی تم کام شروع کرو، میں جا کر گاؤں کے باقی آدمیوں کو گھروں سے نکالتا ہوں۔"

لوگ حیران تھے کہ یہ بات ان سے پہلے کیوں نہ کہی گئی تھوڑی دیر میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ مٹی کا بند تیار کر رہے تھے پڑوس کے گاؤں کے وہ چھ آدمی جو لڑائی میں اندر سنگھ کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں میں پہنچے اور وہاں سے تیس چالیس آدمی لے آئے شام سے کچھ دیر پہلے بند تیار ہو چکا تھا اور بارش تھم چکی تھی لیکن اس دوران میں چودھری رمضان کا کچھ پتا نہ تھا بند باندھنے کے بعد لوگوں کو ایک اور مشغلہ ہاتھ آ گیا کسی کو پانی سے بھرے ہوئے کھیت میں ایک مچھلی تیرتی نظر آ گئی اور اس نے شور مچا دیا لوگ لاٹھیاں اٹھا کر مچھلی کے پیچھے ہو لیے مچھلی کافی بڑی تھی اور پانی کی گہرائی کم تھی لوگ شور مچا رہے تھے "مارو! پکڑ لو گہرے پانی میں نہ جانے دو نکل گئی مارو!"

بالآخر لوگوں نے مچھلی کو لاٹھیوں کی ضربوں سے نڈھال کر کے پکڑ لیا۔

اب یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے کون لے جائے بالآخر تھوڑی سی تکرار کے بعد لوگوں نے اس بات کا فیصلہ اسماعیل کے سپرد کر دیا۔

اسماعیل نے کہا "دیکھو بھئی! اگر تم میں سے کوئی یہ بتا دے کہ اس وقت چودھری رمضان کہاں ہے تو مچھلی اس کی"

اب چودھری رمضان کی کسی کو خبر نہ تھی لوگوں نے اس کے متعلق مختلف اندازے

لگائے لیکن اسماعیل نے سب کے دعوے رد کر دیے۔

بالآخر لچھمن سنگھ نے کہا ”دیکھو اسماعیل! ہمیں پتہ ہے کہ تم یہ مچھلی نہیں چھوڑو گے اچھا بتاؤ کہاں ہے چودھری رمضان؟“

اسماعیل نے ہنستے ہوئے کہا ”جب ہم لڑنے کے لیے تیار تھے تو وہ ادھر سرکنڈوں میں چھپ گیا تھا جب اندر سنگھ نے شیر سنگھ کو لاٹھی ماری تھی تو اس نے سمجھا کہ لڑائی شروع ہو گئی ہے اور وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اس گنے کے کھیت میں پہنچا اور پھر ہماری مکئی کے کھیت سے گزر کر لال سنگھ کے گنے کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا لیکن اتنی دیر میں ابا جی بند بندھوانے کے لیے گاؤں سے باقی آدمی لے کر آ رہے تھے اس نے ان کا شور سن کر یہ خیال کیا کہ وہ اس کی تلاش میں آ رہے ہیں وہ الٹے پاؤں بھاگا اور گنے کے کھیتوں میں چھپتا ہوا چچا علی محمد کے جوار کے کھیت میں جا چھپا۔ اتنی دیر میں گاؤں کے دوسرے آدمی مدد کیلئے آ رہے تھے چودھری رمضان نے جوار کا کھیت بھی اپنے لیے محفوظ، نہ سمجھا، وہ وہاں سے بھاگ کر گنے کے کھیتوں میں آ گیا اب اسے یہ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے پانی کی کھائی میں چلتا ہوا وہ پھر اس طرف آ نکلا، تم بند باندھ رہے تھے لیکن اس نے یہ سمجھا کہ تم لڑائی میں مارے جانے والوں کی لاشیں دبا رہے ہو وہ الٹے پاؤں لوٹا اور اب وہ ہمارے گنے کے کھیت میں بیٹھا ہوا ہے؟“

لچھمن سنگھ نے سوال کیا ”لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ وہ تمہارے کھیت میں بیٹھا ہے؟“

اسماعیل نے جواب دیا ''بھئی میں ہی تو اسے وہاں بٹھا کر آیا ہوں''

''کب؟''

''زیادہ دیر نہیں ہوئی''

غلام حیدر نے کہا ''لیکن تمہیں اس کی ساری بھاگ دوڑ کا کیسے پتہ چلا؟''

''میں سارا دن اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں جب وہ تھک کر بیٹھ جاتا تھا، میں اسے شور مچا کر اٹھا دیتا تھا جب وہ سر کنڈے میں چھپ رہا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا جب وہ جھاڑیوں میں سے گزر کر گنے کے کھیت میں داخل ہوا تھا تو میری نظر اس پر تھی اس کے بعد میں اس کے پیچھے تھا اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو جا کر دیکھ لو سر کنڈوں میں اس کی لاٹھی پڑی ہوئی ہے، اس کے پاس ہی جھاڑی کے کانٹوں میں اس کی پگڑی لٹک رہی ہے اور ہمارے گنے کے کھیتوں میں بھاگنے سے اس کا منہ اور پاؤں چھلنی ہو چکے ہیں۔''

لچھمن سنگھ نے کہا ''لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا ہوگا؟''

اسماعیل نے کہا ''اگر میں اسے بلانے نہ جاؤں تو وہ دو دن اور وہیں بیٹھا رہے گا اسے یقین ہے کہ لڑائی میں بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، پولیس پہنچ چکی ہے اور اس کی تلاش ہو رہی ہے۔''

لوگ قہقہے لگاتے ہوئے چودھری رمضان کی تلاش میں چل دیے اور اسماعیل نے مچھلی اٹھا لی۔

☆☆☆☆☆

رات کے وقت مطلع صاف ہو چکا تھا چودھری رحمت علی عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو دروازے پر اندر سنگھ کھڑا تھا۔

اس نے کہا ''چودھری رحمت علی! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں''

''کون؟ اندر سنگھ؟''

''ہاں چودھری میں ہوں، مجھے شیر سنگھ نے ابھی بتایا ہے اور میں اپنی زندگی میں پہلی بار تمہارے پاس سر جھکا کر آیا ہوں''

''کوئی بات نہیں اندر سنگھ! ایک جگہ دو برتن بھی آپس میں کھڑک جاتے ہیں اور ہم تو آدمی ہیں ہاں شیر سنگھ نے تمہیں کیا بتایا؟''

''چودھری سچ کہو تم کچھ نہیں جانتے؟''

''کس کے متعلق؟''

''اندر سنگھ نے کہا'' کل رات کے واقعے کے متعلق افضل نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟

رحمت علی نے جواب دیا ''رات کے متعلق افضل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی کیا ہوا کل رات؟''

اندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ افضل مسجد کے دروازے سے نکل کر بولا

''ابا جی! کل رات شیر سنگھ مجھ سے ملا وہ چاہتا تھا کہ ہمارے خاندانوں میں صلح ہو جائے میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو راضی کر لوں گا۔''

اندر سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مسجد سے کچھ آدمی نکل کر ان کے قریب کھڑے ہو

گئے اندر سنگھ خاموشی سے افضل کی طرف دیکھتا رہا۔

رحمت علی نے اندر سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بیٹھیں"

اندر سنگھ کوئی بات کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا باہر کی حویلی کے پھاٹک سے گزرتے ہوئے اس نے کہا "بھگوان کے کھیل نیارے ہیں کل تک میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں یا میری نسل سے کوئی اس دروازے کے قریب پاؤں رکھے گا لیکن آج میں بن بلائے تمہارے پاس آیا ہوں"

رحمت علی نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ ایسے نیک کام میں میں نے خود پہل کیوں نہ کی ہم دونوں کے بال سفید ہو گئے زندگی کا کیا بھروسہ آدمی مر جاتا ہے لیکن اس کی بات رہ جاتی ہے۔"

صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں رحمت علی اور اندر سنگھ ایک چارپائی پر بیٹھ گئے افضل ان کے سامنے دوسری کھٹیا پر بیٹھ گیا۔ اندر سنگھ رات کے واقعہ کے متعلق اپنی شرم ندامت کا اظہار کرنے آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ افضل اپنے باپ اور بھائیوں کو سب کچھ بتا چکا ہو گا لیکن جب رحمت علی نے لاعلمی کا اظہار کیا اور افضل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تو اسے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ افضل اس کے خاندان کو رسوا نہیں کرے گا۔ اگر اس نے اپنے باپ سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تو کسی اور کو بھی نہیں بتائے گا۔

شیر سنگھ کی شادی ہونے والی تھی اور اسے ڈر تھا کہ اگر ایسی بات مشہور ہو گئی تو اس کے سسرال والوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن اب اس کے خدشات دور ہو چکے

تھے اور وہ تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر افضل کی طرف دیکھ رہا تھا اور چاند کی روشنی میں افضل کی خاموش نگاہیں اسے کہہ رہی تھیں ''میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن اس کی ضرورت نہیں یہ راز میرے دل میں رہے گا۔''

تھوڑی دیر میں باقی چارپائیاں بھی آدمیوں سے بھر چکی تھیں اسماعیل بھی آ گیا۔ عام طور پر رحمت علی نوجوانوں کو کھل کر ہنسنے کا موقع دینے کے لیے اٹھ کر گھر چلا جایا کرتا تھا لیکن آج جب اسماعیل آیا تو اس نے کہا ''اسماعیل! اندر سنگھ کو چودھری رمضان کا قصہ سناؤ'' اسماعیل نے قدرے ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن باپ کے اصرار پر اس نے چودھری رمضان کی سرگزشت دہرا دی سننے والوں کے قہقہوں نے اردگرد کے گھروں کے باقی لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ کر دیا۔ وہ حویلی کا رخ کرنے لگے۔

کچھمن سنگھ چودھری رمضان کو اس کے گھر سے اٹھا لایا کاکو عیسائی اور پیراندنہ چوکیدار ہری سنگھ کو پکڑ لائے۔

رحمت علی نے کہا ''افضل جاؤ شیر سنگھ کو بلا لاؤ!''

تھوڑی دیر میں افضل، شیر سنگھ کو لے کر آ گیا

برسات کے ایام کسانوں کے لیے فراغت کے دن ہوتے ہیں اور یوں بھی دیہات میں وقت کی پیائش منٹوں سیکنڈوں کے پیانے سے نہیں کی جاتی یہ محفل رات کے تیسرے پہر تک گرم رہی اسماعیل نے اپنے چودھری رمضان کی زندگی کے اہم ترین واقعات پر تبصرہ کیا اور اس کے بعد ہری سنگھ کی باری آئی جب کوئی نیند کا غلبہ محسوس کر کے اٹھتا تو دوسرے اسے پکڑ کر بٹھا لیتے اور کہتے:

”ارے یار! کیوں بھاگ رہے ہو کل سارا دن سونے کے لیے ہے“

بالآخر اسماعیل نے کہا ”اچھا بھئی میں تھک گیا ہوں، تمہیں بھی نیند آ رہی ہو گی اب تم چودھری رمضان سے کہو کہ وہ اپنی مرغی کا قصہ سنائے۔“

چودھری نے یہ سنتے ہی اپنا حقہ سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن چھمن سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”نہیں چودھری سنا کر جاؤ!“

رمضان نے جل کر کہا ”میری کم بختی تھی جو یہاں آ گیا، آئندہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا“ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چھمن سنگھ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود آٹھ روٹیاں کھاتا تھا چودھری رمضان مجبوراً بیٹھ گیا لیکن لوگوں کے اصرار کے باوجود مرغی کا قصہ سنانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

اسماعیل نے کہا ”اچھا چودھری اگر تم مرغی والا قصہ نہیں سناؤ گے تو میں منڈی کا قصہ سنا دوں گا۔“

چودھری رمضان منڈی کا قصہ چھپانے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا اس نے کہا ”اچھا سناتا ہوں بات یہ تھی کہ ہمارا بیلن چل رہا تھا جلال گنے لگا رہا تھا، میں گنڈیال 1 میں بیٹھا ہوا تھا کہ بلی مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی اور جلال کی ماں نے شور مچا دیا۔“

رمضان یہاں تک کہہ کر رک گیا لوگوں نے کہا ”پھر کیا ہوا چودھری؟“

رمضان قدرے تذبذب کے بعد بولا ”مرغیاں ڈربے میں چیخ رہی تھیں میں نے بلی کو ڈرایا لیکن وہ سہم کر ایک کونے کے ساتھ لگ گئی میں نے ڈربے کی کھڑکی

میں سر دے کے اندر جھانکا لیکن وہاں اندھیرا تھا میں نے جلال کی ماں کو کہا ''دیا لاؤ'' وہ دیا لائی تو میں نے کہا ''تم مجھے ڈربے کے اندر روشنی دکھاؤ اور میں بلی کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹتا ہوں اس نے جھک کر چراغ آگے کر دیا۔

1 وہ کمرہ جس کے اندر گڑ بنانے کی بھٹی ہوتی ہے۔

کاکو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا ''پھر کیا ہوا چودھری؟''

''پھر وہی ہوا جس پر تم سب دانت نکالا کرتے ہو۔۔۔میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ اور آگے لاؤ، اس نے چراغ اور آگے کر دیا، میں نے ذرا اوپر کرنے کو کہا اور اس نے اوپر کر دیا، میری پگڑی کے قریب میرا خیال بلی کی طرف تھا اور میری پگڑی سلگ رہی تھی ڈربے کی ایک جانب میرے سر کا سایہ پڑ رہا تھا میں نے جلال کی ماں سے کہا چراغ نیچے کرو، اس نے نیچے کر دیا بالکل میری داڑھی کے نیچے۔۔۔۔داڑھی کے بالوں کی آگ تو میں نے ہاتھ مار کر بجھالی، لیکن پگڑی کی آگ کا مجھے اس وقت بھی علم نہ ہوا جبکہ سارے ڈربے میں دھواں بھر چکا تھا بلی نے پنجے مار کر میرا منہ نوچ لیا میں نے جلدی سے سر باہر نکالا، بلی بھاگ گئی جلال کی ماں چلائی ''تمہارے سر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس نے میری پگڑی اتار کر پھینک دی میں نے پگڑی کو پاؤں سے مسل کر آگ بجھائی دوبارہ ڈربے کو اچھی طرح دیکھا تو معلوم ہوا کہ بلی دو مرغیوں کا گلا چبا چکی ہے۔۔۔۔یہ ہنسنے کی بات نہیں بعض دن بڑے منحوس ہوتے ہیں اس کے بعد گنڈیال کے اندر گیا تو بھٹی پر کڑاہی میں گڑ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔۔۔۔

محفل قہقہوں سے گونج اٹھی لوگ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے چودھری رمضان گھبرا کر اٹھا اور لوگوں کو پھلانگتا، گرتا پڑتا گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان کے چلے جانے کے بعد اسمایل نے اندر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا'' چچا ایک بات اور سنو چودھری رمضان کے باپ کی گھوڑی نے بچھیری دی اور چودھری رمضان کو اس بات کا شوق ہوا کہ اس کی شادی تک سواری کے قابل ہو جائے، اس لیے یہ گھر والوں سے چوری اسے بھینس کا دودھ پلایا کرتا تھا جب اس کی برات گئی تو وہ اپنی بچھیری پر جواب گھوڑی بن چکی تھی، سوار تھا راستہ میں ہم نے گھوڑیاں بھگائیں، لیکن اس کی گھوڑی پر بھینس کا اثر تھا، وہ گرمی کی تاب نہ لا سکی۔ چنانچہ جب ہم ان کی سسرال کے گاؤں میں پہنچے تو گھوڑی دولہا سمیت گندے پانی کے جوہڑ میں گھس گئی۔۔۔۔۔''

اندر سنگھ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا رات زیادہ گزر چکی تھی اسماعیل کو نیند آ رہی تھی، وہ اٹھا اور اس کے ساتھ ہی لوگ ایک ایک دو دو کر کے جانے لگے۔

جب یہ محفل برخاست ہوئی تو اندر سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا:

''چودھری رحمت علی! میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا بات یہ ہے کہ اگلے چاند کی دس تاریخ کو شیر سنگھ کی شادی ہے اور آپ سب کو برات میں جانا پڑے گا تحصیلدار کو بھی لکھ دیں کہ وہ دو دن کی چھٹی لے آئے۔''

رحمت علی نے کہا'' کیوں نہیں، شیر سنگھ کی شادی پر تو ہم ضرور جائیں گے ہاں روپے پیسے کی ضرورت ہو تو کسی ساہوکار کے پاس نہ جایئے گا ہم انتظام کر لیں گے''

اندر سنگھ نے جواب دیا ''چودھری جی آپ کی بڑی مہربانی لیکن میں سارا انتظام کر چکا ہوں سیٹھ رام چند گھر آ کر مجھے آٹھ سو روپیہ دے گیا تھا۔''

رحمت علی نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا ''بھائی لڑکوں پر قرضے کا بوجھ نہ ڈالو میں نے سنا ہے کہ پہلے بھی تم رام چندر کے مقروض ہو''

اندر سنگھ نے کہا ''معمولی قرضہ ہے، اتر جائے گا چودھری جی ہاں برات کے لیے گھوڑوں کا بندوبست آپ کو کرنا پڑے گا!''

''گھوڑوں کی تم فکر نہ کرو۔۔۔۔اور کوئی ضرورت بھی ہو تو حاضر ہوں''

یہ دو خاندانوں کے نئے تعلقات اور دو نوجوانوں کی دوستی کا پہلا دن تھا

☆☆☆☆☆

سلیم، مجید، رام لال اور گلاب سنگھ نے چوتھی جماعت کا امتحان ایک ساتھ پاس کیا اور وہ گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر شہر کے ہائی سکول میں داخل ہو گئے، پرائمری سکول والے گاؤں سے موہن سنگھ، معراج الدین اور ماسٹر کا لڑکا علی احمد بھی ان کے ساتھ ہی ہائی سکول میں داخل ہوئے داؤد دو سال قبل پرائمری کی تعلیم ختم کر کے سکول چھوڑ چکا تھا اور شہر کے کارخانے میں مزدور بھرتی ہو گیا تھا جلال اور بشیر بھی سکول چھوڑ کر مویشی چرایا کرتے تھے۔

سلیم کے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک گاؤں اور تھا جہاں سے چند لڑکے سکول جایا کرتے تھے ان میں سے دو لڑکے بلونت سنگھ اور مہندر سنگھ، سلیم کے ساتھ بہت

جلد مانوس ہو گئے بلونت سنگھ، سلیم اور مجید کے ساتھ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مہندر سنگھ جو بلونت سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا، پرائمری کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا بلونت سنگھ اور مہندر کا باپ شہر کے کارخانے میں ہیڈ کلرک تھا اس گاؤں سے سلیم کا ایک اور ہم جماعت کندن لال تھا اس کا باپ رام چند علاقہ کا مشہور ساہوکار تھا وہ ارد گرد کے دیہات کے کسانوں کو بیاہ شادی کے موقعوں پر قرضے دیا کرتا تھا کسان اس کے بہی کھاتہ پر انگوٹھا لگا کر روپیہ لے لیتے اور دھوم دھام سے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی رچاتے اور سیٹھ رام چند ان کے بیٹوں اور پوتوں سے سود در سود وصول کرتا جس سال شادیاں کم ہوتیں اس سال وہ کسانوں کی لڑائیاں کروا دیا۔ پولیس آتی اور لڑنے والوں کو ہتھکڑیاں لگا لیتی اور سیٹھ رام چند اپنا بہی کھاتہ اور روپیہ لے کر ان کی مدد کو پہنچ جاتا موقع کی نزاکت کے پیش نظر کسان جتنے روپے لیتے اس سے دوگنی رقم کی رسید لکھ دیتے۔ پھر وہ کہتا ''دیکھو بھئی تھانیدار بہت سخت ہے، میں تمہارے طرف سے یہ روپے لے کر اس کے پاس جاتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ میری بے عزتی نہ کر ڈالے'' لوگ اسے دعائیں دیتے اگر دو سو روپیہ ہوتا تو وہ سو اپنے پاس رکھ لیتا اور باقی سو تھانیدار کو پیش کر کے کہتا ''تھانیدار صاحب! ان بے چاروں کے پاس کچھ نہ تھا، لیکن آپ کی خاطر میں نے انہیں یہ ایک سو روپیہ قرض دیا ہے انہوں نے میرے پہلے قرضے بھی ادا نہیں کیے مجھے کسی دن آپ کی مدد لینی پڑے گی۔''

اور جب پھر ان کی ہتھکڑیاں کھول دی جاتیں تو وہ کسانوں سے کہتا ''دیکھو بھئی!

تھانیدار نہیں مانتا تھا، اس نے دوسو روپیہ میرے منہ پر دے مارا۔ پھر میں نے منت کی تو وہ بڑی مشکل سے مانا اب ادائیگی میں سستی نہ کرنا!'' اس طرح رام چند کی جیب سے روپیہ نکلتا اور کسان سود در سود کے ساتھ چار سو کی قسطیں ادا کرتے۔

اگر تھانے دار ایمان دار ہوتا تو رام چند کسانوں کو دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں مقدمے لڑنے کی ترغیب دیتا اور وہ اس سے قرض لے کر وکیلوں کی فیس ادا کرتے۔ ان سب باتوں کے باوجود رام چند کے دیوتا اس پر بہت خوش تھے اور انہیں خوش رکھنے کے لیے وہ اتوار کے دن پوجا پاٹ کے بعد چیونٹیوں اور مکوڑوں کے بلوں کے سامنے اناج کی چند مٹھیاں بکھیر آیا کرتا تھا۔

☆☆☆☆☆

گاؤں سے اسکول جاتے ہوئے سلیم اپنے ساتھیوں کو ایک کہانی سنا رہا تھا گلاب سنگھ اور رام لال حسب معمول اس کی کہانی گہری توجہ سے سن رہے تھے مجید کے ہاتھ میں ربڑ کی غلیل تھی اور وہ چلتے چلتے مختلف چیزوں پر نشانے کی مشق کر رہا تھا ایک درخت پر چڑیا بیٹھی تھی مجید نے اپنے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کہا ''دیکھو میں ابھی چڑیا کو گراتا ہوں'' لیکن گلاب سنگھ اور رام لال کہانی سننے میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا مجید نے چڑیا کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے ان کے قریب پہنچتے ہوئے کہا ''سلیم کی کہانی بالکل غلط ہے میں اسے جانتا ہوں یہ ساری باتیں گھر بیٹھ کر گھڑتا ہے۔''

سلیم خاموش ہو گیا لیکن گلاب سنگھ نے کہا ''اگر تمہیں پسند نہیں تو نہ سنو، ہم تو ضرور سنیں گے۔۔۔۔۔سناؤ سلیم!''

مجید نے کہا ''بس میں نہیں سننے دوں گا!''

''اچھا نہ سننے دو ہم اتوار کے دن تمہارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہیں جائیں گے تمہارے ساتھ نہر پر نہانے بھی نہیں جایا کریں گے اور تمہارے ساتھ کھیلیں گے بھی نہیں کیوں رام لال؟''

رام لال نے سر ہلا کر گلاب سنگھ کی تائید اور مجید نے اپنے ساتھیوں کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر کہا ''اچھا سلیم سناؤ نہیں کہانی''

سلیم نے بگڑ کر کہا ''بس میں نہیں سناؤں گا''

مجید نے کہا ''ارے میں تو مذاق کر رہا تھا تمہاری کہانی تو بالکل سچی تھی''

سلیم نے کہا ''سچی ہو یا جھوٹی، میں نہیں سناؤں گا''

مجید، رام لال اور گلاب سنگھ اسے منا رہے تھے کہ سامنے سے کسی کی آواز آئی

سلیم! سلیم!! میں کب سے یہاں کھڑا ہوں جلدی آؤ نا!

یہ پٹواری کا لڑکا معراج الدین تھا وہ حسب معمول اس جگہ کھڑا تھا جہاں اس کے گاؤں سے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی ان کے راستے کے ساتھ آملتی تھی۔

یہ قریب پہنچے تو معراج الدین نے کہا ''اچھا اب کہانی سناؤ!''

معراج الدین کے اصرار پر علیم کہانی سنانے کے لیے تیار ہو گیا اس نے کہا ''جب شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو۔۔۔!''

لیکن معراج الدین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''لیکن شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا؟''

سلیم نے جواب میں ''یہ میں انہیں بتا چکا ہوں''

معراج الدین نے کہا ''لیکن میں نے نہیں سنا مجھے شروع سے سناؤ!''

گلاب سنگھ نے کہا ''نہیں نہیں، شروع سے نہیں''

اب گلاب سنگھ اور رام لال یہ سننے کے لیے بے قرار تھے کہ جب شہزادہ بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈالا گیا تو کیا ہوا اور معراج الدین کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ بیچارے شہزادے کو بھوکے شیر کے پنجرے میں کیوں ڈالا گیا۔

اس بحث سے مجید کو بھی کہانی کے ساتھ دلچسپی ہو گئی اور اس نے کہا سلیم شروع سے سناؤ تو میں بھی سنوں گا

سلیم کو دوبارہ ابتدا کرنا پڑی لیکن وہ ابھی بھوکے شیر کے پنجرے تک نہیں پہنچا تھا کہ بلونت کا گاؤں آ گیا بلونت سنگھ، مہندر سنگھ اور کندن لال راستے میں کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے بھی یہ کہانی شروع سے سننے پر اصرار کیا ان لڑکوں کے ساتھ سلیم کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی اس لیے ان کا مطالبہ رد کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا لیکن مجید کہہ رہا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جب بلونت سنگھ نے اصرار کیا تو گلاب سنگھ اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا ''جاؤ سلیم دوسرے گاؤں کے لڑکوں کو کہانی نہیں سناتا''

بلونت سنگھ اور کندن لال ناراض ہو کر چل دیے لیکن مہندر سنگھ جو سب سے چھوٹا

تھا اور جسے کہانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ دلچسپی تھی منہ بسور کر سلیم کی طرف دیکھتا رہا، جب سلیم اور باقی لڑکے اس کی طرف توجہ کیے بغیر چل دیے تو وہ بستہ ایک طرف پھینک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

سلیم ایک لمحہ کے لیے مڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن مجید نے اس کا بازو پکڑ کر آگے دھکیلتے ہوئے کہا ''چلو سلیم دیر ہو رہی ہے!''

سلیم بادل ناخواستہ چل پڑا بلونت سنگھ نے ایک کھیت آگے جا کر پیچھے دیکھا اور مہندر سنگھ کو آواز دی ''مہندری سنگھ کے بچے دیر ہو رہی ہے!'' لیکن مہندر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔

بلونت سنگھ چند آوازیں دینے کے بعد برہم ہو کر چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ کچھ دور آگے نکل جائیں گے تو وہ خود بخود بھاگتا ہوا آ جائے گا باقی لڑکوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی وہ دو کھیت آگے نکل گئے لیکن مہندر سنگھ نے ان کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

کندن لال نے بلونت سنگھ سے کہا ''ارے یار تم اسے دو چار تھپڑ کیوں نہیں لگاتے!''

بلونت سنگھ ایسی نصیحت پر عمل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اس نے جلدی سے بستہ زمین پر رکھا اور بھاگ کر مہندر سنگھ کے قریب پہنچتے ہوئے اسے دو مکے رسید کر دیے مہندر سنگھ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا وہ زمین پر لیٹ کر چلانے لگا بلونت سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا لیکن وہ زمین پر بچھا جا رہا تھا سلیم اپنا بستہ رام لال

کے حوالے کر کے بھاگتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا ''بلونت ! تم بہت ظالم ہو، اسے مارتے ہو''

بلونت سنگھ نے شکست خوردہ سا ہو کر کہا ''اس سے پوچھا کہ یہ بیٹھ کیوں گیا ہے مجھے سکول جانے میں دیر ہو رہی ہے۔''

سلیم نے کہا ''چلو مہندر! دیر ہو رہی ہے!''

مہندر سنگھ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا''

سلیم نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا ''دیکھو مہندر تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟''

مہندر نے اس کی طرف دیکھا اور بھولے پن سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچھا اب اٹھو میں تمہیں شروع سے کہانی سناؤں گا

مہندر کو اپنے بھائی کی مار بھول گئی اور اس نے کہا ''ساری سناؤ گے نا؟''

''ہاں ساری سناؤں گا''

''کل بھی سناؤ گے نا؟''

''ہاں کل بھی سناؤں گا''

مہندر نے جلدی سے بستہ اٹھا لیا لیکن کچھ سوچ کر بولا ''میرے بغیر کسی اور کو تو نہیں سناؤ گے؟''

''نہیں تمہارے بغیر کسی اور کو نہیں سناؤں گا''

☆☆☆☆☆

مجید کا چچا زاد بھائی اور ایک تحصیل دار کا لڑکا ہونے کے باعث سلیم اپنے ہم مکتبوں میں کافی احترام سے دیکھا جاتا تھا۔لڑکوں پر اس کی ذہانت کا رعب بھی تھا۔ اسکول میں صرف وہی لڑکا ایسا تھا جس نے کبھی ماسٹر جی سے مار نہیں کھائی تھی۔اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھیوں کو عجیب وغریب کہانیاں سنایا کرتا تھا اور اس کی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوا کرتی تھیں۔چھٹی کے بعد بہت سے لڑکے صرف اس کی کہانی سننے کے شوق میں اس کے گاؤں تک جایا کرتے تھے۔جب وہ سناتے سناتے رک جاتا تو لڑکے بےقراری سے پوچھتے ''پھر کیا ہوا سلیم؟''

وہ جواب دیتا ''باقی کل سناؤں گا''

لڑکے مایوس ہو کر چلے جاتے اور سلیم رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹ کر کہانی کا باقی حصہ سوچ لیتا۔اگلے دن پھر وہ اپنی طویل کہانی کا نیا حصہ کسی ایسے واقعے کی تمہید سے ختم کرتا کہ سننے والے اختتام کے لیے بیقرار رہتے۔سلیم کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اس کے خاندان کی عورتوں اور بچوں کو بھی علم تھا لیکن ایک واقعہ سے اس خاندان کے بزرگ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ برخوردار لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے عجیب وغریب کہانیاں ایجاد کرنے میں کافی مہارت پیدا کر چکا ہے۔بات یہ ہوئی کہ پٹواری کے لڑکے معراج الدین کو سلیم نے ایک کہانی سنائی تھی اور حسب معمول اسے ایک عجیب وغریب الجھن میں ڈالنے کے بعد باقی حصہ اگلے دن سنانے کا وعدہ کر کے گھر چلا آیا تھا۔معراج الدین کی توجہ کہانی میں اس قدر جذب ہو چکی تھی کہ اسے یہ بات یاد نہ رہی کہ اگلے دن اتوار ہے اور اس کے بعد عید کی دو

چھٹیاں ہیں۔

عید کے دن سلیم گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اس کے چچا نے آ کر کہا ''سلیم گھر جاؤ، بھابی جان تمھیں بلاتی ہیں'' سلیم گھر پہنچا تو خاندان کی عورتوں کے درمیان ایک ساٹھ سالہ بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں دو بچے تھے ایک معراج الدین تھا اور ایک لڑکی تھی۔ جس کا سفید رنگ اور بھورے بال اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ وہ معراج الدین کی بہن ہے۔

سلیم کی ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا ''لو ماں جی! سلیم آ گیا!''

بڑھیا نے کہا ''آؤ بیٹا آؤ میں تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہوں''

سلیم کی چچا زاد بہن امینہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی دوسری لڑکیوں اور عورتوں نے بھی بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی سلیم کی دادی نے امینہ کو ڈانٹ کر محفل سے اٹھا دیا، تاہم وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر قہقہے لگاتی رہی۔

سلیم پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا، اس کی ماں نے کہا ''سلیم یہ تمھارے دوست کی دادی ہیں آگے بڑھ کر سلام کرو!''

سلیم ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا بڑھیا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ بیٹا! میں تمھارے لیے عید کے دن اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہوں'' عورتیں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر رہی تھیں سلیم نے اپنی ماں کی طرف دیکھا ماں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اسے اپنی مرضی کے خلاف بڑھیا کے قریب بیٹھنا پڑا۔

معراج الدین کی دادی نے کہا ''بیٹا! معراج الدین دو راتوں سے خواب میں

بڑبڑاتا رہا ہے۔ اس نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے آج عید کے دن اس نے اس شرط پر نئے کپڑے پہنے تھے کہ میں اسے سلیم کے گھر لے جاؤں گی اور یہ سکینہ بھی دو دن سے میری جان کھاتی رہی ہے میں خود یہ چاہتی تھی کہ عید کے بعد جب سکول کھلے، میں معراج کے ابا کو بھیج کر تمہیں گھر بلواؤں اور تم سے باقی کہانی سنوں لیکن جب ان بچوں نے تنگ کیا تو مجھے تمہارے گھر آنا ہی پڑا ہاں بیٹا پھر کیا ہوا؟''

سلیم اب سوچ رہا تھا کہ اس نے کہانی کہاں ختم کی تھی معراج الدین کی دادی نے کہا ''بیٹا! اب میں سنے بغیر نہ جاؤں گی ہاں بتاؤ بادشاہ اژدہا کے پیٹ سے کیسے نکلا؟''

کواڑ کے پیچھے سلیم کی دوسری چچا زاد بہن صغریٰ اور اس کی چھوٹی بہن زبیدہ بھی امینہ کے قریب پہنچ کر اس کے قہقہوں میں شریک ہو چکی تھیں لیکن سلیم کو ان کے قہقہوں سے زیادہ بڑی عمر کی خواتین کی زیر لب مسکراہٹیں پریشان کر رہی تھیں، وہ اس صورتحال کی تمام ذمہ داری معراج الدین پر عاید کر رہا تھا اور یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ اپنی زندگی کا یہ نازک مرحلہ عبور کرنے کے بعد معراج الدین کو کبھی کہانی نہیں سنائے گا۔ اس کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کی ماں، اس کی دادی اور گھر کی دوسری عورتیں اس کی پسلیوں میں انگلیاں چبھو رہی تھیں۔ دو دن کھیل کود میں مصروف رہنے کے باعث اسے کہانی کا نیا حصہ تیار کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر صرف معراج الدین کا سوال ہوتا تو وہ دماغ پر بوجھ دیے بغیر بھی اژدہا کے پیٹ میں پھنسے ہوئے بادشاہ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا لیکن بڑھیا کے چہرے کی

جھریاں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ پھنسے ہوئے بادشاہ کو نکالنے کے لیے اس کی کسی بے معنی ترکیب کو پسند نہیں کرے گی۔

سلیم کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے اس کی ماں نے بڑھیا سے کہہ دیا۔''

ماں جی! شاید سلیم کو کہانی کا پچھلا حصہ بھول گیا ہے، آپ اسے یاد دلا دیں۔''

بڑھیا پر امید ہو کر بولی ''ہاں بیٹا! میں تمہیں یاد دلاتی ہوں بادشاہ دوسرے ملک کی شہزادی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اس کی بہت سی شرطیں پوری کر چکا تھا، اب صرف ایک شرط باقی تھی کہ وہ پہاڑوں سے سونے کے سینگوں والے ہرن کو پکڑ کر لائے وہ اپنی فوج کے ساتھ کئی دن سونے کے سینگوں والے ہرن کا پیچھا کرتا رہا ایک دن وہ ہرن ایک بہت بڑے پہاڑ کے غار میں غائب ہو گیا۔ بادشاہ اور اس کی فوج اس کے پیچھے غار میں داخل ہو گئی لیکن یہ پہاڑ نہ تھا، یہ ایک بہت بڑا اژدہا تھا اور وہ غار اس اژدہے کا منہ تھا۔ جب بادشاہ اور اس کی فوج اندر داخل ہو گئی تو اژدہا نے اپنا منہ بند کر لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا بیٹا؟'' اب تمام عورتیں سنجیدگی سے سلیم کی طرف دیکھ رہی تھیں امینہ اور صغریٰ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

معراج الدین نے کہا ''دادی جان آپ نے یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کی فوج کے ساتھ اس کے گھوڑے، ہاتھی اور کتے بھی اژدہے کے پیٹ میں داخل ہو چکے تھے!''

معراج الدین کی یادداشت نے سلیم کی مشکلات میں اور اضافہ کر دیا۔ انسانوں کو نکالنے کے لیے پیٹ میں جس معمولی سی سرنگ کی ضرورت تھی، وہ شاید چاقوؤں اور تلواروں کے ساتھ تیار ہو جاتی لیکن اب آدمیوں کے ساتھ ہاتھی گھوڑے بھی آ

پھنسے تھے اور انہیں نکالنے کے لیے ایک کشادہ گزرگاہ کی ضرورت تھی۔ مسئلہ جس قدر اہم تھا، اسی قدر نازک تھا اور تمام عورتیں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ بڑھیا بے چاری بلاوجہ نہیں آئی۔

بڑھیا نے کہا ''جب معراج الدین اور سکینہ نے مجھے تنگ کیا تو میں نے ان کے باپ کو کہانی کا باقی حصہ سنانے پر مجبور کیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے یہ کہانی نہیں سنی لیکن اگر سچ مچ اژدہا اتنا بڑا تھا اور منہ بند ہو چکا تھا تو بادشاہ اور اس کے ساتھی دم گھٹ کر مر گئے ہونگے لیکن سلیم معراج کو یہ بتا چکا ہے کہ بادشاہ باقی تمام مصیبتوں کی طرح اس مصیبت سے بھی بچ کر آئے گا۔ میں ان بچوں کو لے کر ماسٹر کے گھر بھی گئی تھی لیکن وہ بھی یہی کہتا تھا کہ بادشاہ مر جائے گا۔ سلیم کی ماں! اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ بادشاہ، شہزادی کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے نہیں مرسکتا، جس طرح اس نے باقی چھ شرطیں پوری کی ہیں، اسی طرح یہ ساتویں شرط بھی پوری کرے گا لیکن وہ نکلے گا کیسے؟''

جب بڑھیا باتیں کر رہی تھی، سلیم غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نچلے جبڑے میں درمیان سے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور باتیں کرتے وقت اس کی زبان ہلتی نظر آتی تھی۔ سلیم نے سوچا کہ اگر ان اکھڑے ہوئے دانتوں کی جگہ وہ اپنی انگلی رکھ دے تو بڑھیا کوشش کے باوجود بھی اسے نہیں کاٹ سکتی۔ بڑھیا کے باقی دانت بھی باتیں کرتے وقت ہلتے تھے۔ سلیم جانتا تھا کہ بڑھاپے میں لوگوں کے دانت ہلتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں اور اچانک اسے ایک خیال آیا اور

اسکی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اہل محفل کی سنجیدگی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اگر یہ معما حل نہ ہوا تو نہ صرف اس کی توہین ہوگی، بلکہ سارے خاندان کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

سلیم نے کہا ''اچھا سناتا ہوں''

بڑھیا نے کہا ''شاباش بیٹا!''

سلیم شاباش سے بے نیاز تھا وہ صرف جان چھڑانا چاہتا تھا وہ بولا ''بادشاہ نے سینگوں والے ہرن کو گھیر کر پکڑ لیا لیکن اس کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ غار کی بجائے اژدہے کے پیٹ میں ہے، جس کا منہ بند ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جو ہماری حویلی کے پھاٹک سے بھی بڑے تھے، آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن اژدہا بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا ایک دانت ہلتا تھا بادشاہ نے تمام گھوڑوں اور ہاتھیوں کے رسے جمع کر کے ایک بہت موٹا اور مضبوط رسا بنوایا اور اس کا ایک سرا اژدہا کے دانت سے باندھ دیا اور دوسرے سرے کے ساتھ سارے ہاتھی اور گھوڑے جوت دیے۔ وہ دو دن زور لگاتے رہے تھے، تیسرے دن دانت اکھڑ گیا۔ دانت نکل جانے سے اژدہے کے منہ میں بہت بڑا دروازہ بن گیا اور بادشاہ، فوج، ہاتھی، گھوڑے، کتے سب باہر نکل آئے۔ وہ اژدہا اتنا بڑا تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا۔''

سلیم نے یہاں تک کہہ کر اپنے اردگرد فاتحانہ انداز سے دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن بڑھیا کی تشنگی ابھی باقی تھی، اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے بازو پکڑ لیے اور کہا ''پھر کیا ہوا بیٹا! مجھے ساری کہانی سنا کر جاؤ!'' سلیم نے

کھڑے کھڑے بات ختم کر دی ''بادشاہ سونے کے سینگوں والا ہرن لے کر شہزادی کے پاس پہنچ گیا شہزادی کی ساتوں شرطیں پوری ہو چکی تھیں، اس لیے ان کا بیاہ ہو گیا بس!''

جب معراج الدین کی دادی سلیم کے گھر سے نکلی تو وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی کوفت رائیگاں نہیں گئی معراج الدین فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا:

''دیکھا دادی جان! آپ کہتی تھیں کہ بادشاہ مر جائے گا''

بڑھیا نے گرج کر کہا ''میں کب کہتی تھی، تمہارا باپ اور ماسٹر دونوں بدھو ہیں''

اور شام کے وقت سلیم کی ماں اسے کہہ رہی تھی ''سلیم! تم بہت شریر ہو گئے ہو، بڑوں سے مذاق نہ کیا کرو!''

اس نے معصومانہ انداز میں کہا ''میں نے کس سے مذاق کیا ہے امی جان؟''

''ادھر آؤ!''

سلیم آگے بڑھ کر ماں کے قریب کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''سچ کہو تم نے اس بوڑھی عورت کے دانت دیکھ کر وہ بات نہیں گھڑی تھی؟''

سلیم اس کے جواب میں سر جھکا کر مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

سلیم کے لیے گاؤں کے پرائمری سکول سے شہر کے ہائی سکول کا ماحول بہت

مختلف تھا یہاں قریباً پانچ سولڑکے تعلیم پاتے تھے استادوں کی تعداد بھی بارہ سے اوپر تھی۔ کوئی انگریزی پڑھاتا تھا، کوئی حساب، کوئی اردو، کوئی سائنس، کوئی تاریخ اور کوئی جغرافیہ اور کوئی عربی اور فارسی، لیکن طالب علموں کے نزدیک ان استادوں کی صرف تین قسمیں تھیں۔ کم مارنے والے، زیادہ مارنے اور بہت ہی زیادہ مارنے والے۔

سلیم دلچسپی کے بغیر کوئی کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ اردو اور انگریزی کی کتابوں میں کہانیاں تھیں، اس لیے وہ انہیں شوق سے پڑھتا تھا، اسے تاریخ اور جغرافیہ سے بھی انس تھا لیکن استادوں کی مخصوص زبان میں سوالوں کے جواب رٹنا اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ حساب کے ہندسوں اور جیومیٹری کی لکیروں سے بھی اسے نفرت تھی لیکن حساب کا ماسٹر بہت جابر تھا اور بد قسمتی سے سلیم کے والد کا دوست بھی تھا، وہ سب سے پہلے سلیم سے پوچھا کرتا تھا ''کیوں سلیم گھر کا کام کیا؟'' دو تین مرتبہ بنچ پر کھڑا ہونے کے بعد سلیم نے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ آئندہ ماسٹر جی کو خفا ہونے کا موقع نہیں دے گا باقی ماسٹروں کی بھی یہی خواہش ہوا کرتی تھی کہ لڑکے روز کا سبق روز رٹ کر آئیں تاریخ اور جغرافیہ کے ماسٹر اپنے ہر سوال کا جواب درسی کتابوں کی مخصوص زبان میں سننا پسند کرتے تھے۔ گزشتہ چند برس کی ملازمت کے دوران میں ان مضامین کی درسی کتابوں کی عبارت ان کے دل پر نقش ہو چکی تھی، لڑکوں سے سوال پوچھنے سے پہلے وہ اپنی چھڑی اٹھالیتے۔ اگر کوئی لڑکا ایک آدھ فقرہ بھول جاتا یا چند الفاظ ہی آگے پیچھے کر دیتا تو اس کی شامت آجاتی۔ انگریزی کا ماسٹر بہت نرم

دل تھا، پڑھاتے وقت وہ بچوں کی طرف گھور کر دیکھنے کا عادی نہ تھا، اس لیے وہ لڑکے جو گھروں سے تاریخ اور جغرافیہ رٹ کر نہیں آتے تھے، انگریزی کے گھنٹے میں پچھلے ڈیسکوں پر بیٹھ کر تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں کھول لیتے۔ اسی طرح حساب کے ماسٹر کے مقابلے میں اردو کا ماسٹر قدرے نرم دل تھا۔ اس لیے بعض لڑکے اردو کے گھنٹے میں اپنی ساتھیوں کی کاپیوں سے حساب کے سوال نقل کر لیتے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر صاحبان ہر سال تاریخ اور حساب کے ماسٹروں کی کارگزاری پر اظہار اطمینان فرمایا کرتے تھے۔

سکول کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے گاؤں کے ماحول سے سلیم کی دلچسپیاں کم نہ ہو سکیں وہ گھر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے اپنا بستہ کھولتا اور سکول کا کام کرتا، مجید اس کی کاپی سے حل کیے ہوئے سوال نقل کر لیتا۔ پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں سے باہر نکل جاتے غروب آفتاب کے وقت وہ گھر آتے، دادا کا حکم تھا کہ وہ نماز کے لیے مسجد میں آیا کریں۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کھانا کھاتے اور پھر وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ باہر نکل جاتے اور کھیتوں کی نرم مٹی پر کبڈی کھیلتے کبھی کبھی گاؤں کے نوجوان بھی چاندنی راتوں میں کبڈی کھیلا کرتے تھے اور بڑی عمر کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آجایا کرتے تھے یہ گاؤں افضل اور شیر سنگھ کی بدولت دیہاتی کھیلوں میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ کبھی کبھی پڑوس کے دیہات کے نوجوان بھی کھیل میں حصہ لینے کے لئے آتے تماشائیوں کی نگاہیں ایسے اجتماعات میں اسماعیل کو تلاش کرتیں اور جب اسماعیل آجاتا تو چودھری رمضان کا وہاں ہونا اشد ضروری خیال کیا

جاتا۔ کھیلنے والے کھیلتے، لیکن دیکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ اسماعیل پر مرکوز رہتی۔ جب کوئی قہقہہ بلند ہوتا تو کھیلنے والوں کی توجہ بھی اسماعیل کی طرف مبذول ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر چھوٹی عمر کے لڑکے الگ کھیلتے۔ سلیم، مجید کے گاؤں کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا اور اسے کبڈی کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی لیکن جب اسماعیل آ جاتا تو وہ کھیل کی بجائے قہقہوں میں شریک ہونے کے لیے اس کے قریب آ بیٹھتا۔

کچھ عرصہ سے اپنے گھر کے ماحول کے ساتھ سلیم کی دلچسپی اور زیادہ ہو چکی تھی۔ چچا افضل کی گھوڑی کا دوسرا بچھیرا اب قد آور گھوڑا بن رہا تھا اور جب سلیم پرائمری سکول میں پڑھا کرتا تھا تو افضل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میری گھوڑی نے اگر دوسرا بچھیرا دیا تو وہ تمہارا ہوگا۔ گھر میں سواری کے لیے اور گھوڑے بھی موجود تھے، لیکن اس بچھیرے کے ساتھ سلیم کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ گھر کے ہر آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اصطبل میں لے جاتا اور بچھیرے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ”دیکھو! اس کا رنگ کیسا ہے، اس کے بال کیسے ہیں۔ دیکھو یہ میری آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے“ چودھری رمضان کو عربی نسل کے گھوڑے پہچاننے میں خاص مہارت تھی سلیم بچھیرے کا رسا پکڑ کر اس کے گھر لے جاتا اور اس سے کہتا ”دیکھو چچا میرا گھوڑا عربی نسل کا ہے نا؟“ اور چودھری رمضان اپنی دانشمندی کا ثبوت دینے کے لیے اٹھ کر بچھیرے کے گرد ایک چکر لگاتا، پھر جھک کر اس کے سم دیکھتا، پھر اس کے کان ٹٹولتا، اس کی پیٹھ پر دو چار تھپکیاں دیتا اور بالآخر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر

کہتا ''بھئی ہے تو عربی'' اور سلیم خوشی سے پھولے نہ سماتا جب واپس آتا تو چودھری رمضان اسے آواز دے کر ٹھہرا لیتا اور کہتا ''دیکھو برخوردار! یہ بہت جلدی بڑھ رہا ہے تم اسے کیا کھلایا کرتے ہو؟''

''چچا میں اسے چنے کھلایا کرتا ہوں''

وہ کہتا ''چنے اچھے ہوتے ہیں لیکن اسے کہیں بھینس کا دودھ نہ پلا دینا!''

''بھینس کے دودھ سے کیا ہوتا ہے چچا؟''

''بڑی بے عزتی ہوتی ہے بیٹا! بھینس کے دودھ پینے والا گھوڑا کبھی کبھی سوار سمیت کیچڑ میں لیٹ جاتا ہے۔''

گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک مذاق ہاتھ آ گیا تھا وہ صرف اتنا کہہ دیتیں کہ سلیم تمہارے گھوڑے میں یہ نقص ہے اور سلیم آپے سے باہر ہو جاتا۔ ایک دن وہ سکول سے آیا گھر کی چند عورتیں چرخہ کات رہی تھیں اس کی چچی نے کہا ''سلیم میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھوڑے کے کان گدھے کی طرح بڑھتے جا رہی ہیں کہیں وہ بڑا ہو کر سچ مچ گدھا نہ بن جائے؟''

سلیم بستہ پھینک کر سیدھا مویشی خانے پہنچا وہ بچھیرے کے کانوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ امینہ اس کے قریب پہنچ کر ہنسنے لگی ''امینہ کی بچی ٹھہرو!'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف بھاگا امینہ چیختی چلاتی دادی کے قریب جا پہنچی۔

سلیم کی چچی نے پھر ہنستے ہوئے کہا ''کیوں سلیم! دیکھے اس کے کان؟'' اور سلیم نے کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر اس کے چرخے کا تکلا دوہرا کر دیا اور ہنستا ہوا

باہر نکل گیا۔

سکول جانے سے پہلے سلیم ہر روز امینہ سے کہا کرتا تھا ”دیکھو امینہ! اگر رات کو مجھ سے کہانی سننی ہے تو میرے گھوڑے کا خیال رکھنا!“ اور امینہ کہانی سننے کے شوق میں اس بات کا خیال رکھتی کہ سلیم کے گھوڑے کی کھرلی میں گھاس کم نہ ہو اور اس سامنے پانی کی بالٹی ہر وقت موجود رہے۔

یہ بچھیرا گھر کے آدمیوں اور بچوں سے جس قدر مانوس تھا، اسی قدر باہر کے آدمیوں سے نفرت کا اظہار کرتا تھا اگر کوئی اجنبی اسے دیکھنے کے لیے آتا تو وہ اسے کاٹنے یا دولتی مارنے کی کوشش کرتا، تاہم افضل کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی یہ عادت جاتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

ایک دن سلیم اور اس کے ساتھی سکول سے آ رہے تھے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ افضل اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر کھیت میں چکر لگا رہا تھا اور چودھری رمضان اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سلیم یہ دیکھتے ہی بھاگا اور مجید اس کے پیچھے ہو لیا۔ افضل کے قریب پہنچ کر سلیم نے بلند آواز میں کہا ”چچا جان! چچا جان!!“

افضل گھوڑا روک کر سلیم کی طرف متوجہ ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا ”ہم نے تمہارے

گھوڑ کو لا دو کر دیا ہے جاؤ! بھابی جان سے کہو کہ ہمیں مٹھائی کھلائیں"

سلیم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" چچا جان! آج میں بھی سواری کروں گا اس پر!"

افضل نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا" نہیں بیٹا! ابھی نہیں ابھی یہ بہت سرکش ہے میں چند دنوں میں اسے ٹھیک کر دوں گا آج تو یہ مجھے بھی گرا دینا چاہتا تھا!"

سلیم نے کہا" چچا جان میں نہیں گروں گا"

چودھری رمضان نے کہا" برخوردار! افضل ٹھیک کہتا ہے تم ضد نہ کرو!" سلیم نے مایوس ہو کر افضل کی طرف دیکھا اور سوال کیا" چچا جان! یہ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟"

" پندرہ بیس دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا اس کے بعد تمہیں اس پر چڑھنے کی اجازت ہو گی۔۔۔ اچھا بیٹا! اب تم اسے گھر لے جاؤ!"

سلیم نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنا بستہ مجید کے ہاتھ میں دے دیا۔

راستے میں مجید نے کہا" سلیم مجھے بھی چڑھنے دیا کرو گے اپنے گھوڑے پر؟"

سلیم نے کہا" میں نے چچا سے اسی لیے تو لیا ہے کہ ہم دونوں اس پر سواری کیا کریں"

مجید نے کہا" ہم کسی اور کو نہیں چڑھنے دیں گے۔ چچا افضل نے مجھ سے بھی وعدہ کیا ہے کہ اس سال ان کی گھوڑی جو بچھیرا دے گی، وہ مجھے ملے گا"

''لیکن مجھے اسے بھینس کا دودھ نہ پلانا!''

''واہ جی میں بھی کوئی چودھری رمضان ہوں''

سلیم نے کہا ''مجید! میں چچا افضل سے ڈرتا ہوں ورنہ آج ہی اس پر سواری کروں''

''نہیں نہیں! سلیم تم گر جاؤ گے!''

''نہیں! یہ گھوڑا مجھے کبھی نہیں گرائے گا!''

''میں تمہیں آج نہیں چڑھنے دوں گا اس پر چچا افضل مجھے بھی ماریں گے!''

سلیم نے کہا ''میں خود ہی آج اس پر سوار نہیں ہونا چاہتا ورنہ تم مجھے نہیں روک سکتے!''

''کیوں نہیں روک سکتا میں تمہیں روکوں گا!''

''بھلا تمہارا خیال ہے یہ مجھے گرا دے گا؟''

''ہاں!''

''اگر تم اس پر چڑھو تو تمہیں بھی گرا دے گا یہ؟''

''یہ مجھے کیسے گرا سکتا ہے!''

سلیم نے کچھ سوچ کر کہا ''اگر میں اسے تیز نہ بھگاؤں تو بھی مجھے یہ گرا دے گا؟''

مجید نے جواب دیا ''تم نہ بھگاؤ گے تو بھی یہ تیز بھاگے گا جانور کو یہ عقل تو نہیں ہوتی کہ اس پر ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے!''

سلیم نے بگڑ کر کہا ''میں بچہ نہیں ہوں''

مجید نے اطمینان سے جواب دیا ''چچا افضل نے تمھیں اسی لیے تو روکا ہے کہ تم ابھی بچے ہو۔ تم اتنے بڑے گھوڑے کی لگام بھی نہیں کھینچ سکتے۔''

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا اور مجید کو یقین ہو گیا کہ اب اگر اس نے زیادہ بات کی تو وہ اس کے ساتھ لڑ پڑے گا اس لیے وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

پانی کی کھائی کے کنارے سبز گھاس اگی ہوئی تھی گھوڑا سر جھکا کر گھاس کے تنکے نوچنے لگا، کھوئی عبور کرنے کے بعد چند قدم آگے جا کر مجید نے مڑ کر سلیم کی طرف دیکھا اور کہا ''آؤ سلیم!''

سلیم نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے کھائی میں ڈال دیا اور اچانک کنارے پر سے کود کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

مجید چلایا ''بے وقوف تم گر پڑو گے!''

گھوڑا کود کر باہر نکلا اور چند بار اچھلنے کودنے اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے بعد ایک طرف بھاگ نکلا سلیم نے اسے چمکارتے ہوئے باگ کھینچی گھوڑا رک گیا سلیم نے اسے دوبارہ کھائی کے قریب لا کر کہا'' دیکھا مجید! میں بچہ نہیں ہوں، میرے ہاتھ باگ کھینچ سکتے ہیں اور میں گروں گا بھی نہیں۔''

اور پیشتر اس کے کہ مجید کچھ کہتا، وہ گھوڑے کی باگ موڑ کر اسے ایڑ لگا چکا تھا، گھوڑا سرپٹ بھاگا اور آن کی آن میں چند کھیت دور نکل گیا۔ افضل نے دور سے اسے دیکھا، تو تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ

گئے وہ چلایا "سلیم اسے روکو! بیوقوف گر جاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔!" لیکن سلیم بہت دور جا چکا تھا کوئی آدھ میل دور جا کر سلیم نے گھوڑے کی باگ موڑ لی سلیم کو صحیح سلامت واپس آتا دیکھ کر افضل کا غصہ جا چکا تھا لیکن جب سلیم نے اسے قریب آ کر گھوڑا روکنے کی بجائے اس کی باگ دائیں طرف موڑ دی تو افضل اپنی پوری طاقت کے ساتھ چلایا "گھوڑے کو بائیں طرف موڑلو، آگے بہت بڑی کھائی ہے!"

کھائی میں نہر کا پانی بہتا تھا اور وہ قریباً چھ فٹ چوڑی اور دو فٹ گہری تھی، کنارے ذرا اونچے تھے، تاہم سلیم کو اس کے اوپر کودنے میں کوئی خطرہ نظر نہ آیا۔ چچا افضل کی گھوڑی کو اس نے کئی بار اس نالی پر اسے کودتے ہوئے دیکھا تھا اور مجید کی چھوٹے قد کی گھوڑی بھی اسے پھاند جایا کرتی تھی۔ چنانچہ سلیم نے گھوڑے کو موڑنے یا روکنے کی بجائے اس کی رفتار اور تیز کر دی۔

چودھری رمضان کا لڑکا جلال کھائی میں نہا رہا تھا وہ گھوڑے کی آہٹ سن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے شور مچانے لگا گھوڑا اچانک بدک کر ایک طرف مڑا سلیم اس کی ننگی پیٹھ پر توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑھک کر زمین پر آ رہا۔

گھوڑے سے گرنا سلیم کے لیے ایک معمولی بات تھی اس نے سواری کے شوق میں اس سے پہلے بھی کئی چوٹیں کھائی تھیں اور وہ ہر بار ہنستا ہوا اٹھا کرتا تھا لیکن اس دفعہ چچا افضل نے اسے اٹھایا تو وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ افضل شاید اسے غصے کی حالت میں پیٹ ڈالتا لیکن سلیم کا چہرہ دیکھ کر اس کا غصہ تشویش میں تبدیل ہو چکا تھا اس نے کہا "چوٹ تو نہیں آئی تمہیں؟"

"نہیں چچا جان!" سلیم نے اپنی کہنی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

افضل کو اب غصہ آ رہا تھا، اس نے اپنا لہجہ بدل کر کہا "بہت بیوقوف ہو تم!"

گھوڑا تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا چودھری رمضان اسے پکڑنے کے لیے بھاگا لیکن گھوڑے نے اس کی طرف دیکھتے ہی اپنے اگلے سم اٹھا لیے رمضان بدحواس ہو کر الٹے پاؤں پیچھے بھاگا۔ افضل نے اطمینان سے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور دوبارہ سلیم کے پاس آ کر کہا "لو اب اس پر پھر سوار ہو جاؤ!"

سلیم نے ندامت سے گردن جھکا لی افضل نے کہا "بس ایک بار گرنے سے ڈر گئے؟ اب چڑھتے کیوں نہیں اس پر؟ گھوڑے کے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ اس کا سوار بزدل ہے۔"

افضل نے سلیم کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ درد سے کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

افضل نے پریشان ہو کر کہا "تمہیں چوٹ آئی ہے سلیم؟"

سلیم نے جواب دیا "چچا ۔۔۔۔ میرا بازو ۔۔۔۔!"

چودھری رمضان نے سلیم کے قریب بیٹھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی فتویٰ دے دیا کہ بازو کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔

اتنی دیر میں کئی اور آدمی جمع ہو چکے تھے افضل نے گھوڑا کسی کے حوالے کیا اور سلیم کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کی سلیم اگرچہ رمضان کا فتویٰ سننے کے بعد بازو کی چوٹ کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ تاہم اس نے کہا "چچا! میں چل سکتا

ہوں۔‘‘

افضل نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر سہارا دیا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

گھر پہنچتے ہی سلیم کو بستر پر لٹایا گیا لیکن اپنے گرد خاندان اور پڑوس کی عورتوں کا ہجوم دیکھ کر وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا سلیم کی دادی ہاتھ میں دودھ کا کٹورا لیے التجا کر رہی تھی ’’بیٹا اسے پی لو! میرے لال اسے پی لو!‘‘ سلیم نے غصے میں ہاتھ مار کر کٹورا اس کے ہاتھ سے گرا دیا لیکن وہ دوسرا کٹورا بھر لائی سلیم نے مجبورا! چند گھونٹ پیے لیکن وہ بھرا ہوا کٹورا پلانے پر مصر تھی۔

☆☆☆☆☆

چودھری رحمت علی نے آ کر کہا ’’کیا شور مچا رکھا ہے تم نے بچوں کو چوٹیں لگا ہی کرتی ہیں سلیم کے بازو پر معمولی چوٹ آئی ہے، میں نے اسماعیل کو فجو پہلوان کے پاس بھیج دیا ہے وہ آ کر ابھی ٹھیک کر دے گا۔‘‘

لیکن دادی جان کو یہ سننا گوارا نہ تھا کہ سلیم کے جسم پر خراش آئے اور کوئی اسے معمولی بات کہہ کر ٹال دے اس نے کہا ’’آپ دیکھتے نہیں، بچے کا رنگ کس طرح پیلا ہو رہا ہے۔ میں اس منحوس گھوڑے کو گھر میں نہیں رہنے دوں گی!‘‘

سلیم نے اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ’’نہیں دادی جان! گھوڑے کا کوئی قصور نہیں وہ ڈر گیا تھا۔‘‘

رحمت علی نے کہا ’’اگر مرد تم عورتوں کا کہا مانتے تو گھوڑے پر کوئی سواری نہ کرتا

اور شاید بیلوں کو ہل میں جوتنے کی بجائے بھی وہ اپنے ہی گلے میں رسا ڈال لیا کرتے۔"

اتنے میں رمضان کی بیوی آ گئی اور بولی "ہائے میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا! جلال کا باپ کہتا ہے کہ سلیم کے بازو کی ہڈی بالکل ٹوٹ گئی ہے!"

یہ سنتے ہی دادی اماں نے آسمان سر پر اٹھا لیا پڑوس کی اور بہت سی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔

اسماعیل، فجو پہلوان کو لے کر آ گیا چودھری رمضان بھی ان کے ساتھ تھا۔ اور مصر تھا کہ بازو کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور اس کا علاج صرف شہر میں ہو سکے گا اور سلیم کی دادی اسے اپنے پوتے کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھ رہی تھی۔

فجو پہلوان نے اپنے سلیم کا بازو ٹٹول کر اسے درد سے کراہنے پر مجبور کیا۔ پھر ہلا جلا کر سلیم کی چیخیں نکالیں اس کے بعد گرم تیل کی مالش کی اور روئی باندھ دی۔

چودھری رحمت علی نے پوچھا "کیوں فجو کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟"

فجو نے تسلی دیتے ہوئے کہا "نہیں چودھری جی! جوڑ ذرا ہل گیا ہے۔ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں صبح پھر آؤں گا اسے چند دن کے لیے چلنے پھرنے کی اجازت نہ دیں، ورنہ جوڑ پھر ہل جائے گا۔"

رات کے وقت سلیم کو معلوم ہوا کہ دادی اماں نے نوکر کو حکم دے دیا ہے کہ وہ سلیم کے گھوڑے کے آگے چنے نہ ڈالے جب ماں نے سلیم کے آگے کھانا لا کر رکھا تو وہ روٹھ کر بیٹھ گیا ماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جھک کر آہستہ سے اس کے

کان میں کہا ''میں نے تمہارے گھوڑے کے لیے چنے بھجوا دیے ہیں۔''

سلیم نے کہا ''امی! دادی جان کہتی ہیں کہ وہ گھوڑے کو گھر سے نکال دیں گی؟''

ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''نہیں بیٹا! جب تمہارا بازو ٹھیک ہو جائے گا تو ان کا غصہ بھی اتر جائے گا۔''

☆☆☆☆☆

پیر ولایت شاہ کی اس علاقے میں بہت دھوم تھی امارت اور ولایت ان کے خاندان میں برسوں سے چلی آ رہی تھی ان کی زمینیں تھیں، باغات تھے لیکن لوگ جس بات پر بہت زیادہ مرعوب تھے، وہ ان کے خاندان کا قبرستان تھا جس کی تمام قبریں سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں ان کے جد امجد کے مزار کا گنبد پانچ میل سے دکھائی دیتا تھا۔

پیر ولایت شاہ چار بار میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئے تھے تاہم اپنے باپ کی بے وقت وفات پر وہ روحانی کاروبار سنبھالنے پر مجبور نہ ہو جاتے تو یقیناً علم کے دریائے ناپیدا کنار میں چند برس اور غوطے لگاتے۔ اب مریدوں کو پل صراط کے اوپر سے بخیر و عافیت گزارنے کا کام ان کے ذمہ تھا اور پیر ولایت شاہ پوری تن دہی سے اپنے فرائض پورے کر رہے تھے۔ وہ فرزندان آدم کو ارضی و سماوی تکالیف سے نجات دلانے کے لیے تعویذ لکھا کرتے تھے اور اپنی فرصت کے تلخ لمحات کو خوشگوار بنانے کے لیے شطرنج کھیلا کرتے تھے، بھنگ پیا کرتے تھے، بٹیر لڑایا کرتے تھے،

شادیاں کیا کرتے تھے اور شادیوں کے بعد طلاقیں دیا کرتے تھے۔

ان کے پاس آٹھ دس گھوڑے تھے۔ پانچ چھ خچر اور پندرہ بیس کتے تھے۔ سال میں ایک بار وہ شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ دورے پر نکلا کرتے تھے۔ تیس چالیس پیدل اور سوار چیلے ان کے ساتھ ہوتے، مریدوں کا حلقہ اس قدر وسیع تھا کہ انہیں ایک ایک دن میں کئی کئی ضیافتیں کھانا پڑتیں۔ ہراول کی ایک ٹولی پہلے ہی مریدوں کو خبردار کر دیتی کہ پیر صاحب آج تمہارے ہاں قیام کریں گے۔

پیر صاحب کا طعام تو خیر اتنی بڑی مصیبت نہ تھی لیکن جس بدنصیب کے ہاں وہ ایک دو دن قیام کرتے اس کا دیوالہ نکل جاتا۔ اس کی لہلہاتی گندم گھوڑوں کی نذر ہو جاتی۔ اس کے باغ کا کچا پکا پھل پیر صاحب کے چیلوں کے شکم کا ایندھن بن جاتا رخصت کے وقت پیر صاحب نذرانہ وصول کرتے اور چیلے مرید کے گھر سے فالتو برتن اور کپڑے اٹھا لیتے۔

جب پیر صاحب دوسری گاؤں کا رخ کرتے تو مرید کسی بلند ٹیلے پر کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا اور کہتا "یا پروردگار! آندھی آئے، طوفان آئے، زلزلہ آئے، سورج سوا نیزے پر آئے لیکن پیر ولایت شاہ دوبارہ نہ آئے۔"

کچھ عرصہ سے علاقے کے سمجھ دار لوگوں میں پیر ولایت شاہ کے متعلق عام بے چینی پائی جاتی تھی اور اس بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ پیر صاحب ایک لڑکی کو آسیب سے نجات دلا کر خود اس کے لیے آسیب بن گئے تھے۔ تاہم دیہات کے ان پڑھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیر ولایت شاہ کے زیر اثر تھی۔ تکیوں میں بھنگ، پوست اور

چرس پینے والے سائیں لوگ انہیں اپنا پیشوا مانتے تھے۔ ان لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا نے ولایت شاہ کی زبان میں وہ تاثیری ہے کہ وہ جسے بد دعا دیتا ہے، اس کے مویشی مر جاتے ہیں۔ فصل برباد ہو جاتی ہے۔ عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں اور بچے طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ لوگوں نے ولایت شاہ کو جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ خدا کی یہ عجیب وغریب مخلوق جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتی، ان کے اشاروں پر ناچتی ہے، ایک جن ان کے لیے رات کے وقت بلا ناغہ پھل اور مٹھائیاں لے کر آتا ہے، دوسرا ان کا بستر بچھاتا ہے اور تیسرا ان کے پاؤں دباتا ہے۔ جب ولایت شاہ جلال میں آتے ہیں تو ایک خوفناک جن کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ فلاں شخص کا گلا گھونٹ آؤ اور وہ کسی حیل و حجت کے بغیر ان کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈہ ان دیہات میں زیادہ موثر ہوتا جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہوتی۔

مردوں کی نسبت دیہاتی عورتیں پیر ولایت شاہ سے کہیں زیادہ متاثر تھیں۔

ولایت شاہ کے پاس قسم قسم کے تعویذ اور گنڈے تھے اور عورتوں کو ہمیشہ ان چیزوں کی ضرورت رہتی تھی بیمار بچوں کی صحت کے لیے، آسیب زدہ لڑکیوں اور لڑکوں کی نجات کے لیے اور دوسری شادی کی خواہش کرنے والے خاوند کو راہ راست پر لانے کے لیے ان تعویذوں اور گنڈوں کی ضرورت رہتی تھی۔

☆☆☆☆☆

سلیم کے گاؤں میں چند آدمی پیر ولایت شاہ کے مرید تھے۔ ان مریدوں میں چودھری رمضان ان پر دل و جان سے فدا تھا اور اس کی عقیدت بلاوجہ نہ تھی، وہ جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے بہت پریشان رہتا تھا اور اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے ولایت شاہ نے اسے تعویذ دیا تھا جنوں اور بھوتوں کے بعد وہ پولیس سے بہت ڈرتا تھا، چنانچہ اس کے گھر سے پولیس کو دور رکھنے کے لیے ولایت شاہ نے اسے دوسرا تعویذ دیا تھا یہ دونوں تعویذ وہ ہمیشہ اپنے گلے میں باندھے رکھتا تھا۔

چودھری رمضان کے اصرار پر ایک دفعہ پیر ولایت شاہ اس گاؤں آئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے قسم کھالی تھی کہ وہ دوبارہ اس گاؤں میں قدم نہیں رکھیں گے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں سلیم کا والد چودھری علی اکبر بھی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ ولایت شاہ کو معلوم نہ تھا کہ اس گاؤں میں اس کی علی اکبر سے ملاقات ہوگی ورنہ وہ کبھی نہ آتا۔ علی اکبر اسے طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا اس نے دیکھتے ہی کہا ''ارے ولایت! میں تو سمجھتا تھا کہ تم ابھی تک سکول میں ہوگے۔۔۔ سناؤ اس سال کتنی شادیاں کی ہیں؟''

ایک دیرینہ واقف کار کی طرف سے یہ صرف ابتدا تھی علی اکبر نے سکول کی باتیں شروع کر دیں لوگ ہنس رہے تھے لیکن مرید انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ رمضان کو پیچ و تاب کھاتا دیکھ کر اسماعیل کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اس نے کہا ''جنوں نے پیر صاحب کو پھل اور مٹھائیاں کھلا کر بہت موٹا کر دیا ہے۔ آج ان کے گھوڑے کی کمر دوہری ہو رہی تھی۔ ابھی خدا کے فضل سے یہ جوان ہیں لیکن خدا کے حضور پہنچتے پہنچتے

ان کا وزن ڈیڑھ دو من اور زیادہ ہو جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ پل صراط سے کیسے گزریں گے ان کا بوجھ اٹھانے کے لیے تو مال گاڑی کی ضرورت پڑے گی!''

ولایت شاہ کے دماغ پر اگر بھنگ کا نشہ غالب نہ ہوتا تو وہ یقیناً جلال میں آجاتے تاہم چودھری رمضان کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اس نے کہا ''اسماعیل تحصیل دار تو بھلا پیر جی کا لنگوٹیا ہے لیکن تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

بزرگوں کے منہ سے کبھی بری دعا بھی نکل جاتی ہے!

اتنی دیر میں چودھری رحمت علی رمضان کے صحن میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا ''اسماعیل! تم بڑے بے شرم ہو، ہر ایک سے مذاق شروع کر دیتے ہو۔''

علی اکبر نے کہا ''ابا جی! اسماعیل تو ان کے فائدے کی بات کہہ رہا تھا۔ پیر جی بہت زیادہ موٹے ہو گئے ہیں، ان کو ورزش کرنی چاہیے۔''

رحمت علی کو بھی ولایت شاہ سے کوئی عقیدت نہ تھی تاہم وہ اس کے بزرگوں سے مرعوب تھا اور اسے یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس خاندان کا گدی نشین خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو، اس کے بچوں کو بد دعا دے کر جائے۔ اس نے اپنے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے نکال دیا اور پیر جی سے کہا ''شاہ جی! آپ غصہ نہ کریں میرے دل میں آپ کے بزرگوں کی بڑی عزت ہے۔''

شاہ جی نے غصے کا اظہار تو نہ کیا لیکن دل میں یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ وہ آئندہ اس گاؤں میں نہیں آئیں گے۔۔۔ چند دنوں کے بعد چودھری رحمت علی کے دو بیل چوری ہو گئے تو رمضان یہ کہتا پھرتا تھا کہ یہ ولایت شاہ کی بد دعا کا نتیجہ ہے، دو دن

کے بعد یہ بیل مل گئے تو رمضان نے یہ مشہور کر دیا کہ شاہ صاحب نے رحمت علی کے لڑکوں کا قصور معاف کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

عام حالات میں شاید ولایت شاہ دوبارہ اس گاؤں میں تشریف نہ لاتے لیکن چند سال بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث انہیں آنا ہی پڑا۔

جس دن سلیم گھوڑے سے گرا، اس سے تیسرے روز گاؤں کے لوگ ایک نئے موضوع پر تبصرے کر رہے تھے چودھری رمضان اپنی زندگی کی سب سے بڑی پریشانی کا سامنا کر رہا تھا عام طور پر گاؤں کے لوگ اس کی پریشانیوں پر قہقہے لگایا کرتے تھے لیکن اس دفعہ بعض لوگ اس غیر متوقع واقعہ پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔

بات یہ ہوئی کہ چودھری رمضان نے کچھ گندم دھوپ میں سوکھنے کے لیے اپنے کوٹھے کی چھت پر ڈال دی تھی۔ اس کوٹھے کے پچھواڑے کچھمن سنگھ کی حویلی تھی۔ کچھمن سنگھ کی حویلی کا جو کونا رمضان کے کوٹھے کے ساتھ لگتا تھا وہاں اس نے پیال کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ پیال کا یہ ڈھیر سال بھر میں بارشوں کی وجہ سے تھوڑا بہت دب جاتا تو کچھمن سنگھ اس پر اور پیال ڈال دیتا۔ کچھمن سنگھ اس ڈھیر سے کئی کام لیا کرتا تھا سردیوں کی دھوپ میں وہ اس ڈھیر پر بیٹھ کر چارپائی کا بان بٹا کرتا تھا۔ برسات میں جب حویلی میں کیچڑ ہوتی تو وہ اپنی بکریوں کے لیے وہاں چارہ ڈال دیا کرتا تھا

گرمیوں کی راتوں میں جب چودھری رمضان اپنے کوٹھے پر سویا کرتا تھا تو وہ اس کے پاس پہنچ کر گپیں مارنے کے لیے پیال کے اس ڈھیر سے سیڑھی کا کام لیا کرتا تھا گاؤں میں اگر کسی کو پیال کی ضرورت ہوتی تو بلا تکلف یہاں سے لے سکتا تھا اس لیے چھمن سنگھ کی کوشش ہوتی کہ اس ڈھیر کی سطح رمضان کے کوٹھے سے نیچے نہ ہونے پائے۔

جس دن رمضان نے کوٹھے پر گندم ڈالی تھی، چھمن سنگھ نے اپنی بکریاں باندھ لی تھیں لیکن اس کا بھینسا کسی طرح کھل گیا اور خدا معلوم اسے کیا سوجھی کہ وہ پیال کے ڈھیر پر سے گزرتا ہوا چودھری رمضان کے کوٹھے پر جا پہنچا۔

چودھری رمضان اندر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ اوپر کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی مٹی گری اور اس کے ساتھ ہی چھت سے یکے بعد دیگرے دو سیاہ ٹانگیں نمودار ہوئیں۔ بھینسے کی ٹانگیں۔

میاں بیوی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے باہر سے جلال اور اس کی بہن نے دہائی مچا دی ''ماں! چھمن سنگھ کا بھینسا کوٹھے پر چڑھ گیا۔''

رمضان کسی بہت خطرناک جس کا تصور کر رہا تھا۔ وہ ہانپتا، کانپتا اور لرزتا ہوا باہر نکلا تھوڑی دیر دم لینے کے بعد وہ لکڑی کی سیڑھی سے اوپر چڑھا۔ چھمن سنگھ کے بھینسے کی گردن چھت کے ساتھ لگی ہوئی تھی اس کی اگلی دو ٹانگیں نیچے دھنس گئی تھیں۔ پچھلی ٹانگیں ابھی تک پیال کے ڈھیر پر تھیں۔ بے بسی اور انکساری کا یہ پیکر مجسم اپنی

خاموش نگاہوں سے چھت کی ناپائیداری کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔

چودھری رمضان نے تھوڑی دیر میں سارا گاؤں اکٹھا کر لیا بچوں اور نوجوانوں نے قہقہے لگائے لیکن بڑوں کے لیے یہ انہونی بات تھی بھینسے کو اس مصیبت سے نجات دلائی گئی اس کے بعد یہ سوال زیر بحث تھا کہ آدمؑ کے زمانے سے لیکر آج تک بھینسا کسی کوٹھے کی چھت پر نہیں چڑھا لیکن آج ایسا کیوں ہوا؟

گاؤں میں ایسے سوالات کا جواب صرف سائیں اللہ رکھا دیا کرتا تھا اس نے کہا ''یہ منگل کا دن ہے۔ بھینسا رمضان کے کوٹھے پر چڑھا ہے اور بھینسا چھمن سنگھ کا ہے اب خدا افضل کرے، مجھے ڈر ہے کہ اول تو سارے گاؤں پر ورنہ ان دوگھروں پر ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی!''

رمضان اور چھمن سنگھ سے پہلے ان کی بیویوں نے اس بات کی تائید کی چھمن سنگھ کی بیوی اسے کہتی تھی کہ یہ بھینسا مفت کسی کو دے دو اور رمضان کی بیوی اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ تم ابھی ولایت شاہ کے پاس جاؤ!

رات کے وقت جلال کے پیٹ میں درد ہوا اور چھمن سنگھ کے کوٹھے پر دو کتے روتے رہے۔ چنانچہ پچھلے پہر رمضان نے گھر سے تیس روپے لیے اور چھمن سنگھ نے اپنا بھینسا کھول لیا اور دونوں ولایت شاہ کی طرف چل دیے چھمن سنگھ کو راستے میں ایک خریدار مل گیا اور اس نے تیس روپے کے عوض بھینسا اس کے پاس فروخت کر دیا۔ ولایت شاہ کے پاس پہنچ کر رمضان نے بیس روپے ان کے آگے رکھ دیے۔ چھمن سنگھ اس سے زیادہ فیس ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھا چنانچہ اس نے بھی بیس

دے دیے اور دس شراب کے لیے اپنے پاس رکھ لیے۔

دونوں نے ہاتھ باندھ کر اپنی مصیبت کا حال سنایا ولایت شاہ اس وقت بھنگ کے نشہ میں تھا۔اس نے کہا ''اچھا بھئی! میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ اس گاؤں میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھوں گا، پر اب تم آ گئے ہو تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔وہ جن جس نے بھینسا اٹھا کر تمہاری چھت پر رکھ دیا تھا معمولی جن نہیں۔۔۔۔تم نے بہت اچھا کیا، اس بھینسے کو بیچ دیا اب وہ جس کے گھر جائے گا، اس کا ستیاناس ہو گا۔''

☆☆☆☆☆

شام کے چار بجے کے قریب جب چودھری رمضان اور لچھمن سنگھ پیر ولایت شاہ کو لے کر گاؤں کے قریب پہنچے تو افضل کھیتوں میں گھوڑا دوڑا رہا تھا۔پیر ولایت شاہ اپنا گھوڑا روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس کے ساتھ چار مجاور تھے۔انہوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں۔

پیر ولایت شاہ نے رمضان سے پوچھا ''یہ گھوڑے والا کون ہے؟''

اس نے جواب دیا ''یہ افضل ہے، چودھری رحمت علی کا لڑکا!''

''کتنے کا خریدا ہے یہ گھوڑا؟''

''پیر جی یہ ان کے گھر کا بچھیرا ہے۔خالص عربی نسل کا ہے دیکھیے اب وہ کھائی پر سے چھلانگ لگائے گا''

جس جگہ سے افضل گھوڑے کو چھلانگ لگوا رہا تھا، وہاں سے کھائی کا پاٹ کافی

چوڑا تھا۔ گھوڑے کی چند چھلانگیں دیکھنے کے بعد ولایت شاہ نے کہا ”کیوں چودھری رمضان! وہ اس گھوڑے کو بیچتے ہیں یا نہیں؟“

رمضان نے جواب دیا ”پیر جی! اگر آپ کو خریدنے کا شوق ہو تو شاید ان کی دوسری گھوڑی کا سودا ہو جائے وہ اسی بچھیرے کی بہن ہے۔ بہت تیز بھاگتی ہے، ہے بھی بہت شریف۔ اس گھوڑے کو انہوں نے ابھی ابھی لگام دی ہے۔ ابھی تک یہ شوخ ہے دو تین دن ہوئے اس نے تحصیل دار کے لڑکے کو گرا دیا تھا۔“

لیکن پیر صاحب فیل قامت ہونے کے باوجود سواری کے لیے شوخ جانور پسند کرتے تھے انہوں نے کہا ”گھوڑیاں میرے پاس بہت ہیں، تم اس گھوڑے کا سودا کروانے کی کوشش کرو!“

چودھری رمضان نے آگے بڑھ کر آواز دی ”افضل! افضل! بھئی ادھر آنا!“

لیکن افضل رمضان کی آواز سننے سے پہلے کھائی پر سے کود کر گھوڑے کی باگ گاؤں کی طرف موڑ چکا تھا۔

جب رمضان، ولایت شاہ کے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا تو افضل گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑ کر اپنی حویلی سے باہر نکلا۔

اس نے پیر صاحب کو دیکھ کر کہا ”پیر صاحب! السلام علیکم!“

پیر صاحب نے گرمجوشی سے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا ”بھئی چودھری ہم دیر تک تمہارا گھوڑا دیکھتے رہے لیکن تم نے ہماری طرف توجہ ہی نہ دی بھئی گھوڑا بھی اچھا ہے اور سوار بھی اچھا ہے چودھری علی اکبر یہیں ہے؟“

''نہیں جی، شاید اگلے مہینے آ ئیں''

''چودھری رحمت علی کہاں ہیں؟''

''وہ شہر گئے ہوئے ہیں، شام تک آ جائیں گے''

رمضان نے کہا ''پیر جی! بڑے چودھری لڑکوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے افضل جو بات کرے گا، انہیں منظور ہو گی''

افضل نے کہا ''کیا بات ہے چودھری رمضان؟''

پیر صاحب نے رمضان کو گھور کر دیکھا لیکن رمضان ایسے معاملات میں تمہید کا قائل نہ تھا اس نے کہا ''بھئی بات یہ ہے کہ پیر صاحب کو تمہارا گھوڑا پسند آ گیا ہے اب تم یہ بتاؤ کہ لو گے کیا؟''

افضل کے لیے یہ ایک گالی تھی، تاہم اس نے پیر صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے کہا ''یہ میرے بھتیجے کا ہے۔''

لچھمن سنگھ نے کہا ''بھئی اب پیر جی بچے کے ساتھ تو بات نہیں کریں گے!''

افضل نے کہا ''پیر جی یہ گھوڑا آپ کے کام کا نہیں اور ہم اسے بیچنا بھی نہیں چاہتے''

ولایت شاہ نے کہا ''بھئی ہم ادھار نہیں کرتے، نقد قیمت دیں گے!''

افضل فطرتاً شرمیلا تھا۔ وہ پیر صاحب کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پیر صاحب قیمت چکانے پر بضد تھے اور رمضان اور لچھمن سنگھ پیر جی کی وکالت کر رہے تھے غلام حیدر اور اسماعیل بھی گھر سے نکل آئے اور گاؤں کے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ سلیم

کو مجید نے خبردار کر دیا اور وہ اپنا بازو گلے کے ساتھ لٹکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

ولایت شاہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی پسند کی کسی شے پر دوسروں کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہ گھوڑا خوبصورت تھا لہٰذا اس کا صحیح مقام ان کا اصطبل تھا۔ وہ یہ اعتراض سننے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس کے ساتھ افضل کے بھتیجے کو دلچسپی ہے اور اگر یہ بیچ ڈالا گیا تو ایک معصوم لڑکے کا دل دکھے گا افضل اور اس کے بھائیوں کو اس کی ضد پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ ان کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری رمضان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ بات نا قابل برداشت تھی کہ پیر جی دوسری دفعہ اس کے گاؤں سے ناراض ہو کر جائیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے پیر جی کو ناراض نہ کرو!

سلیم حیران تھا کہ اس کے گھوڑے کے متعلق بحث ہو رہی ہے لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

جب ولایت شاہ کو ٹالنا بہت مشکل ہو گیا تو اسماعیل نے کہا ”پیر جی! اگر اسی طرح کسی کو آپ کی گھوڑی پسند آ جائے تو آپ بیچ دیں گے؟“

پیر جی نے بگڑ کر کہا ”اگر کوئی قیمت دینے والا ہو تو میں ابھی اپنی گھوڑی بیچنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ یہ خریدنے والے کی ہمت کی بات ہے اس کی قیمت چار سو روپیہ ہے۔“

اسماعیل نے کہا ”اگر آپ کی گھوڑی کی قیمت چار سو روپیہ ہے تو ہمارے

گھوڑے کی قیمت پانچ سو روپیہ ہے، اگر آپ میں ہمت ہے تو خرید لیں!''

پیر صاحب کا جوش وخروش تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا انوہں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا ''اچھا تمہاری طرف سے پانچ سو روپے کی بات پکی ہوئی اگر مجھ میں ہمت ہوئی تو میں خرید لوں گا، ورنہ تمہارا گھوڑا تمہیں مبارک ہو چلو چودھری رمضان!''

پیر صاحب نے رمضان کے گھر پہنچ کر اپنی مٹھی میں خشک مٹی اٹھائی، کچھ پڑھنے کے بعد اس پر پھونک ماری اور رمضان سے کہا ''یہ مٹی اپنے کوٹھے کی چھت پر بکھیر دو'' پھر لچھمن سنگھ کو ایک تعویذ لکھ کر دیا اور کہا ''اسے آدھی رات کے وقت اپنی حویلی میں دو بالشت گہرا گڑھا کھود کر دبا دینا'' اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بھنگ پی، افیون کھائی اور بستر پر لیٹ کر حقے کی نے منہ میں ٹھونس لی چند کش لگانے کے بعد انہوں نے کہا ''رمضان، تمہیں عربی نسل کے گھوڑے کی پہچان ہے؟''

رمضان نے قدرے تذبذب کے بعد جواب دیا ''پیر جی! یہ گھوڑا تو واقعی عربی نسل کا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بیچنا نہیں چاہتے۔''

''لیکن اب تو وہ بیچنے پر تیار ہو گئے ہیں''

''نہیں پیر جی، ان کا خیال ہے کہ آپ قیمت سے ڈر جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے پانچ سو بتا دیا ہے۔''

پیر جی نے اچانک اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ''میں پانچ سو روپیہ اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔''

''ہاں پیر جی، پانچ سو روپیہ آپ کے لیے کیا چیز ہے!''

''اچھا جاؤ، ان سے بات پکی کرو، میں صبح گھوڑے کو اچھی طرح دیکھوں گا، اگر اس میں کوئی نقص نہ ہوا تو میں کل ہی پانچ سو روپیہ ادا کروں گا۔''

☆☆☆☆☆

برگد کے درخت کے نیچے لوگ ابھی تک جمع تھے رمضان کا پیر موضوع بحث تھا۔ اس کے موٹاپے، اس کی مونچھوں کی لمبائی اور اس کی دستار کے طرے پر خیالات کا اظہار ہو رہا تھا چودھری رمضان بھاگتا ہوا آیا ''چودھری رحمت علی کہاں ہے؟'' اس نے کہا

چودھری رحمت علی نے حویلی کے پھاٹک سے نکلتے ہوئے کہا ''کیوں چودھری کیا بات ہے؟''

رمضان نے کہا ''مجھے پیر جی نے بھیجا ہے''

اسماعیل نے کہا ''بھئی ہم نے پیر صاحب کو قیمت بتا دی ہے''

رحمت علی نے کہا ''کس کی قیمت؟''

اسماعیل نے کہا ''ابا جی! رمضان کا پیر آیا ہے، وہ سلیم کا گھوڑا خریدنا چاہتا ہے افضل نے اسے بہت ٹالا لیکن یہ بھنگ کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے میں نے تنگ آ کر کہا کہ اگر گھوڑا خریدنے کا شوق ہے تو لاؤ پانچ سو روپیہ! پیر جی یہ سن کر چپکے سے چل دیے۔ اب انہوں نے رمضان کو آپ کے پاس بھیجا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

اور بھنگ پلا دی ہے۔''

رمضان نے اسماعیل کو جواب دینے کی بجائے رحمت علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''چودھری جی! راجہ کے گھر موتیوں کا کال نہیں ہے۔ پیر جی کہتے ہیں کہ وہ صبح آ کر گھوڑے کو دیکھیں گے اور اگر گھوڑے میں کوئی نقص نہ ہوا تو وہ کل ہی آپ کو پانچ سو روپیہ ادا کر دیں گے انہیں خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ پانچ سو روپیہ کیا چیز ہے!''

جس زمانے میں گندم ڈیڑھ روپے من تھی، پانچ سو روپیہ معمولی بات نہ تھی محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا لیکن اسماعیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''چودھری رمضان! سچ کہو، کتنی بھنگ پی ہے تمہارے پیر نے؟''

رحمت علی نے اسماعیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا ''اسماعیل! تم ہر ایک کا مذاق نہ اڑایا کرو!'' پھر وہ چودھری رمضان کی طرف متوجہ ہوا ''جاؤ چودھری رمضان! اگر اسماعیل نے پانچ سو کے عوض گھوڑا بیچنے کا وعدہ کیا ہے تو صبح پیر صاحب کو لا کر دکھا دینا۔''

رحمت علی یہ کہہ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔ سلیم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ بلا ٹل گئی لیکن رمضان کی باتیں سن کر اس کا چہرہ پھر مرجھا گیا۔

افضل نے سلیم کی طرف دیکھا اور پھر اسماعیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''اسماعیل ولایت شاہ کے پاس پیسہ بہت ہے اگر وہ ضد پر آ گیا تو یہ بری بات ہو گی سلیم دو تین بار رو چکا ہے!''

اسماعیل نے کہا ''ارے یہ رمضان کی باتیں ہیں''

غلام حیدر نے کہا ''نہیں اسماعیل، سائیں اللہ رکھا کہتا ہے، کہ پیر صاحب کا اگر کسی چیز پر دل آ جائے تو وہ پیسوں کی پروا نہیں کرتے انہوں نے ایک کتا ساٹھ روپے میں خرید لیا تھا۔''

اسماعیل نے اٹھ کر سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''بیٹا! تم فکر نہ کرو اول تو صبح تک پیر جی کا نشہ اتر جائے گا اور اگر اس نے یہ گھوڑا خرید ہی لیا تو میں پانچ سو روپے میں تمہارے لیے وہ گھوڑا لاؤں گا کہ دنیا دیکھے گی!''

سلیم نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ میں اپنا گھوڑا نہیں دوں گا۔ یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔''

☆☆☆☆☆

رات کے وقت چونکہ دادا اور چچا یہ وعدہ نہ کر سکے کہ وہ صبح پیر جی کو اصطبل کے قریب نہیں آنے دیں گے، اس لیے سلیم نے کھانا نہ کھایا۔

دادی اماں جسے سلیم کو چوٹ لگنے کے بعد اس گھوڑے سے بے حد نفرت ہو چکی تھی اب ''کالے منہ والے پیر'' اور رمضان کو برا بھلا کہنے کے بعد اسماعیل اور افضل کو کوس رہی تھی۔

چودھری رحمت علی اپنے فیصلوں کی بڑی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور ان کا آخری فیصلہ یہی تھا کہ اگر ولایت شاہ نے خود اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا تو وہ گھوڑا

فروخت کرنے پر مجبور ہوں گے۔

ماں، دادی اور چچیوں کے اصرار کے باوجود سلیم نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ چپکے سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

پچھلے پہر جب گھر کی عورتیں چرخہ کاتنے اور دودھ بلونے کے لیے اٹھیں تو سلیم کی ماں کو اس کا خالی بستر نظر آیا۔ وہ لالٹین ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگی۔ سلیم کی چچی نے اسماعیل کو جگایا۔ اسماعیل لالٹین پکڑ کر اسے باہر کی حویلی میں تلاش کرنے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا ''چلو تمہیں سلیم کو دکھاتا ہوں۔''

سلیم کی ماں نے پوچھا ''فضل کے پاس ہوگا؟''

''نہیں''

''تو پھر کہاں ہے؟''

''چلو میں تمہیں دکھاتا ہوں مجھے ڈر ہے کہ رات اسے سردی نہ لگ گئی ہو!''

سلیم کی ماں اور چچیاں مزید سوالات پوچھے بغیر اسماعیل کے ساتھ چل پڑیں۔

اسماعیل نے مویشی خانے کے اندر داخل ہو کر انہیں لالٹین کی روشنی دکھائی، سلیم گھوڑے کے سامنے کھرلی میں بیٹھا پچھلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ سلیم کی ماں مامتا سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی لیکن گھوڑے کے تیور دیکھ کر اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اسماعیل نے کہا ''بھابی جی آپ آگے مت جائیں اس وقت گھوڑا اپنے مالک کی

رکھوالی کر رہا ہے یہ مجھے بھی سلیم کے قریب نہیں جانے دیتا۔‘‘

’’سلیم! سلیم!! ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور سلیم جیسے خواب میں بول رہا تھا‘‘ نہیں نہیں، یہ میرا ہے، یہ میرا ہے۔

’’سلیم! سلیم!!‘‘ ماں کی آواز حلق میں اٹک گئی اس کی آنکھوں میں آنسو اٹڈ آئے۔

سلیم، ابھی تک خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ کہ افضل آ گیا ’’کیا ہو رہا ہے یہاں؟‘‘ اس نے کہا

اسماعیل نے کہا ’’افضل آگے بڑھ کر سلیم کو اٹھاؤ۔ مجھے تو یہ گھوڑا اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔‘‘

’’ارے سلیم یہاں سو رہا ہے؟‘‘

’’سلیم شاید ساری رات یہاں رہا ہے۔‘‘

افضل آگے بڑھا گھوڑے نے نتھنوں سے ’’کھر رکھر ر‘‘ کی آواز نکالی اور اس کے جسم کے ساتھ سر رگڑنے لگا۔ افضل نے سلیم کو جھنجھوڑ کر جگایا اور اٹھا کر گلے لگالیا۔

اس کے بعد ماں اور چچیاں اسے یکے بعد دیگرے سینے سے چمٹا رہی تھیں۔

جب یہ گھر میں داخل ہوئے تو دادی اماں باہر نکلنے کے لیے اپنا جوتا تلاش کر رہی تھیں سلیم کو دیکھتے ہی انھوں نے کہا ’’ہے ہے ایسے پیر کو خدا غارت کرے، میرا بیٹا ساری رات سردی میں بیٹھا رہا ہے!‘‘

اس کے بعد سلیم کو کم از کم اس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ خاندان کی بھاری

اکثریت اس کے ساتھ ہے۔

نماز کا وقت ہو چکا تھا سلیم کی ماں نے اس سے کہا "بیٹا! اب وضو کر کے نماز پڑھو اور خدا سے دعا کرو" اور سلیم نماز پڑھنے کے بعد انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دعا مانگ رہا تھا "یا اللہ! میرا گھوڑا نہ جائے یا اللہ رمضان کے پیر کی بھنگ کا نشہ اتر جائے۔"

اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اسے نیند آ گئی وہ سہانے اور میٹھے سپنے دیکھ رہا تھا وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اسے گندم کے لہلہاتے کھیتوں سے گزرنے والی پگڈنڈیوں پر بھگا رہا تھا۔ سکول کے لڑکے اس کے گرد جمع تھے اور وہ انہیں کہہ رہا تھا "دیکھو میرا گھوڑا!"

"سلیم اٹھو! سلیم! سلیم اٹھو!" اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں کھڑکی سے سورج کی روشنی آ رہی تھی۔ مجید نے کہا "سلیم! جلدی چلو، رمضان کا پیر تمہارا گھوڑا دیکھنے آ رہا ہیں میں ابھی ان کے گھر سے آ رہا ہوں"

سلیم اس کے ساتھ ننگے پاؤں اصطبل کی طرف بھاگا اتنی دیر میں ولایت شاہ حویلی کے پھاٹک میں کھڑا اس کے دادا سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا "چودھری میں نے آدمی روپے لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔"

اسماعیل نے جھک کر سلیم کے کان میں کہا "بیٹا! فکر نہ کرو، میں نے پیر کا علاج سوچ لیا ہے۔ تم جا کر اسی طرح آنکھیں بند کر کے کھرلی میں بیٹھ جاؤ!"

سلیم نے سراپا التجا بن کر کہا "پھر کیا ہوگا چچا؟"

''پھر کچھ نہیں ہوگا انشاءاللہ پیر جی خالی ہاتھ جائیں گے بس اب تم جلدی کرو!''

سلیم بھاگتا ہوا اصطبل میں چلا گیا۔

چودھری رحمت علی نے کہا ''چلیں بیٹھک میں بیٹھتے ہیں''

رمضان نے کہا ''پیر جی ذرا گھوڑا دیکھنا چاہتے ہیں''

چودھری رحمت علی نے افضل کو آواز دی لیکن اسماعیل نے آگے بڑھ کر کہا

''ابا جی! افضل باہر چارہ کاٹنے کے لیے چلا گیا ہے۔۔۔۔۔میں دکھا دیتا ہوں پیر جی کو گھوڑا۔۔۔۔آؤ پیر جی!''

پیر جی رمضان کے ساتھ اصطبل میں داخل ہوئے گھوڑے نے انہیں دیکھ کر کان کھڑے کر لیے۔ رمضان جس قدر گھوڑوں کی عربی نسل پہچاننے میں ماہر تھا اسی قدر ان سے دور رہنا پسند کرتا تھا اور اس گھوڑے کے ساتھ اس کی ویسے بھی نہیں بنتی تھی اسماعیل دروازے سے آگے نہ بڑھا رمضان نے کہا ''پیر جی گھوڑا ذرا خطرناک ہے۔''

پیر جی نے کہا ''بھئی ہم نے بڑے بڑے خطرناک گھوڑے دیکھے ہیں، یہ کیا ہے؟''

پیر جی بے تکلفی سے آگے بڑھے۔ معاً ان کی نظر سلیم پر پڑی وہ چچا کے ارشاد کی تعمیل میں آنکھیں بند کیے کھرلی میں بیٹھا تھا ''ارے یہ کون ہے؟'' پیر جی نے کہا

رمضان نے جواب دیا ''یہ چودھری رحمت علی کا پوتا ہے اور یہ گھوڑا بھی اسی کا ہے۔''

پیر جی نے کہا ”ارے بھائی یہ تو بچوں کے ساتھ بھی ہلا ہوا ہے، اسے کون خطرناک کہتا ہے۔“

پیر جی بے پروائی سے آگے اور انہوں نے سلیم کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”کیوں برخوردار۔۔۔!“

پیر جی اپنا فقرہ پورا نہ کر سکے سلیم کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ گھوڑے نے ان کے فربہ سینے کا فالتو گوشت جو چلتے وقت اوپر نیچے اچھلا کرتا تھا، اپنے دانتوں کی گرفت میں لے لیا۔

ولایت شاہ کی کیفیت اس ہاتھی سے مختلف نہ تھی جس کی سونڈ شیر کے منہ میں آ چکی ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخ رہے تھے گھوڑے کا یہ اقدام اسماعیل کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ گھوڑا صرف ڈرانے دھمکانے یا زیادہ سے زیادہ دولتی مارنے پر اکتفا کرے گا۔۔۔۔۔۔ سلیم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ رمضان اس دلگداز منظر کی تاب نہ لا کر پوری قوت سے دہائی مچا رہا تھا۔

اسماعیل نے جب یہ محسوس کیا کہ معاملہ مذاق کی حد سے آگے گذر چکا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کے نتھنے پر مکا مارا۔ گھوڑے کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ولایت شاہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

تھوڑی دیر میں ساری حویلی گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے بھر گئی پیر جی کو پانچ چھ آدمیوں نے بڑی مشکل سے باہر نکال کر چارپائی پر ڈال دیا کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پیر صاحب کو ہوش آیا اور اتنی دیر میں قریباً تمام لوگ یکے بعد دیگرے

ان کے جسم کا زخم خوردہ حصہ دیکھ چکے تھے۔

درد کی شدت اور آدمیوں کے ہجوم میں پیر جی نے اپنے آپ کو قریب المرگ سمجھ کر مریدوں اور مجاوروں سے وصیت کی کہ اس گاؤں میں میرا جنازہ خراب ہو گا، مجھے فوراً میرے گھر پہنچا دو۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور انہیں چارپائی پر ڈال کر ان کے گاؤں پہنچا دیا گیا۔

ولایت شاہ کوئی ڈیڑھ مہینہ بستر پر پڑے رہے۔ ان کے مرید ان کی تیمارداری کے لیے جاتے تھے لیکن ان کے مخالفین دور دراز سے چل کر سلیم کے گھوڑے کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے اور اسماعیل ان کے سامنے اس واقعہ کی چشم دید تفصیلات بیان کیا کرتا تھا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد فجو پہلوان نے اعلان کیا کہ سلیم کا بازو اب بالکل ٹھیک ہے اور اگلے دن سلیم گاؤں کے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر گھوڑے کو بھگا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

شب برات کی آمد آمد تھی سکول کے پاس ہی ایک دکاندار پھلجھڑیاں، پٹاخے، اور آتش بازی کا دوسرا سامان نمائش کے لیے رکھ دیا کرتا تھا لڑکے آدھی چھٹی کے وقت حلوائی کی دکان پر دھاوا بولنے کی بجائے پٹاخے وغیرہ خرید کر چلایا کرتے تھے سلیم نے اپنے حصے کے پیسے مجید کے حوالے کر دیے تھے اور وہ آدھی چھٹی کے وقت چند پٹاخے، چھچھوندریں اور پھلجھڑیاں وغیرہ خرید لایا تھا۔

آدھی چھٹی کے بعد اردو کا گھنٹہ تھا اور ماسٹر کی غیر حاضری میں لڑکے شور مچا رہے تھے مجید نے آتش بازی کا سامان اپنے بستے میں باندھ رکھا تھا لیکن سلیم اسے دیکھنا چاہتا تھا مجید بار بار اپنا بستہ اس کے ہاتھ سے چھین کر ڈیسک کے اندر رکھتا لیکن وہ پھر نکال لیتا۔

سلیم کے بائیں ہاتھ کے ڈیسک پر ارشد بیٹھا کرتا تھا، اس نے اپنی جیب سے ایک پھلجھڑی نکالی اور اسے آگ لگا کر تمام لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

سلیم نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مجید کے بستے سے ایک پھلجھڑی نکال کر اسے آگ لگا دی ایک اور لڑکے نے ان کی تقلید کی اور تھوڑی دیر میں کمرے کے اندر کئی پھلجھڑیاں چلنے لگیں۔

ارشد نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''تمہارے بھائی نے بہت سی چھچھوندریں لی ہیں لیکن یہ کسی کام کی نہیں میں کل ایک آنے کی لے گیا تھا، ان میں سے صرف دو چلیں معلوم ہوتا ہے ان کے اندر پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے!''

سلیم کو افسوس ہوا کہ یہ بات اسے پہلے کیوں نہیں بتائی گئی تاہم اس نے ایک چھچھوندر نکال کر ارشد کو دکھاتے ہوئے کہا ''ان کے اندر کوئلہ نہیں ہے میں نے کئی لڑکوں کو چلاتے دیکھا ہے!''

''لاؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں!''

سلیم نے چھچھوندر ارشد کے ہاتھ میں دے دی اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کے ساتھ دیا سلائی جلائی اور اس کے ایک سرے کو آگ لگا دی۔

کمرے کے باہر ہیڈ ماسٹر صاحب اردو کے ماسٹر سے کہہ رہے تھے، کہ آپ دیر سے آتے ہیں اور لڑکے سب سے زیادہ آپ کی گھنٹی پر شور مچاتے ہیں۔

لڑکے واقعی بہت شور مچا رہے تھے ہیڈ ماسٹر کی جھڑکی کے بعد اردو کے ماسٹر نے انتہائی غیض وغضب کی حالت میں کمرے کا رخ کیا لیکن جونہی انہوں نے کمرے میں پاؤں رکھا ارشد نے بدحواسی کی حالت میں چھچھوندر چھوڑ دی۔

چھچھوندر پہلے میز پر گری، پھر دروازے کا رخ کیا اور اس کے بعد ماسٹر صاحب کی ٹانگوں میں جا چھپی۔ ماسٹر صاحب اچھل اچھل کر اپنی شلوار جھاڑنے لگے یہ نظارہ دیکھ کر لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے منہ چھپا کر ہنسنے لگے۔

چھچھوندر سے چھٹکارا حاصل کرتے ہی ماسٹر صاحب الٹے پاؤں واپس مڑے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا لائے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا بید ہلاتے ہوئے سوال کیا ''یہ کس کی شرارت ہے؟''

کسی نے جواب نہ دیا

ہیڈ ماسٹر نے دوبارہ گرج کر کہا ''بتاؤ! ورنہ سب کو سزا دوں گا!''

لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

آگے بیٹھنے والے لڑکوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ چھچھوندر کس نے چلائی ہے اور پیچھے بیٹھنے والے جن لڑکوں کو معلوم تھا، انہیں یہ تسلی تھی کہ ہیڈ ماسٹر کا غصہ اگلی قطار کے چند لڑکوں سے باز پرس کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔ ارشد نے ملتجی نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھا اور سلیم کی مسکراہٹ نے اس کی تسلی کرا دی۔

مجید نے اپنا بستہ ڈیسک سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آتش بازی کا سامان نکال کر ڈیسک کے اندر چھپا دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے چند مرتبہ اپنا بید ہوا میں لہرایا پھر لڑکوں کو کھڑا ہونے کا حکم دیا اور ایک سرے سے مار پیٹ شروع کر دی۔

بلونت سنگھ اگلے ڈیسک پر بیٹھا ہوا تھا، اس لیے سب سے پہلے اس کی باری آئی ہیڈ ماسٹر کے حکم پر اس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ پہلا بید کھانے کے بعد وہ چلانے لگا نہیں جی، ماسٹر جی نہیں جی میں نے نہیں چلائی لیکن ماسٹر صاحب اس کی باتیں سننے کے لیے تیار نہ تھے ''ہاتھ بڑھاؤ!'' انہوں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا ''بلونت سنگھ نے دوسرا ہاتھ بڑھا دیا لیکن جب سنسناتا ہوا بید آیا تو اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا بید ڈیسک پر لگا اور لڑکے سہم کر رہ گئے۔''

''ماسٹر جی میں نے نہیں چلائی، ان لڑکوں سے پوچھ لیجئے!''

''تو بتاؤ کس نے چلائی ہے؟'' ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید پھر ایک بار ہوا میں سنسناہٹ پیدا کرنے لگا ''ہاتھ بڑھاؤ ورنہ!''

بلونت سنگھ نے کانپتا ہوا ہاتھ پھر آگے کر دیا لیکن جب بید آیا تو اس کا ہاتھ خود بخود پیچھے ہٹ گیا بید دوسری مرتبہ ڈیسک پر لگا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔

ایک طرف سے سلیم کی سہمی ہوئی آواز سنائی ''ماسٹر جی میں۔۔۔ میں نے چھچھوندر۔۔۔''

''تم؟'' ہیڈ ماسٹر نے چونک کر کہا

''جی!''

''ادھر آؤ!''

ارشد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی سلیم آگے بڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا ہیڈ ماسٹر نے بید اٹھاتے ہوئے کہا ''پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ یکے بعد دیگرے چھ بید رسید کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر کا غصہ پریشانی میں تبدیل ہو رہا تھا سلیم نے باری باری ہاتھ آگے کرنے کی بجائے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ گردن جھکانے کی بجائے ٹکٹکی باندھ کر ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک گستاخی تھی کم از کم اردو کا ماسٹر جو ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا تھا، اسے بہت بڑی گستاخی سمجھتا تھا۔ اگر سلیم ایک بار ''نہیں جی۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو جی'' کہہ دیتا تو یہ معاملہ ختم ہو جاتا لیکن اس کی ہمت اور جرأت کو ایک چیلنج سمجھا گیا۔

مجید، ارشد کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں، اگر اس کے بس میں ہوتا تو ارشد پر بھوکے شیر کی طرح حملہ کر دیتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ اول تو وہ کسی کو مارتے ہی نہیں لیکن جب مارنے پر آتے ہیں تو آدھی درجن یا ایک درجن کے حساب سے بید رسید کرتے ہیں ارشد کو یقین تھا کہ وہ سلیم جیسے لڑکے کے لیے آدھی درجن کافی سمجھیں گے لیکن جب ہیڈ ماسٹر نے آدھی

درجن پوری کر کے قدرے توقف کے بعد پھر بید اٹھالیا تو ارشد کی قوت برداشت جواب دے گئی اس نے مجید کی طرف دیکھا مجید نے انتہائی حقارت آمیز لہجہ میں کہا ''تم بزدل ہو'' اور ارشد کی رگ و پے میں جیسے بجلی دوڑ گئی وہ چلایا ''ماسٹر جی! سلیم بے قصور ہے چھچھوندر میں نے چلائی تھی۔''

ہیڈ ماسٹر صاحب کا بید رک گیا اور ارشد آگے بڑھ کر سلیم کے قریب کھڑا ہو گیا۔

ہیڈ ماسٹر اور اردو کا ماسٹر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم جھوٹ کہتے ہو!'' ہیڈ ماسٹر نے ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''سلیم کو معلوم ہے کہ چھچھوندر میں نے چلائی تھی، مجید کو بھی معلوم ہے بہت سے لڑکوں کو معلوم ہے آپ پوچھ لیجیے سلیم مجھے بچانے کے لیے۔۔۔۔۔''

ارشد کی آواز بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

''کیوں مجید؟'' ہیڈ ماسٹر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا

''جی۔۔۔'' سلیم نے جلدی سے مڑ کر مجید کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں نے مجید کے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔

ہیڈ ماسٹر نے کہا ''بتاتے کیوں نہیں؟''

مجید کی خاموشی پر رام لال نے کہا ''ماسٹر جی! ارشد نے چلائی تھی''

☆☆☆☆☆

لڑکوں کی توقع کے خلاف ہیڈ ماسٹر کچھ دیر بے حس حرکت کھڑے سلیم اور ارشد کی طرف دیکھتے رہے ان کے دل میں غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی انہوں نے کہا ''تم بہت نالائق ہو ارشد، اور سلیم تم ۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ!''

سلیم ہیڈ ماسٹر کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا اور صحن میں سے گزرنے کے بعد دفتر میں داخل ہوا۔۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور سلیم میز کی دوسری طرف ان کے سامنے کھڑا رہا بالآخر انہوں نے سلیم کی طرف دیکھا اور کہا ''سلیم تمہیں مار کھانے کا شوق تھا؟''

سلیم خاموش رہا ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہا ''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

سلیم نے جواب دیا ''جی چھچھوندر میری تھی اور ارشد نے اسے آگ لگائی تھی، بلونت سنگھ بے قصور تھا!''

''لیکن تم نے ارشد کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟''

''ارشد نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی، اس کا خیال تھا کہ چھچھوندر کے اندر مسالے کی بجائے پسا ہوا کوئلہ بھرا ہے۔''

''ادھر آؤ!'' ماسٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

سلیم میز کے اوپر سے چکر کاٹ کر ہیڈ ماسٹر کے قریب کھڑا ہو گیا۔

''اپنے ہاتھ دکھاؤ!''

سلیم نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے ہیڈ ماسٹر صاحب افسوس اور ندامت کے ساتھ اس کے ہاتھوں پر بید کے نشان دیکھنے کے بعد بولے ''تم اچھے لڑکے دکھائی

دیتے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تمہارے ہاتھ اچھے کاموں کے لیے بنائے ہیں کبھی کبھی ایک اچھا کام کرتے وقت انسان کے ہاتھ زخمی بھی ہو جاتے ہیں تمہیں آج کی مار کا افسوس تو نہیں؟''

سلیم خاموش رہا اور ہیڈ ماسٹر صاحب قدرے توقف کے بعد بولے ''دیکھو بیٹا! اگر آج تم جرأت سے کام نہ لیتے تو شاید ارشد ہمیشہ کے لیے اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کا عادی ہو جاتا۔ تم نے اسے بزدل بننے سے بچا لیا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ اس سبق کو نہیں بھولے گا جو آج تم نے اسے دیا ہے۔ کسی دن تم اس بات پر فخر کر سکو گے کہ ایک دفعہ جب تمہارے ایک ساتھی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ تم نے اسے سہارا دیا تھا۔ اگر تم دوسروں کے سامنے اسی طرح اچھی مثال پیش کرتے رہے تو کسی دن میں تم پر فخر کیا کروں گا اچھا اب تم جاؤ۔''

☆☆☆☆☆

گرمیوں کے دنوں میں بعض لڑکے چھٹی کے بعد گھروں کا رخ کرنے کی بجائے نہر پر چلے جاتے، یہ نہر سکول سے کوئی تین فرلانگ دور تھی دونوں کناروں پر شیشم، جامن اور آم کے درخت تھے۔ لڑکے درختوں کی چھاؤں میں کبڈی کھیلتے اور جب اس سے اکتا جاتے تو نہر میں چھلانگیں لگا دیتے۔ ٹھنڈے پانی میں اچھی طرح ٹھٹھرنے کے بعد وہ باہر نکل کر پھر کوئی کھیل شروع کر دیتے۔

کبھی کبھی تیرنے کا مقابلہ ہو جاتا تمام لڑکے کنارے پر قطار باندھ کر ایک ساتھ

پانی میں کودتے اور دوسرے کنارے کو چھو کر واپس آنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

جب آم اور جامن پکنے کا موسم آتا نہر کے کنارے رونق میں اضافہ ہو جاتا۔ آم بہت سستے بکا کرتے تھے اور جامن ہر شخص مفت اتار کر کھا سکتا تھا۔

پل کے پاس نہر کی ایک چھوٹی سی شاخ نکلتی تھی۔ چونکہ اس کا پانی کم گہرا تھا۔ اس لیے چھوٹی عمر کے لڑکوں کا اس جگہ ہجوم رہا کرتا تھا۔

ایک دن مجید درخت پر چڑھ کر جامن اتار رہا تھا کئی لڑکے جھولیاں تانے نیچے کھڑے تھے جب وہ کسی شاخ کو جھٹکا دیتا تو لڑکے جھولیاں پھیلا کر گرتے ہوئے جامن دبوچنے کی کوشش کرتے جو پھل ان کی جھولیوں سے باہر گر پڑتا اسے وہ نیچے بیٹھ کر چن لیتے۔

جامن کے دوسرے درختوں پر بھی چند لڑکے چڑھے ہوئے تھے اور ہر درخت کے نیچے بچوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔

سلیم چند لڑکوں کے ساتھ نہر میں نہا رہا تھا۔ مہندر تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے کبھی کبھی کنارے پر اگی ہوئی گھاس پکڑ کر پانی میں چند ڈبکیاں لگا لیتا اور اس کے بعد کنارے پر کھڑا ہو کر دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھنے لگتا۔

کندن لال نہر سے باہر نکل کر مہندر کے قریب کپڑے پہن رہا تھا کہ موہن سنگھ کو شرارت سوجھی اس نے پیچھے سے دبے پاؤں آ کر اسے دھکا دے دیا کندن لال نے سنبھلنے کے لیے مہندر کا سہارا لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے

پانی میں آرہے کندن لال تیرنا جانتا تھا اس لیے وہ کسی حادثے کے بغیر باہر نکل آیا مہندر سنگھ کو پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے اور غوطے کھاتے دیکھ کر لڑکے شور مچانے لگے سلیم اس وقت کنارے سے پانچ چھ گز دور تھا وہ تیزی سے تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا مہندر نے اسے قریب آتا دیکھ کر پانی کے ساتھ جدوجہد کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ سلیم بروقت اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکا اور وہ ایک لمحہ کے لیے پانی میں چھپ گیا۔

"ڈوب گیا۔۔۔۔ ڈوب گیا۔۔۔۔۔۔ مہندر ڈوب گیا!" لڑکے شور مچا رہے تھے اچانک مہندر سنگھ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا پانی کی سطح پر ظاہر ہوا اور سلیم نے اس کے سر کے بال پکڑ لیے سلیم تیرنا جانتا تھا لیکن ڈوبتے کو بچانے کے لیے طاقت اور تجربے کی ضرورت تھی مہندر نے بدحواسی کی حالت میں اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے ار دونوں پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے چند غوطے کھانے کے بعد سلیم کا ہاتھ کنارے کی گھاس تک پہنچ گیا اتنی دیر میں مجید، بلونت سنگھ اور دوسرے لڑکے درختوں سے اتر کر اس طرف بھاگ رہے تھے۔ بلونت سنگھ نے اپنے بھائی کا نام سنتے ہی آٹھ دس فٹ اونچی ٹہنی سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے سلیم مہندر سنگھ کو خطرے کی زد سے باہر لا چکا تھا۔ پانی سے باہر نکل کر اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہی مہندر سنگھ نے کندن لال کی طرف دیکھا اور اسے گالیاں دینے لگا۔

مجید اور بلونت سنگھ کسی تمہید کے بغیر کندن لال پر پل پڑے۔ کچھ اور لڑکوں نے

بھی ان کی تقلید کی اس پر ابتدائی حملہ اس قدر شدید تھا کہ کندن لال کو صفائی کا موقع ہی نہ ملا۔۔۔اور جب لڑکوں کے ہاتھ ذرا سست ہوئے تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔۔۔۔سلیم نے لڑکوں کو ادھر ادھر دھکے دے کر اسے بچانے کی کوشش کی وہ چلاتا رہا۔ارے اسے کیوں مارتے ہو دھکا دینے والا تو موہن سنگھ تھا لیکن سلیم کی چیخ و پکار کی صرف اس وقت قابل توجہ سمجھ آگیا جب کندن لال اچھی طرح پٹ چکا تھا۔۔۔پھر جب موہن سنگھ کی تلاش شروع ہوئی تو وہ غائب تھا۔

اگلے دن جب سلیم سکول سے واپس آتے ہوئے مہندر کے گاؤں سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنے مکان کے قریب پہنچ کر سلیم کا بازو پکڑلیا ''چلو سلیم ماں کہتی تھی کہ اسے ضرور لانا''

سلیم نے تذبذب کی حالت میں مجید اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''نہیں مہندر پھر سہی!''

بلونت سنگھ نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑتے ہوئے کہا ''چلو نا سلیم ہمارے آم بہت میٹھے ہیں سچ کہتا ہوں میری ماں نے تمہارے لیے بہت سے آم رکھے ہوئے ہیں مجید تم بھی چلو!''

مجید کچھ کہنے کو تھا کہ مہندر کی ماں دروازے میں نمودار ہوئی اور سلیم اور مجید کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا ''تم میں سے سلیم کون ہے؟''

پیشتر اس کے کہ سلیم جواب دیتا مہندر نے کہا'' ماں یہ ہے سلیم یہ ہمارے گھر نہیں آتا تھا''

مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر پیار سے دونوں ہاتھ سلیم کے سر پر رکھ دیے اور کہا ''بیٹا جیتے رہو۔ میں آج تمہارے گھر بھی گئی تھی چلو تھوڑی دیر میرے گھر بیٹھو پھر چلے جانا اور یہ؟'' اس نے مجید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تمہارا بھائی ہے نا، بیٹا تم بھی چلو۔۔۔۔تم سب چلو!''

تھوڑی دیر بعد سلیم اور اس کے گاؤں کے باقی لڑکے مہندر کے مکان کے صحن میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بے تکلفی سے آم کھا رہے تھے۔ مہندر سنگھ کی بہن جو اس سے دو سال چھوٹی تھی، چند قدم دور کھڑی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دو تین آم کھانے کے بعد جب سلیم ٹوکری سے ہٹ کر دور بیٹھ گیا تو مہندر کی ماں نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک آم نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا ''یہ کھاؤ بیٹا بہت میٹھا ہے، لو!''

سلیم نے اس کے ہاتھ سے آم لے لیا۔ کم سن لڑکی نے آگے بڑھ کر ٹوکری سے ایک اور آم نکالتے ہوئے کہا ''یہ بھی بہت میٹھا ہے، لو!''

ساتھیوں کی ہنسی نے سلیم کو قدرے پریشان کر دیا لڑکی نے تامل کے بعد پھر کہا ''لو نا! سچ کہتی ہوں، بہت میٹھا ہے۔''

لڑکی کی ماں نے کہا ''لے لو بیٹا! یہ تمہاری بہن ہے۔''

سلیم نے لڑکی کے ہاتھ سے آم لے لیا اور وہ خوش ہو کر بولی ''تمہارا نام سلیم ہے نا!''

''ہاں!'' سلیم نے آہستہ سے جواب دیا

''میرا نام بسنت ہے!''

سلیم خاموش رہا لڑکی کچھ سوچ کر بولی ''تم نے مہندر کو نہر سے نکالا تھا نا؟''

سلیم کی خاموشی پر مہندر نے جواب دیا ''ہاں بسنتی! اس نے مجھے نکالا تھا۔ اسے میٹھے میٹھے آم دو نا!''

لڑکی نے جھٹ دو آم نکال کر سلیم کو پیش کر دیے ''بس میں بہت کھا چکا ہوں'' سلیم نے عذر پیش کیا۔

سلیم کے انکار پر بسنت نے مایوس ہو کر آم پھر ٹوکری میں رکھ دیے اور کچھ سوچنے کے بعد بھاگتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی ''لو یہ لے لو'' اس نے گڑیا سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے لیکن لڑکی ان کی ہنسی سے لاپروا ہو کر گڑیا دینے پر اصرار کر رہی تھی اس کی ماں نے کہا ''پگلی! بھائیوں کو گڑیا نہیں دیا کرتے۔''

☆☆☆☆☆

جولائی کا مہینہ تھا اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں ایک دن سلیم گاؤں کے باہر آم کے باغ میں چارپائی پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا، ایک کتاب اس کے سرہانے پڑی ہوئی تھی، مجید بھاگتا ہوا آیا اور سلیم کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا ''ارے اٹھو!''

سلیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک کر پھر آنکھیں بند کر

لیں۔

''ارے پوستی اٹھتے ہو یا نہیں؟''

''مجید کے بچے مجھے تنگ نہ کرو!'' سلیم کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔

''ارے اٹھتے ہو یا نہیں؟''

سلیم نے جواب دینے کی بجائے تکیے میں منہ چھپالیا۔

مجید نے چارپائی کو ایک طرف سے اٹھاتے ہوئے ''ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ تین!'' کہا اور سلیم لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ وہ غضبناک ہوکر اٹھا اور آس پاس کوئی اور کارآمد چیز نہ پاکر دونوں ہاتھوں میں آموں کی سوکھی ہوئی گٹھلیاں لے کر مجید کے پیچھے بھاگا۔ مجید کبھی ایک اور کبھی دوسرے درخت کی آڑ کر اپنے آپ کو بچا رہا تھا لیکن جب سلیم نے ایک درخت کے نیچے سے دو کچے آم اٹھا لیے تو وہ چلایا ارے ٹھہرو! ادھر دیکھو!!

''ادھر میں بعد میں دیکھوں گا'' سلیم نے یہ کہتے ہوئے ایک آم اس کی طرف دے مارا مجید نے درخت کی آڑ میں چھپ کر اپنے آپ کو بچالیا۔

''ارے، میں تمہارے دوست کو لے کر آیا ہوں' مجید نے پھر درخت کی اوٹ سے سر نکالتے ہوئے کہا ''مجھے معلوم ہے''

''ارے تمہارے پیچھے ارشد کھڑا ہے ادھر دیکھو!''

ارشد کا نام سن کر سلیم نے جلدی سے پیچھے دیکھا اور اس کا غصہ پریشانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں تبدیل ہو کر رہ گیا وہ آم اور گٹھلیاں زمین پر

پھینک کر اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا۔

''بھئی خوب سوتے ہو'' ارشد نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا

''نہیں میرا خیال تھا کہ مجید بلا وجہ تنگ کر رہا ہے۔ اگر تم جگاتے تو میں شاید تمہاری آواز سن کر ہی اٹھ بیٹھتا'' یہ کہہ کر سلیم نے مالی کو آواز دی ''دیکھو مالی سیندوری اور گولے آم جھاڑ کر پانی میں ڈالو لیکن ٹھہرو پہلے ان کے لیے کھانا لے آؤ!''

ارشد نے کہا ''بھائی کھانا تو میں گھر سے کھا کر چلا تھا''

''اچھا پانی تو پیو گے نا؟''

''پانی مجید نے پلا دیا ہے!''

سلیم مالی کی طرف متوجہ ہوا ''اچھا بھئی تم آم اتار دو!''

مالی نے جواب دیا ''جی گولے اور سیندوری آم تو میں نے صبح اتار کر گھر بھیج دیے تھے، اب کسی اور درخت سے اتار دیتا ہوں!''

''نہیں! ہم دوسرے باغ میں چلتے ہیں!''

مجید نے کہا ''سلیم! اگر ارشد کو بہت ہی اچھے آم کھلانا چاہتے ہو تو چلو سادھو کے باغ میں چلتے ہیں اس کے آم ہمارے سیندوری اور گولے سے بھی اچھے ہیں۔''

مالی نے کہا ''ہاں جی! ویسے آم سارے علاقے میں کسی باغ کے نہیں''

سلیم نے کہا ''لیکن وہ دور ہے!''

''ہم پیدل نہیں جائیں گے، گھوڑوں پر آدھ گھنٹے کا راستہ ہے''

سلیم نے پوچھا ''کیوں ارشد گھوڑے پر سواری کر لو گے؟''

''بھئی سچ پوچھو تو مجھے آدموں سے زیادہ گھوڑے کی سواری کا شوق ہے لیکن تمہارے ولایت شاہ والے گھوڑے سے ڈرتا ہوں!''

سلیم نے کہا ''اب میرا گھوڑا شرارت نہیں کرتا، پھر بھی تمہارے لیے مجید کی گھوڑی ٹھیک رہے گی۔ مجید تم چچا افضل کی گھوڑی لے لو!''

مجید بولا ''بھئی چچا افضل سے تم کہو!''

''چلو!''

کڑاکے کی دھوپ اور اس کے ساتھ غضب کی گھمس تھی، ارشد کے ساتھ گھر کا رخ کرتے ہوئے سلیم اور مجید دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایسی گرمی میں شاید افضل گھوڑی پر سواری کی اجازت نہ دے۔

چچا افضل حویلی کے دروازے کے سامنے بڑ کے درخت کے نیچے کھاٹ پر بیٹھا ہیر پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب دوسری چارپائی پر شیر سنگھ لیٹا ہوا تھا۔ چبوترے کے دوسری طرف اسماعیل کے گرد آٹھ دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر گفتگو کے لیے موزوں الفاظ سوچنے کے بعد سلیم افضل کے قریب جا کھڑا ہوا۔ افضل کسی لفظ پر رکا اور سلیم نے جھک کر کتاب پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی اصلاح کر دی اور پھر اپنی کہانیوں کی کتاب شیر سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''لو چچا تم بھی پڑھو!''

شیر سنگھ نے بے تکلفی سے کتاب کھولی اور افضل کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

سلیم نے کہا ''چچا عینک لگا لو نا؟''

''نہیں بھئی گرمی ہے، مجھے ایسے ہی پڑھنے دو۔ پرسوں عینک سے آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ تم نے خواہ مخواہ میرے دو روپے خرچ کرا دیے!''

''اچھا چچا پڑھو نا!''

اس نے پڑھنا شروع کیا ''ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں۔۔۔۔'' اور ارشد جو ابھی تک چبوترے سے پنچے مجید کے قریب کھڑا تھا، اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلیم نے کہا ''چچا یہ تو اردو کی کہانیوں کی کتاب ہے!''

''کوئی بات نہیں!'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا

سلیم نے افضل کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''چچا جی! ذرا آپ کی گھوڑی باہر لے جاؤں؟''

''اس گرمی میں! خبردار اسے ہاتھ لگایا تو! اپنے گھوڑے کو دن میں دو بار نہلاتے ہو اور میری گھوڑی میں جیسے جان ہی نہیں!''

''چچا! شہر سے میرا دوست آیا ہے باغ میں اچھے آم مالی نے جھاڑ لیے ہیں اور ہم سادھو کے باغ میں جانا چاہتے ہیں''

''دوست کے لفظ کا مفہوم افضل سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ اس کے لہجے میں اچانک ملائمت آ گئی'' کہاں ہے تمہارا دوست؟ اس نے سوال کیا

''وہ کھڑا ہے''سلیم نے ارشد کی طرف اشارہ کیا

''ارے پڑھے لکھے لوگ دوستوں کی آؤ بھگت اسی طرح کیا کرتے ہیں؟ آؤ

بھئی ادھر آؤ!‘‘

ارشد چبوترے پر چڑھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا

’’بیٹھ جاؤ بیٹا!‘‘

ارشد شرماتے ہوئے افضل کے قریب بیٹھ گیا

’’جاؤ سلیم شربت لاؤ!‘‘

’’جی میں نے پانی پی لیا ہے۔‘‘

’’بھئی آج کل پیاس جلدی لگ جاتی ہے جاؤ سلیم!‘‘

سلیم بھاگتا ہوا شربت لے آیا اور ارشد کو ایک گلاس پینا پڑا۔

افضل نے کہا ’’کیوں برخوردار! گھوڑے کی سواری آتی ہے نا تمہیں؟‘‘

ارشد نے جواب دیا ’’جی بہت معمولی، کبھی کبھی کسی گاؤں کے مریض ابا جی کے لیے گھوڑا بھیج دیتے ہیں تو میں سواری کر لیتا ہوں لیکن گھوڑا اگر شریر ہو تو میں اس کے پاس نہیں جاتا ابھی تک مجھے اچھی طرح سواری نہیں آتی۔‘‘

’’سلیم تمہیں سکھا دے گا لیکن پہلے دن ہماری چھوٹی گھوڑی پر سواری کرنا تم ڈاکٹر شوکت کے لڑکے ہونا؟‘‘

’’جی‘‘

’’بھئی وہ تو ہمارے بڑے مہربان اور بھائی جان کے دوست ہیں۔ سلیم! اپنے دوست کے لیے گھوڑے کی زین اچھی طرح کس دینا۔‘‘

’’بہت اچھا چچا جان!‘‘

سلیم اور مجید تھوڑی دیر میں گھوڑوں پر زینیں ڈال کر آئے۔

جب وہ سوار ہو رہے تھے تو افضل نے کہا ''دیکھو بھئی گھوڑوں کو تیز نہ چلانا تمہارا ساتھی انجان ہے اور آج گرمی بھی بہت زیادہ ہے شام تک شاید آندھی یا بارش آئے، اس لیے جلدی آنا!''

''بہت اچھا چچا جان! ہم جلدی آئیں گے''

باغ میں پہنچ کر سلیم، مجید اور ارشد نے گھوڑوں کی زینیں اتار کر انہیں درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔ مالی سے آم لے کر پانی کی بالٹی میں ڈال دیے اور خود نہر میں نہانے لگے۔ نہانے کے بعد انہوں نے نہر کے کنارے بیٹھ کر آم کھائے اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

مجید کو کئی دنوں کے بعد افضل کی گھوڑی پر سواری کا موقع ملا تھا۔ اس نے چپکے سے اٹھ کر گھوڑی پر زین ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' سلیم نے سوال کیا

''ذرا چکر لگاتا ہوں آؤ تم بھی!''

سلیم نے جواب دیا ''نہیں بھئی میں گھوڑے کو نہیں بھگاؤں گا'' لیکن جب مجید نے قریب ہی ایک کھیت میں گھوڑی کو بھگاتے ہوئے دو تین بار پانی کی کھائی کے اوپر سے چھلانگ لگا کر ارشد سے داد حاصل کی تو سلیم اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا، اس نے جھٹ سے اپنے گھوڑے کو لگام لگا دی اور زین کے بغیر اس پر سوار ہو گیا۔

ارشد کے لیے دو سواروں کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہ تھا وہ حیرت زدہ ہو کر ان کی

طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔باغ کے مالی نے اس کے قریب آ کر کہا ''بھئی! تم بھی چڑھ جاؤ اپنی گھوڑی پر۔۔۔۔!''

ارشد نے بظاہر باغبان کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تاہم اس کے لیے تماشائی کی حیثیت میں کھڑا رہنا صبر آزما تھا۔تھوڑی دیر بعد سلیم نے اس کے قریب آ کر کہا ''ارشد آؤ تم بھی! یہ گھوڑی سرکش نہیں ہے آج تم اسی کو بھگا کر دیکھو،آئندہ میں تمہیں اپنا گھوڑا دیا کروں گا۔''

ارشد نے جواب دیا ''میں تمہاری طرح ننگی پیٹھ پر سواری نہیں کرسکوں گا''

''اچھا تو میں تمہیں زین ڈال دیتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے سلیم اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اس کی باگ ارشد کے ہاتھ میں دے کر گھوڑی پر زین ڈال دی۔

تھوڑی دیر میں یہ تینوں باغ سے کچھ فاصلے پر ایک کھلے میدان میں گھوڑے بھگا رہے تھے ارشد کچھ دیر گھوڑی کو سرپٹ دوڑانے سے گھبراتا رہا لیکن جلد ہی اس کی جھجک دور ہوگئی۔تاہم جب کوئی کھائی سامنے آتی تو اپنے ساتھیوں کی تقلید کرنے کی بجائے گھوڑی کو روک لیتا۔ایک مرتبہ اس کی گھوڑی اس کی کوشش کے باوجود ایک چھوٹی سی کھائی پر سے کود گئی۔اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

''سلیم! بھئی یہ گھوڑی تو بہت اچھی ہے'' اس نے خوش ہو کر کہا

''دیکھا! تم یونہی گھبراتے تھے''

شام کے قریب اگرچہ دھوپ کی تیزی کم ہو چکی تھی لیکن حبس پہلے سے بھی زیادہ تھا اور اس کے ساتھ ہی مغرب کے افق پر آندھی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔سلیم

نے گھوڑا روک کر کہا ''مجید! ادھر دیکھو، آج آندھی آئے گی۔ چلو اب گھر چلیں!''

مجید نے اس کے قریب پہنچ کر اپنی گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا ''ذرا گھوڑوں کا پسینہ سوکھ جائے تو چلتے ہیں ورنہ چچا افضل خفا ہوگا۔''

ارشد نے کہا ''بھئی مجھے دیر ہو جائے گی، چلو!''

سلیم نے کہا ''تم آج ہمارے پاس رہنا!''

''نہیں بھئی! میں گھر میں بتا کر نہیں آیا۔ ابا جان خفا ہوں گے۔''

مجید نے کہا ''تم فکر نہ کرو سلیم تمہیں اپنے گھوڑے پر بٹھا کر چھوڑ آئے گا۔''

سلیم نے اس بات کی تائید کی ''ہاں ارشد یہ گھوڑی ہم گاؤں میں چھوڑ دیں گے اور پھر میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھا کر شہر چھوڑ آؤں گا۔''

ارشد اس بات سے مطمئن ہو گیا تھوڑی دیر نہر کے کنارے گھوڑوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دینے کے بعد سلیم اور ارشد یک زبان ہو کر مجید کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اب تمہاری گھوڑی کا پسینہ سوکھ چکا ہے، اس لیے دیر نہ کرو اور مجید ہر بار انہیں یہ کہہ کر ٹال رہا تھا کہ ابھی شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ اتنی جلدی کیوں کرتے ہو۔۔۔۔ چونکہ مغرب کی طرف گھنے درختوں کی اوٹ تھی، اس لیے وہ افق پر اکٹھے ہونے والے گرد و غبار کی رفتار کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے لیکن اچانک سورج چھپ گیا اور باغبان نے آواز دے کر کہا:

''بھئی آندھی آ گئی! تم اب جلدی گھر پہنچو!''

سلیم نے کہا ''چلو ارشد، ہم چلتے ہیں!''

سلیم اور ارشد جلدی سے سوار ہو گئے۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ مجید بھی سر پٹ گھوڑی دوڑاتا ہوا ان کے ساتھ آ ملا۔ کچی سڑک پر تقریباً ایک میل تینوں ایک ساتھ گھوڑے بھگاتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ کھیتوں میں سے گزرنے والی پگڈنڈی پر اترے تو سلیم نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے ''ارشد تم میرے پیچھے رہو اور مجید تم اس کے پیچھے رہو۔''

پگڈنڈی پر وہ معمولی رفتار سے چلتے رہے۔ راستے میں جب کوئی کھائی آتی، سلیم ارشد کو خبردار کر دیتا۔ آندھی کے باعث فضا پر تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ مغرب کی سمت کے تمام گاؤں، درخت اور کھیت گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے۔

''ارشد ذرا سنبھل کر بیٹھو!'' سلیم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گھوڑے کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ انہیں آندھی نے آ گھیرا۔ ابتدائی جھونکے زیادہ شدید نہ تھے۔ لیکن گرد و غبار کی تاریکی میں ان کے لیے راستہ دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ارشد چلا رہا تھا ''بھائی مجھے کچھ نظر نہیں آتا!''

مجید پیچھے سے اسے تسلی دے رہا تھا ''تم اطمینان سے گھوڑی پر بیٹھے ہو، یہ تمہیں سیدھی گھر لے جائے گی۔''

اچانک ہوا اس قدر تیز ہو گئی کہ ارشد اڑتے ہوئے تنکوں سے بچنے کے لیے بار بار اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد بادل کی گرج سنائی دی اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ سلیم

نے ایک بڑ کے درخت کے نیچے گھوڑا روک لیا اور اس کے پیچھے آنے والی گھوڑیاں خود بخود رک گئیں۔

''رک کیوں گئے؟'' مجید نے کہا

سلیم نے کہا ''ذرا گرد بیٹھ جائے تو چلتے ہیں''

ارشد نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ملتجی آواز میں کہا ''ہاں بھئی ذرا ٹھہر جاؤ! میری آنکھیں مٹی سے بھر گئی ہیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا!''

بادل کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گرد تھوڑی دیر میں بیٹھ گئی لیکن ہوا اور بارش کی تیزی ہر لحظہ زیادہ ہوتی گئی۔

مجید نے کہا ''بھئی اب رات ہو رہی ہے۔ یہاں بھیگنے سے کیا فائدہ چلو!''

ارشد کچھ کہنے کو تھا کہ اچانک پاس ہی آم کے ایک بلند درخت کا تنا ٹوٹ کر بڑ کے درخت کے اوپر گرا اور اس کی کئی ٹہنیاں اپنے ساتھ سمیٹتا ہوا زمین پر آ رہا۔ گھوڑے ایک خوفناک آہٹ سے بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ سلیم اور مجید فوراً اپنے اپنے جانوروں پر قابو پا لیا لیکن ارشد کی گھوڑی چند قدم دور نکل گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو پا کر باگ کھینچتا، ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ سے اس کا سر ٹکرا گیا۔

جب سلیم اور مجید اس کی مدد کو پہنچے، وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ دونوں بیک وقت گھوڑوں سے کود پڑے اور ارشد! ارشد!! کہتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ سلیم نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا کہ ارشد کے

ماتھے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ اس کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ ایک ثانیہ کے بعد وہ چلایا ''ارشد! ارشد!!'' اور اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں مجید کی طرف دیکھا۔ مجید نے جلدی سے اپنی پگڑی اتاری اور کس کر اس کے سر پر لپیٹ دی۔

''مجید! سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا'' اب۔۔۔۔۔! اس ایک لفظ میں کئی سوالات اور کئی التجاؤں کے ساتھ سلیم اپنے ان احساسات کی ترجمانی بھی کر چکا تھا کہ تم بڑے ہو، تم سب کچھ سمجھتے ہو، تم بہت کچھ کر سکتے ہو، بتاؤ اب کیا کیا جائے، بتاؤ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟

اور مجید نے اس کے جواب میں جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا ''تم میری گھوڑی کی باگ پکڑو، میں اسے اپنے ساتھ لاد کر گھر لے جاتا ہوں۔ تم یہاں سے سیدھے شہر جا کر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ چھوٹی گھوڑی کو جانے دو، وہ خود بخود گھر پہنچ جائے گی۔''

سلیم نے اچانک یہ محسوس کیا کہ اس میں غیر معمولی قوت آ چکی ہے وہ جلدی سے مجید کی گھوڑی کو باگ سے پکڑ کر لے آیا مجید نے ارشد کو اٹھا کر گھوڑی پر ڈال دیا اور پھر سلیم کا سہارا لے کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ایسے طوفان میں ایک بے ہوش ساتھی کو آگے بٹھا کر لے جانا آسان بات نہ تھی لیکن مجید کی جسمانی قوت کام آئی۔ اس نے ارشد کے پیچھے بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا دوسرے ہاتھ میں باگ تھام لی اور کہا ''سلیم! تم اگر وقت پر ڈاکٹر صاحب کو لے آئے تو تمہارے دوست کی جان بچ جائے گی۔''

سلیم نے بھاگ کر اپنے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی لیکن چند قدم دور جا کر وہ مجید کی طرف مڑا اور کہنے لگا "دیکھو مجید! یہ زخمی ہے، اسے احتیاط سے گھر پہنچانا میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر ابھی آتا ہوں!"

مجید نے جواب دیا "ارشد میرا بھی دوست ہے سلیم تم فکر نہ کرو، جلدی جاؤ!"

سلیم نے کسی توقف کے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑا آندھی اور بارش کے سامنے اپنی گردن جھکائے پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔۔۔تاریکی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی سلیم کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا رخ شہر کی طرف تھا وہ پگڈنڈی اور راستے سے بے نیاز ہو کر دھان اور مکئی کے کھیتوں کو عبور کر رہا تھا۔ جب گنے کے کھیت قریب آتے تو وہ کسی کھائی میں گھوڑا ڈال دیتا۔ قریباً ڈیڑھ میل اسی طرح طے کرنے کے بعد وہ شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک تک پہنچ گیا۔

☆☆☆☆☆

سلیم اپنی زندگی میں شاید پہلی بار انتہائی سنجیدگی، خلوص اور درد کے ساتھ ارض و سما کے اس مالک و مختار کے حضور میں التجائیں کر رہا تھا جو زندگی اور موت پر قادر ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے دل سے یہ دعائیں نکل رہی تھیں "یا اللہ! ارشد کی جان بچا میرے مولیٰ اس پر رحم کر۔ یہ میری غلطی تھی، اسے اس کی سزا نہیں ملنی چاہیئے" سلیم کو یقین تھا کہ خدا اپنے نیک بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اس لیے وہ

کہہ رہا تھا ''یا اللہ! میں تیرا نیک بندہ بنوں گا میں آئندہ نماز اور روزہ قضا نہیں کروں گا میں ارشد کو بھی تیرا نیک بندہ بننے پر مجبور کروں گا۔ یا اللہ! اس کے ماں باپ اسے پیار کرتے ہیں اس کا چھوٹا بھائی اس کی ننھی بہنیں ہیں اگر وہ ۔ ۔ ۔ ۔؟'' سلیم کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اسے بارش، آندھی، کیچڑ اور پانی کا احساس تک نہ تھا۔ گھوڑا کئی بار گرتے گرتے بچا لیکن سلیم نے رفتار کم نہ کی۔

ارشد کے مکان کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا۔ صحن کا پھاٹک اندر سے بند تھا۔ سلیم نے ''ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!!'' کہہ کر چند آوازیں دیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ بارش اور آندھی کے شور میں اس کی آواز زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ چند بار پھاٹک کو دھکا دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ پھاٹک کی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اندر کی کنڈی کھول سکتا ہے۔ چنانچہ معمولی کوشش کے بعد اس نے کنڈی کھول لی اور اس کے بعد پھاٹک ہوا کے زور سے خود بخود کھل گیا۔ سلیم گھوڑے کی باگ پکڑے صحن میں داخل ہوا۔ کمروں کے اندر بجلی کے لیمپ روشن تھے اور دریچوں اور دروازے کے شیشوں سے روشنی برآمدے میں آ رہی تھی۔

''ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!!'' سلیم نے آوازیں دیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر نکل کر برآمدے کی بتی کا بٹن دباتے ہوئے کہا ''کون ہے؟''

یہ ارشد کا نوکر تھا سلیم کو اس نے ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا لیکن آج ایک تو وہ بری طرح کیچڑ میں لت پت تھا، دوسرے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ سلیم نے کہا''

ڈاکٹر جی کو بلاؤ!''

نوکر نے جواب دیا ''ڈاکٹر جی یہاں نہیں!''

''کہاں ہیں؟'' سلیم نے بدحواس ہو کر سوال کیا

''وہ یہاں سے تین کوس دور ایک گاؤں میں مریض کو دیکھنے گئے ہیں''

''تو میں وہاں جاتا ہوں! گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''گاؤں کا نام۔۔۔۔ بھئی مجھے یاد نہیں آتا۔ ارشد کو یاد تھا لیکن وہ بھی کہیں غائب ہے شاید وہ کہیں باہر سے ہی ڈاکٹر صاحب کیساتھ چلا گیا ہے۔ گھر کے لوگ بہت پریشان ہیں!''

سلیم نے ارشد کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا ''گھر سے پتہ کروانہیں معلوم ہوگا۔''

''بھئی اول تو گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا اور اگر انہیں معلوم ہو بھی تو تم ایسے طوفان میں وہاں کیسے پہنچو گے اور پھر ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ آندھی اور بارش میں کیسے چل پڑیں گے۔ تم اندر آجاؤ۔ گھوڑے کو ستون کے ساتھ باندھ دو، شاید تھوڑی دیر میں مجھے نام یاد آجائے۔ بھلا سا نام ہے اس گاؤں کا۔ وہاں چودھری رحیم بخش رہتا ہے، وہ اسی کے علاج کے لیے گئے ہیں۔''

''ننگل والا چودھری رحیم بخش؟''

''ارے ہاں بھئی ننگل۔ بڑا ننگل!''

''میں جاتا ہوں!'' سلیم نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی! میں نے تمہیں ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا ہے دیکھو اگر تم نکل جاؤ تو ڈاکٹر صاحب سے کہنا کہ اگر ارشد ان کے ساتھ ہے تو وہ گھر میں کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیں۔ گھر والے بہت پریشان ہیں!''

ارشد کی ماں نے باہر نکلتے ہوئے کہا ''کون ہے غلام علی!''

''جی ایک لڑکا ہے ڈاکٹر جی کو بلانے آیا تھا۔ اب ان کے پیچھے جا رہا ہے۔ میں نے اسے ارشد کے متعلق کہہ دیا ہے۔ اگر وہ وہاں ہوا تو ڈاکٹر صاحب ہمیں خبر کر دیں گے!''

ارشد کی ماں نے کہا ''ہاں بیٹا! یہ کام ضرور کرنا!''

''جی بہت اچھا!''

ارشد کی ماں نے ذرا آگے بڑھ کر بجلی کی روشنی میں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بیٹا! تمہیں ایسے طوفان میں ڈر نہیں لگا۔ گھر میں کوئی بڑا آدمی نہیں تھا؟''

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا ارشد کی ماں نے کہا ''تمہارا کون بیمار ہے؟''

سلیم نے متذبذب ہو کر جواب دیا ''جی میرے بھائی کو گھوڑے سے گر کر چوٹ آ گئی ہے!''

''اچھا بیٹا جاؤ! خدا اسے تندرستی دے''

سلیم نے کہا ''جی ارشد کے متعلق آپ فکر نہ کریں۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نہ ہوا تو پاس ہی ایک اور گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ہو گا۔ میں صبح ہونے سے پہلے آپ کو اس کے متعلق اطلاع دوں گا!''

''تم ارشد کو جانتے ہونا؟''

''جی وہ میرے ساتھ پڑھتا ہے''سلیم نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔کھیت، پگڈنڈیاں اور دیہاتی راستے پانی میں چھپے ہوئے تھے۔ہوا کی تیزی کسی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن بارش اسی طرح تھی۔سلیم کو راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی۔اس علاقے کا کوئی درخت ایسا نہ تھا جس کی تصویر اس کے ذہن پر نقش نہ تھی۔ اس آٹھ دس میل کے رقبے میں وہ اپنے گھوڑے پر کئی بار چکر لگا چکا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو موسلا دھار بارش معمولی بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔تاہم گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔اس نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی اندر سے ایک کتا بھونکنے لگا۔آس پاس کے مکانوں میں پناہ لینے والے کتوں نے اپنی اپنی جگہ سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ادھیڑ عمر کا ایک آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

سلیم نے اس کے سوال کا انتظار کیے بغیر کہا''چودھری رحیم بخش کا مکان کہاں ہے؟''

''اسی گلی کے موڑ پر پکی ڈیوڑھی والا اسی کا مکان ہے!''

''بھئی ذرا میرے ساتھ چلو شہر سے ڈاکٹر صاحب ان کے گھر آئے ہوئے ہیں۔میں ان کی تلاش میں آیا ہوں!''

''چلو!'' دیہاتی یہ کہہ کر سلیم کے آگے چل دیا۔ڈیوڑھی کے سامنے پہنچ کر اس نے کہا''یہ ہے ان کا مکان!''

ڈیوڑھی میں ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، دیہاتی نے اس سے کہا۔ ''بھئی فضل دین! ڈاکٹر صاحب یہیں ہیں نا؟''

''ڈاکٹر صاحب بیٹھک میں ہیں اور یہ گھوڑے پر کون ہے؟ آؤ بھئی! گھوڑا اندر لے آؤ! بارش میں کیوں کھڑے ہو!''

سلیم نے کہا ''نہیں مجھے جلدی ہے تم ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا دو!''

''تم انہیں لینے آئے ہو!''

''ہاں! ان کے لڑکے کو چوٹ آ گئی ہے۔ تم جلدی سے بلاؤ انہیں!''

نوکر بھاگ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لیمپ تھا اور اس کے پیچھے ڈاکٹر شوکت چلے آ رہے تھے!

''کون ہے؟'' ڈاکٹر نے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

سلیم نے کہا ''ڈاکٹر جی آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں، ارشد زخمی ہے!''

''ارشد زخمی ہے! لیکن تم کون ہو؟''

''جی میں سلیم ہوں! ارشد آج ہمارے گاؤں آیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا کہ اس کا سر درخت سے ٹکرا گیا میں شہر سے ہو کر آیا ہوں!''

''اب کہاں ہے ارشد؟''

''جی وہ ہمارے گھر میں ہے آپ جلدی کیجئے''

ڈاکٹر نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''بھئی تم جلدی سے میرے لیے چودھری صاحب کا گھوڑا تیار کر دو!''

سلیم نے کہا ’’ڈاکٹر صاحب! گھوڑا تیار کرنے میں دیر ہو جائے گی، آپ میرے پیچھے بیٹھ جائیں، ہم ایک پل میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ارشد بیہوش ہے۔‘‘

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا ’’ٹھہرو! میں اپنا تھیلا لے آؤں!‘‘

ڈاکٹر صاحب نوکر کے ہاتھ سے لیمپ چھین کر اندر بھاگے اور آن کی آن میں اپنا تھیلا اٹھا لائے۔

’’لائیے تھیلا مجھے دیجیے‘‘ سلیم نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ کہے بغیر تھیلا اس کے ہاتھ میں دے دیا۔سلیم نے گھوڑے کو ڈیوڑھی کی سیڑھی کے قریب لا کر کھڑا کر دیا اور ایک رکاب سے اپنا پاؤں نکالتے ہوئے کہا ’’آپ اس رکاب میں پاؤں رکھ کر میرے پیچھے بیٹھ جائیں!‘‘

نوکر نے کہا ’’بھئی تم ڈاکٹر صاحب کو آگے بیٹھنے دو اور خود پیچھے بیٹھ جاؤ۔‘‘

سلیم نے کہا ’’ڈاکٹر صاحب اس وقت رستہ نہیں پہچان سکیں گے‘‘

ڈاکٹر سلیم کے پیچھے سوار ہو گیا اور سلیم نے گھوڑے کو موڑ کر ایڑ لگا دی۔

ڈاکٹر نے کہا ’’بھئی! ذرا سنبھل کر چلو!‘‘

’’جی آپ فکر نہ کریں‘‘

گاؤں سے نکلتے ہی ڈاکٹر صاحب کے مختلف سوالات کے جواب میں سلیم نے مختصراً ساری سرگزشت بیان کر دی۔

ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا ’’کیا تم ہمارے گھر میں یہ بتا آئے ہو کہ ارشد زخمی ہے؟‘‘

''جی نہیں، ان کا خیال تھا کہ ارشد آپ کے ساتھ ہے۔ اس لیے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔''

''تم نے بہت اچھا کیا!''

بارش ختم چکی تھی اور بادلوں کی پھٹی ہوئی رداسے کہیں کہیں تارے جھانک رہے تھے۔ مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ تھکا ہوا گھوڑا گردن جھکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ تاہم جب بھی سلیم اسے ایڑ لگاتا، اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر صاحب، سلیم کی طرح کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔

افضل گھر کے چند اور آدمیوں کے ساتھ دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے گھوڑے کی آہٹ سنتے ہی دور سے آواز دی ''سلیم! ڈاکٹر صاحب کو لے آئے؟''

''لے آیا ہوں چچا!'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''بہت دیر لگائی تم نے!''

''چچا یہ ننگل گئے ہوئے تھے۔ ارشد اب کیسا ہے؟''

''خدا کا شکر ہے کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔''

یہ ان سینکڑوں التجاؤں کا جواب تھا جو سلیم نے سارے راستے خدا سے کی تھیں افضل نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو ارشد بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سلیم کی ماں اس کا سر اپنی گود میں لے کر اسے پنکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ گھر کی لڑکیاں اور عورتیں اس کے

گرد جمع تھیں۔

افضل کے اشارے سے تمام عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ارشد نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور نادم سا ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا ''شہسوار بننا آسان نہیں بیٹا!''

جب ڈاکٹر صاحب ارشد کے سر پر پٹی باندھ رہے تھے، سلیم نہانے کے بعد کپڑے بدل کر مسجد کا رخ کر رہا تھا۔

نماز کے بعد جب وہ ارشد کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! کہاں گئے تھے تم؟''

''جی میں نماز پڑھنے گیا تھا۔''

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کے دادا کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''چودھری جی! آپ کا پوتا بہت بہادر ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں شہر سے ہو کر آیا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔''

''یہ افضل کا شاگرد ہے گھوڑے کے سوا اسے کسی چیز سے انس نہیں۔ خدا آپ کے بچے کو شفا دے، میں بہت پریشان تھا۔ اب کوئی خطرہ تو نہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''نہیں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تاہم کل اور پرسوں کا دن اسے آپ کا مہمان رہنا پڑے گا۔ تیسرے دن میں اسے گھر لے جاؤں گا!''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بات نہیں ہو گی۔ آپ کا بچہ تندرست ہونے تک ہمارے پاس رہے گا۔ سلیم کی دادی نے اس کے تندرست ہونے پر ایک بکرے کی

نیاز دینے کی منت مانی ہے۔ آپ اپنے بال بچوں کو یہیں منگوالیں۔ ہم اپنے مکان کا ایک حصہ ان کے لیے خالی کر دیں گے، آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر آپ کو ہسپتال سے چھٹی نہ ملے تو ہمارا ایک گھوڑا آپ کے پاس رہے گا۔ آپ اسے دن میں دو بار دیکھ جایا کریں۔''

افضل نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! ارشد کے متعلق آپ کے گھر میں بہت پریشانی ہوگی۔ اگر آپ ان کی تسلی کے لیے رقعہ لکھ دیں تو میں ابھی بھجوا دیتا ہوں!''

ڈاکٹر نے کہا ''آپ کا بھتیجا بہت سمجھدار ہے۔ اس نے وہاں ارشد کے زخمی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال وہ اس کی غیر حاضری سے پریشان ہوں گے۔''

سلیم نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں نے ارشد کی امی سے وعدہ کیا تھا کہ میں صبح سویرے انہیں اس بات کا پتہ دوں گا کہ ارشد کہاں ہے۔ آپ اگر رقعہ لکھ دیں تو میں سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچا دوں گا!''

''تم تھک گئے ہوگے بیٹا!'' ڈاکٹر صاحب نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

سلیم کی بجائے افضل نے جواب دیا ''جب دوست کی زندگی کا سوال ہو تو تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔''

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''اچھا بیٹا! میں تمہیں رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ میرے تھیلے میں کچھ دوائیاں ہیں جن کی یہاں ضرورت ہے۔ ارشد کی ماں تمہیں وہ تھیلا دے دے گی اسے احتیاط سے لے آنا۔ اگر ارشد کی ماں یہاں آنے پر ضد کرے تو اسے کہنا کہ میں کوئی آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاؤں گا اور شام کو انہیں اپنے

ساتھ لے آؤں گا!''

چودھری رحمت علی نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ وہ سلیم کے ساتھ آ جائیں گی سلیم! تم مجید کو بھی ساتھ لے جاؤ، اگر وہ تمہارے ساتھ تیار ہو جائیں تو انہیں گھوڑوں پر بٹھا لینا اور خود باگ پکڑ کر ساتھ آنا۔''

☆☆☆☆☆

چودھری رحمت علی کا قیاس صحیح ثابت ہوا۔ علی الصباح ارشد کی ماں اپنے خاوند کا رقعہ پڑھنے اور سلیم اور مجید سے چند سوالات پوچھنے کے بعد بچوں سمیت ان کے ساتھ آنے پر تیار ہو گئی۔ ارشد کا چھوٹا بھائی امجد اپنی ماں کے ساتھ مجید کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور باقی دو لڑکیاں عصمت اور راحت سلیم کے گھوڑے پر بیٹھ گئیں۔ سلیم اور مجید ان گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر ان کے آگے آگے چل پڑے اور نوکر دوا کا تھیلا اٹھا کر ان کے پیچھے ہو لیا۔

راستے میں ارشد کی ماں نے سلیم سے کہا ''بیٹا تمہارا گھوڑا بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے کہیں اس کی باگ نہ چھوڑ دینا!''

''جی آپ فکر نہ کریں یہ گھوڑا مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔''

''بیٹا! پھر بھی اس کی باگ احتیاط سے پکڑنا، جانور کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔''

''جی آپ فکر نہ کریں!''

کچھ دیر ارشد کی ماں مجید اور سلیم سے ارشد کے متعلق پوچھتی رہی۔ عصمت نے

مڑ کر راحت کے کان میں کچھ کہا اور اس نے ماں سے شکایت کی۔

''امی عصمت کہتی ہے یہ گھوڑا مجھے کھا جائے گا۔''

مجید اور سلیم ہنس پڑے عصمت کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا اور اس نے راحت کے بازو پر چٹکی لی وہ چلائی ''امی عصمت مارتی ہے۔''

''کیا کرتی ہو عصمت؟'' ماں نے جھڑک کر کہا

عصمت کی عمر نو سال تھی راحت اس سے تین سال چھوٹی تھی اور امجد نے ابھی چوتھے برس میں پاؤں رکھا ہی تھا۔ ماں سے جھڑکی کھانے کے بعد عصمت کچھ دیر خاموش رہی اور پھر راحت کے کان میں کہنے لگی ''ان کے گاؤں میں بھوت ہوتے ہیں۔''

''تم جھوٹ کہتی ہو'' راحت نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا

راحت نے قدرے فکر مند ہو کر سوال کیا'' بھلا تمہارے گاؤں میں بھوت ہوتے ہیں؟''

''نہیں'' سلیم نے جواب دیا

''شیر ہوتے ہیں؟''

''شیر بھی نہیں ہوتے''

راحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا

''سانپ ہوتے ہیں؟''

عصمت نے دبی زبان سے کہا'' گاؤں میں بہت بڑے بڑے بڑے سانپ

ہوتے ہیں وہ بچوں کو کھا جاتے ہیں!''

راحت نے پھر اپنی ماں سے فریاد کی ''امی آپا کہتی ہے، مجھے سانپ کھا جائے گا۔ میں گاؤں میں نہیں جاؤں گی!''

ماں نے عصمت کو ایک جھڑکی اور دی سلیم نے راحت کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''سانپ گاؤں میں نہیں آتے!''

راستے میں برساتی نالہ آیا تو عصمت نے کہا ''اب تم ڈوب جاؤ گی!''

''بھلا میں ڈوب جاؤں گی؟'' راحت نے فکرمندسی ہو کر سلیم سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ تمہاری بہن تمہیں یونہی ڈرا رہی ہے۔''

☆☆☆☆☆

ارشد کی والدہ اور بچے سلیم کے گھر کے ماحول سے جلد ہی مانوس ہو گئے۔ سلیم کا چھوٹا بھائی یوسف، امجد کو اپنے ساتھ لے کر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ عصمت اور راحت کو امینہ، صغریٰ اور زبیدہ جیسی سہیلیاں مل گئیں۔

ارشد کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہہ چکے تھے کہ اس کی حالت تسلی بخش ہے اور وہ دوپہر کے بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے شہر چلے گئے۔

زبیدہ کے اصرار پر سلیم نے باہر کی حویلی میں درخت کے ساتھ جھولا ڈال دیا اور لڑکیاں وہاں جمع ہو گئیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ ارشد کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کی جائیں، اس لیے سلیم کی ماں نے اس بات کا خیال رکھا کہ گاؤں کی

عورتیں اس کے گرد جمع نہ ہوں۔ وہ خود ارشد کی ماں کے ساتھ سارا دن ارشد کے پاس بیٹھی رہی سلیم کے لیے خاموش رہنے کا یہ حکم بہت صبر آزما تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر پھر باہر نکل جاتا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہتا، ارشد کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز رہتیں۔

عصر کے وقت سلیم اس کے کمرے سے نکل کر نماز کے لیے جارہا تھا تو ارشد نے نحیف آواز میں کہا ''سلیم!''

سلیم مڑ کر اس کے بستر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ارشد نے کہا ''کہاں جارہے ہو! بیٹھ جاؤ!''

سلیم نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا ''میں نماز کے لیے جارہا تھا!''

ارشد نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں، رات کو مجھے کہانی سناؤ گے؟''

سلیم اب کہانی سنانے کے مطالبہ پر چڑا کرتا تھا لیکن ارشد کی درخواست پر اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''سناؤں گا!''

رات کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں کمرے کے اندر حبس تھا، اس لیے ارشد کو برآمدے میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب جو شام کے وقت واپس آگئے تھے، کھانا کھانے کے بعد گھر کے آدمیوں کے ساتھ باہر کی حویلی کے کشادہ برآمدے میں لیٹ گئے۔

سلیم نے عشاء کی نماز کے بعد ارشد کے قریب بیٹھ کر کہانی شروع کر دی۔ ایک،

صغریٰ، زبیدہ اور ارشد کی بہنیں برآمدے کے دوسرے سرے پر چارپائیوں پر بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں اچانک زبیدہ کے کان میں سلیم کی آواز پڑی اور اس نے کہا ''امینہ بھائی جان کہانی سنا رہے ہیں!''

آن کی آن میں امینہ، صغریٰ اور زبیدہ سلیم کے گرد جمع ہو گئیں۔ رضیہ کہہ رہی تھی '' بھائی جان ہم بھی سنیں گے، شروع سے سناؤ!''

صغریٰ نے کہا '' آؤ عصمت تم بھی یہاں آ جاؤ۔ بھائی سلیم بڑی اچھی کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔''

سلیم نے کچھ دیر ٹال مٹول کی لیکن جب عصمت اور راحت بھی اس کے قریب آ گئیں تو اس سے انکار کرتے نہ بنی اس نے کہا ''اچھا تم میں سے کسی نے شور مچایا تو پیٹوں گا!''

راحت نے معصومانہ انداز میں کہا ''مجھے پیٹو گے تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی''

سلیم کی ماں اور چچیاں جو ارشد کے دوسری طرف چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ہنس پڑیں

سلیم نے کہا ''تمہیں نہیں پیٹوں گا آؤ تم یہاں بیٹھ جاؤ!''

راحت بے تکلفی سے سلیم کے قریب بیٹھ گئی امینہ ایک چارپائی گھسیٹ کر سلیم کے قریب لے آئی اور باقی لڑکیاں اس پر بیٹھ گئیں۔

سلیم نے کہانی شروع کی کچھ عرصہ سے وہ مجبوری کی حالت میں کبھی کبھی اپنی بہنوں کو ٹالنے کے لیے مختصر سی کہانی سنا دیا کرتا تھا۔ لیکن آج مدت کے بعد وہ اس

کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔شروع شروع میں اسے اس بات کا احساس تھا کہ ارشد شاید اس کہانی میں دلچسپی نہ لے، اس لیے اس نے چند بار باقی اگلی شب سنانے کا وعدہ کرکے کہانی ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ارشد ہر مرتبہ کہہ دیتا نہیں بھئی! ساری سناؤ!

سلیم کا عصمت کے متعلق بھی یہ خیال تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طرح ذہین ہے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے وہ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز تبسم دیکھ رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ سب سے زیادہ متاثر ہے۔

سلیم کی کہانی کا شہزادہ کسی صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں عصمت کی معصوم نگاہیں یہ کہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں کہ کاش میں اسے پانی پلا سکتی۔سلیم کی کہانی کا خونخوار آدمی سوئے ہوئے شہزادے کو زنجیروں میں جکڑ رہا تھا اور عصمت کے چہرے کا حزن وملال اس احساس کی ترجمانی کر رہا تھا کہ کاش کوئی اسے جگا دے اور جب کوئی نیک دل انسان شہزادے کی زنجیریں کھول رہا تھا تو اس کا خوبصورت چہرہ مسرتوں کا گہوارہ بن رہا تھا۔

کہانی کا جو اختتام سلیم کے ذہن میں تھا، وہ بہت دردناک تھا۔شہزادہ شادی کے دن گھوڑے سے گر کر مر جاتا تھا اور شہزادی اس کا جنازہ دیکھ کر محل سے چھلانگ لگا دیتی تھی لیکن سلیم کو عصمت کا لحاظ کرنا پڑا۔شہزادہ گھوڑے سے گرتے گرتے سنبھل گیا اور شہزادی کو محل سے گرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

سلیم نے کہانی ختم کی تو لڑکیوں نے ایک اور کہانی کا مطالبہ کیا لیکن سلیم کی ماں نے کہا "نہیں دوسری کہانی کل سن لینا۔ اب ارشد کو آرام کرنے دو۔"

سلیم بالا خانے پر جا کر لیٹ گیا باہر کی حویلی میں آدمیوں کی محفل گرم تھی اور چچا اسماعیل کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ مجید وہاں ہوگا، سلیم کے دل میں وہاں جانے کا خیال آیا لیکن تھکاوٹ کے احساس سے وہ بستر پر پڑا رہا۔ اسے جلد ہی نیند آ گئی تھوڑی دیر میں وہ سپنوں کی حسین وادی میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک شہزادہ تھا اور ایک حسین شہزادی کو درندوں کے نرغے سے چھڑا رہا تھا۔ شہزادی کو ایک خوفناک جن نے اٹھا کر ایک ایسے پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا تھا جہاں پہنچنے کے تمام راستے مسدود تھے اور وہ ہوا میں اڑ کر وہاں پہنچ رہا تھا۔

وہ صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور شہزادی اس کے لیے پانی لے کر آ رہی تھی اور اس شہزادی کی شکل و صورت اس لڑکی سے ملتی تھی جو رات کے وقت ہمہ تن گوش بن کر اس سے کہانی سن رہی تھی۔

صبح ہوئی تو اس نے نیم خوابی کی حالت میں محسوس کیا کہ کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے وہ چونک کر اٹھا امینہ پانی کا لوٹا لیے کھڑی تھی۔

"امینہ کی بچی ٹھہرو۔۔۔۔۔!" وہ غضب ناک ہو کر اٹھا لیکن اس کے پیچھے زبیدہ اور عصمت کو دیکھ کر اس کا غصہ جاتا رہا۔

امینہ نے کہا "واہ جی، نیکی کرو تو گالیاں ملتی ہیں۔ نماز کا وقت جا رہا تھا اور تم مزے سے خراٹے لے رہے تھے۔"

سلیم نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا لے لیا۔ باہر جاتے جاتے اس نے ایک لمحہ کے لیے رک کر عصمت کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سپنوں کی شہزادی یاد آ گئی۔

چھ دن بعد ارشد کو اس کا باپ اپنے گھر لے گیا۔ ارشد کی ماں نے رخصت ہوتے وقت سلیم کی ماں اور اس کی چچیوں سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھی ان کے گھر آیا کریں گی۔ امینہ، صغریٰ اور زبیدہ سے رخصت ہوتے وقت عصمت اور راحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سلیم کی دادی کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ان کی سہیلیوں کو کبھی کبھی مجید اور سلیم کے ساتھ شہر بھیج دیا کریں گی۔

اس کے بعد ارشد کی ماں دو تین ہفتوں میں ایک بار ضرور سلیم کے گھر آتی، اگر اسے دیر ہو جاتی تو سلیم کی ماں اور چچیاں لڑکیوں کے ساتھ شہر چلی جاتیں۔

ارشد کو اس کے باپ نے بائیسکل خرید دی تھی، اس لیے وہ قریباً ہر اتوار اس کے گاؤں آ جاتا اور جب وہ نہ آتا، سلیم گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے گھر چلا جاتا۔

مجید چھٹی کے دن گاؤں کے لڑکوں کے سات کبڈی کھیلا کرتا تھا، کشتی لڑا کرتا تھا اور افضل سے گتکا سیکھا کرتا تھا۔ اسے سلیم کے مشاغل سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆☆☆

فروری کے آخری دن تھے وہ درخت جنہیں خزاں نے سبز پتوں سے محروم کر دیا تھا، سرخ کونپلوں کے زیور سے آراستہ ہو رہے تھے۔ آلوچہ، ناسپاتی اور آڑو کے

درختوں کی شاخیں پھولوں میں چھپ رہی تھیں۔ بیریوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے جھک رہی تھیں کھیتوں میں گندم لہلہا رہی تھی۔ سرسوں پھول رہی تھی، خالی کھیتوں میں انواع واقسام کی گھاس، پودے اور بیلیں اگ رہی تھیں۔ غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو موسم بہار کے سبز لبادے سے محروم ہو۔ خودرو پودوں اور بیلوں میں رنگا رنگ کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ننھے ننھے سرخ پھول جن کی زندگی فقط ایک آفتاب کے طلوع وغروب تک محدود ہوتی ہے، جو گھاس کی سبز چادر پر یاقوت، زمرد، نیلم اور عقیق کے نگینے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مصور فطرت کی وہ ننھی اور دلفریب تصویریں ہیں، جن کے رنگ اور مہک کی تخصیص کے لیے انسان نے ابھی تک جدا جدا الفاظ ایجاد نہیں کیے۔ ان میں ہر ایک دیکھنے والوں سے اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہے۔۔۔ ''میری طرف دیکھو، مجھے سونگھو، مجھے چوم لو، تم کہاں بھٹک رہے ہو؟ تم کس کے متلاشی ہو؟ میری زندگی مختصر ہے لیکن تمہارے لیے میں ایک حقیقتِ ابدی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے کسی نے بنایا ہے کسی نے رنگینی، رعنائی اور مہک عطا کی ہے۔ میں تمہارے سامنے کائنات کے اس خالق اکبر کا پیغام لے کر آیا ہوں جس کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں، بادل آتے ہیں، مینہ برستا ہے اور زمین اپنی گود میں چھپے ہوئے خزانے اگلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان ہاتھوں کو پہچانو! جنھوں نے مجھے زمین کی تاریک گود سے باہر نکالا ہے، جن کی لوریوں نے مجھے مسکراہٹیں عطا کی ہیں۔ یہی ہاتھ ہیں جو رات کے وقت آسمان پر تاروں کی قندیلیں روشن کرتے ہیں اور صبح کے وقت سورج کے چہرے سے نقاب الٹ دیتے ہیں۔ تم کہاں بھٹک رہے

ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف دیکھو!‘‘

یہ وہ موسم تھا جب سلیم کی تمام دلچسپیاں اپنے گاؤں میں مرکوز ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ علی الصباح اٹھتا اور نماز کے بعد سیر کے لیے باہر نکل جاتا۔ گاؤں سے باہر کسی کھیت میں کھڑا ہو کر وہ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کے عقب سے طلوع آفتاب کا منظر دیکھتا۔ شبنم میں دھلے ہوئے پھول توڑتا۔ فضا میں مرغابیوں کی ڈاریں بیاس کے کنارے جھیلوں کا رخ کرتی نظر آتیں۔ مور کھیتوں میں مچلنے کے لیے گھنے باغات سے باہر نکل آتے۔ ان دلکش مناظر کی سیر کے بعد وہ اچھلتا کودتا اور بھاگتا ہوا گھر پہنچتا اور کھانا کھانے کے بعد اسکول روانہ ہو جاتا۔

ایک اتوار سلیم گھر پر ارشد کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ حسب وعدہ نہ آ سکا۔ اگلے دن سلیم اسکول گیا تو ارشد اسے فکر مند دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا ’’کیوں ارشد! تمھیں کسی نے پیٹا ہے؟‘‘

ارشد نے کوئی جواب نہ دیا۔

’’دیکھو بھئی! پچھلے اتوار تم ہمارے گاؤں نہیں آئے تھے، اس اتوار ضرور آنا!‘‘

ارشد نے جواب دینے کی بجائے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم نے فکر مند ہو کر سوال کیا ’’ارشد کیا بات ہے گھر میں خیریت ہے نا؟‘‘

اس نے جواب دیا ’’سلیم! ابا جان کی تبدیلی ہو گئی ہے ہم پرسوں جا رہے ہیں؟‘‘

’’کہاں؟‘‘ سلیم نے مضطرب ہو کر سوال کیا

''امرتسر!''

سلیم دیر تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی اور دعا کے بعد وہ کلاس روم میں چلے گئے استاد آئے اور اپنا اپنا مضمون پڑھا کر چلے گئے لیکن سلیم کے ذہن میں بار بار امرتسر کا لفظ گھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس بات کا سہارا لے کر ارشد کی طرف دیکھتا کہ شاید اس نے مذاق کیا ہو لیکن ارشد کے چہرے کا حزن وملال اس خیال کی تردید کر دیتا۔

جب چھٹی ہوئی اور لڑکے اپنے بستے اٹھا کر باہر نکل گئے تو ارشد اور سلیم اپنا اپنا بستہ باندھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجید اور باقی ساتھی باہر کھڑے سلیم کا انتظار کر رہے تھے۔

مجید نے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی ''آؤ سلیم! نہیں تو ہم جاتے ہیں!''

''آتا ہوں!'' سلیم نے یہ کہہ کر بستہ اٹھا لیا لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد رک کر ارشد کی طرف دیکھنے لگا۔

ارشد نے کہا ''ہمارے گھر نہیں چلو گے؟ امی جان نے تمہیں بلایا ہے!''

''چلو!''

ارشد اور سلیم باہر نکلے تو مجید نے کہا ''تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں؟''

سلیم نے کہا ''مجید میں ذرا ارشد کے گھر جا رہا ہوں!''

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا''

ارشد نے کہا ''امی جان سلیم کے ہاتھ کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہیں، چلو تم بھی!''

مجید نے گاؤں کے ایک کھیت میں تلیر پکڑنے کے لیے پھندا لگا رکھا تھا اور اسے شام سے پہلے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔ اس نے کہا ''نہیں بھئی ہم جاتے ہیں''

سلیم ارشد کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر ارشد نے کہا ''تم ذرا ٹھہرو! میں تمہیں تماشا دکھاتا ہوں''

سلیم دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ارشد مسکراتا ہوا داخل ہوا اس کی ماں کرسی پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی اس نے ارشد کو دیکھتے ہی کہا ''بیٹا! میں نے تمہیں کہا تھا کہ سلیم کو ساتھ لے کر آنا؟''

''امی جان وہ نہیں آیا!'' ارشد نے مغموم چہرہ بناتے ہوئے جواب دیا

''تم نے اسے بتایا نہیں کہ ہم جا رہے ہے؟''

''بتایا تھا لیکن وہ نہیں آیا!''

عصمت نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے کہا ''امی، بھائی جان اسے کہتے تو وہ ضرور آتا انہوں نے کہا ہی نہیں ہوگا!''

ارشد بولا ''وہ کہتا تھا کہ عصمت چڑیل ہے، مجھے تنگ کرتی ہے میں نہیں جاؤں گا!''

''آپا چڑیل! چڑیل!!'' راحت نے تالی بجاتے ہوئے کہا

''تم جھوٹ کہتے ہو، وہ مجھے چڑیل نہیں کہہ سکتا۔''

''اگر وہ تمہارے منہ پر کہہ دے کہ تم چڑیل ہو تو پھر مان لوگی؟''

ارشد کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر عصمت پھاٹک کی طرف بھاگی، سلیم اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ عصمت منہ بسورنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

سلیم نے اپنا بستہ اس کے سر پر رکھ دیا اور وہ منہ دوسری طرف پھیر کر ہنسی ضبط کر رہی تھی۔

''دیکھو کہیں گرا نہ دینا میری سلیٹ ٹوٹ جائے گی!'' سلیم نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔ عصمت ایک ثانیے کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہی لیکن جب بستہ گرنے لگا تو دونوں ہاتھوں سے اسے تھام کر ہنسنے لگی۔

سلیم نے آگے بڑھ کر ارشد کی ماں کو سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹا! بیٹھ جاؤ!'' ماں نے سرکنڈے کے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ سلیم بیٹھ گیا۔ راحت نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا'' آپ چڑیل ہے نا؟''

سلیم نے جواب دیا ''نہیں! چڑیل کے بال بکھرے رہتے ہیں اور وہ جوتا بھی نہیں پہنتی!''

راحت نے پریشان ہو کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

ماں نے کہا ''عصمت جاؤ، سلیم کے لیے گاجر کا حلوہ لے آؤ!''

ارشد نے ایک کونے سے تپائی اٹھا کر سلیم کے سامنے رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر

اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بیٹا چائے بنواؤں؟''

''نہیں جی!''سلیم نے جواب دیا

عصمت نے حلوے کی پلیٹ لا کر تپائی پر رکھ دی ماں بولی''بیٹا! مجید کو بھی لے آتے!''

ارشد نے کہا''میں نے تو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا!''

سلیم نے کہا''اس نے تلیر پکڑنے کے لیے پھندا لگا رکھا ہے، شام کو بہت تلیر پھنستے ہیں۔اس لیے اسے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔''

امجد صحن میں اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا وہ پہلی بار سلیم کی طرف متوجہ ہوا''مجھے بھی ایک تلیر لا دو گے نا؟''

''لا دوں گا!''سلیم نے جواب دیا اور امجد پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گیا۔

ارشد کی ماں نے کہا''بیٹا ارشد نے تمہیں بتایا ہو گا کہ اس کے ابا جان امرتسر تبدیل ہو گئے ہیں!''

''جی ہاں!''

''انہوں نے دس دن کی چھٹی لی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ جانے سے پہلے ہم سب دو تین دن تمہارے گاؤں رہیں گے اس کے بعد میں تمہاری ماں اور چچیوں کو یہاں آنے کی دعوت دوں گی لیکن جالندھر میں ارشد کے ماموں کی شادی ہے اور ہم پرسوں وہاں جا رہے ہیں۔اب میں کل صبح تک تمہارے گاؤں آؤں گی اور شام کو

واپس چلی آؤں گی!''

عصمت بولی ''امی جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی!''

''ہم سب چلیں گے ارشد کے ابا سامان وغیرہ بندھوانے میں مصروف ہوں گے اس لیے شاید وہ نہ جاسکیں۔''

سلیم نے کہا ''میں گھوڑے لے آؤں گا!''

''نہیں ہم تانگے پر آئیں گے سڑک پر ہم تانگہ چھوڑ دیں گے اور وہاں سے پیدل چلیں گے واپسی پر پھر سیر کرتے آئیں گے!''

شام کے قریب سلیم نے ارشد کی امی سے اجازت لی اور اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ مغربی افق پر سورج جھک کر زمین کے کنارے کو چھو رہا تھا اور شفق کی سرخی کا عکس کانگڑہ کے پہاڑوں پر پھیل رہا تھا۔ چوٹیوں پر برف کے تودے سونے کے انبار نظر آتے تھے۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کا رخ کر رہے تھے۔ مرغابیاں، سرخاب اور کونجیں علیحدہ علیحدہ قطاروں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔ موروں کی ٹولیاں گندم، چنے اور سرسوں کے کھیتوں سے نکل نکل کر درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اس کی الوداعی مسکراہٹیں ابھی تک برفانی پہاڑ کی چوٹیوں پر رقص کر رہی تھیں۔

سلیم نے راستے میں ایک رہٹ پر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر بستہ اٹھا کر چل دیا۔ پگڈنڈی پر ایک خرگوش اسے دیکھ کر بھاگا لیکن اس نے کوئی دل چسپی نہ لی۔

نالے کے کنارے سارس کا جوڑا منہ اٹھائے کھڑا تھا لیکن اس نے توجہ نہ کی، وہ پریشان تھا۔ ارشد جا رہا تھا، امجد جا رہا تھا، عصمت اور راحت جا رہی تھیں اس کی زندگی کی معصوم مسکراہٹیں چھن رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

اگلے دن وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا تھا جب وہ ٹانگے کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تو سرسوں کے پھول توڑنے لگا۔ اس نے تین گلدستے بنائے سب سے بڑا عصمت کے لیے، اس سے چھوٹا راحت کے لیے اور سب سے چھوٹا امجد کے لیے پھر کچھ سوچ کر سب سے بڑا گلدستہ اٹھایا اور ننھی ننھی بیلوں اور پودوں سے مختلف رنگوں کے پھول توڑ کر اس میں لگانے شروع کر دیے۔ گلدستے زمین پر رکھ کر وہ پگڈنڈی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور جیب سے چاقو نکال کر زمین کھودنے لگا۔ کوئی ایک بالشت گہرا گڑھا کھودنے کے بعد اس نے اسے پھر مٹی سے بھر دیا اور اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا چند مسافر سڑک پر سے گزر رہے لیکن حد نگاہ تک تانگے کا نام ونشان نہ تھا وہ مایوس سا ہو کر پھر بیٹھ گیا اور چاقو کے ساتھ پگڈنڈی کی ہموار سطح پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا۔ سرسوں کے پھولوں کی تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن مختلف رنگوں کے وہ نرم اور نازک پھول جو اس نے عصمت کے گلدستے میں جمع کیے تھے۔ مرجھا رہے تھے سلیم نے اپنے اردگرد تمام جگہ لکیروں سے بھر دی۔ پھر ایک صاف جگہ منتخب کر کے بیٹھ گیا اب وہ لکیریں کھینچنے اور

دائرے بنانے کی بجائے مختلف نام لکھ رہا تھا۔ اپنے نام کے بعد اس نے ارشد، مجید اور سکول کے باقی دوستوں کے نام لکھ دیے۔ پھر اسے پرائمری سکول کے ساتھی یاد آ گئے اور وہ ان کے نام لکھنے لگا۔ یہ جگہ بھر گئی تو وہ کھسک کر اور آگے ہو گیا اس نے گلدستے میں چند مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھا اور زمین پر ایک اور نام لکھ دیا وہ نام جس کی اہمیت وہ پہلی بار شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا ''عصمت'' کے لفظ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں لطیف قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے وہ تمام دوست جن کے نام وہ پہلے لکھ چکا تھا اس کی اس حرکت پر ہنس رہے ہیں اس نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر ''عصمت'' کا نام مٹا دیا اور اٹھ کر شہر کی طرف دیکھنے لگا کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تانگہ آ رہا تھا اور وہ جلدی سے جھک کر باقی ناموں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

تانگہ قریب آ گیا تو اس نے پھولوں کے گلدستے اٹھا لیے لیکن پھر کچھ سوچ کر بڑا گلدستہ گندم کے پودوں میں چھپا دیا تانگہ پگڈنڈی کے پاس آ کر رکا امجد اور راحت نے اترتے ہی اس کے ہاتھ سے گلدستے چھین لیے اور عصمت قدرے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

راحت نے کہا ''آپا کو بھی پھول توڑ دو نا!''

''میں پھول نہیں لوں گی'' عصمت نے منہ بسورتے ہوئے کہا

ارشد کی ماں نے کہا ''بیٹا! تم کب سے یہاں کھڑے ہو؟''

''میں بہت دیر سے یہاں کھڑا ہوں!''

ارشد بولا ”ہمیں دیر ہو گئی میرا خیال تھا کہ تم گھوڑے پر شہر پہنچ جاؤ گے!“

سلیم نے کہا اگر میں یہاں تک پیدل نہ آیا ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتا!

ارشد کی ماں نے کوچوان سے کہا ”اب تم جاؤ! شام کو ہم پیدل آ جائیں گے!“

ارشد امجد کی انگلی پکڑ کر آگے آگے ہو لیا اور اس کی ماں، راحت اور عصمت اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ سلیم نے کھیت میں چھپایا ہوا گلدستہ اٹھایا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر عصمت کے سر پر رکھ دیا۔ عصمت پہلے چونکی، اس کے بعد اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر گلدستے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہنسنے لگی۔

اب وہ راحت کو چڑا رہی تھی ”دیکھو تمہارا گلدستہ چھوٹا ہے اور میرا بڑا ہے، تمہارے ایک رنگ کے پھول ہیں اور میرے کئی رنگ کے ہیں!“

راحت کچھ دیر صبر کے ساتھ ہنستی رہی لیکن بالآخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ گلدستہ پھینک کر پگڈنڈی پر بیٹھ گئی ارشد اور اس کی ماں ہنس رہے تھے اور سلیم اسے منا رہا تھا ”دیکھو بھئی! آگے بہت پھول ہیں، میں تمہیں اس سے بھی بڑا گلدستہ بنا دوں گا!“

”مجھے لال رنگ کے پھول بھی توڑ کے دو گے نا!“ راحت نے اٹھتے ہوئے کہا

”وہ بھی توڑ دوں گا!“

اب امجد کی باری تھی اس نے بے پروائی سے اپنا گلدستہ پھینکتے ہوئے کہا ”میں بھی لال رنگ کے پھول لوں گا!“

سلیم نے دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا ”اچھا گاؤں پہنچ کر میں تم سب کو پھول لا

دوں گا"

گاؤں پہنچ کر راحت اور عصمت، زبیدہ اور سلیم کی چچا زاد بہنوں کے ساتھ کھیلتی رہیں اور ارشد، سلیم، مجید، گلاب سنگھ اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتا رہا۔گھر کی تمام عورتوں کی خواہش تھی کہ ارشد کی ماں کم از کم ایک رات ضرور ان کے ہاں ٹھہرے لیکن جب ارشد کی ماں نے کہا کہ وہ کل دس بجے کی گاڑی سے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو انہوں نے اصرار نہ کیا۔

ارشد کی ماں نے سلیم کی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ امرتسر سے خط لکھا کرے گی اور کبھی کبھی ملنے بھی آیا کرے گی عصمت نے سلیم کی چھوٹی بہن زبیدہ اور اس کی چچا زاد بہنوں صغریٰ اور امینہ سے خط و کتابت جاری رکھنے کا وعدہ کیا جب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ارشد نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ سلیم کی والدہ سے مخاطب ہو کر بولی:

"بہن! سلیم کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو، رات یہ ہمارے پاس رہے گا، صبح ہم گاڑی پر سوار ہو جائیں گے اور یہ سکول چلا جائے گا۔"

ماں نے خوشی سے سلیم کو اجازت دے دی

رات کے وقت ارشد، عصمت، راحت اور امجد اپنے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں سلیم کے گرد بیٹھ کر کہانی سن رہے تھے دوسرے کمرے میں ڈاکٹر شوکت آرام کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے ارشد کی ماں ان کے قریب بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔

''سلیم بہت ہونہار لڑکا ہے!'' ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''آج میں ارشد کا سرٹیفکیٹ لینے گیا تھا تو ہیڈ ماسٹر بھی اس کی تعریف کرتا تھا!''

وہ مسکرا کر بولی ''میں نے آج اس کی ماں سے کہا تھا کہ جب بہو تلاش کرنے کے لیے نکلو تو سب سے پہلے میرے گھر آنا اور وہ پھولی نہیں سماتی تھی وہ عصمت کو گود میں لے کر پیار کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگی ''بہن! مجھے تو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے اپنی بہو ڈھونڈ لی ہے کہو تو ابھی مٹھائی بانٹ دوں''

''بس وہی عورتوں والی بات، بچہ ابھی گود میں ہوتا ہے اور شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں!''

وہ بولی ''ذرا دیکھو تو اٹھ کر، یہ جوڑا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے میں تو کہتی ہوں دو تین برس کے بعد بات پکی ہو جائے آج کل اول تو اچھے خاندان نہیں ملتے اور اگر خاندان مل جائے تو لڑکے آوارہ ہوتے ہیں!''

ڈاکٹر صاحب نے قدرے نرم ہو کر کہا ''بھئی خاندان تو بہت اچھا ہے، اب لڑکے کو اچھی تعلیم دلوائیں تو دیکھا جائے گا!''

''وہ کوئی نادار تھوڑے ہیں اس کی ماں کہتی ہے کہ ہم اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے!''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا ''بھئی اگر وہ ولایت سے ہو آیا تو پھر تم کوئی توقع نہ رکھنا پھر وہ نہ ان کا نہ ہمارا''

''خدا کے لیے کوئی نیک دعا کرو!'' وہ سنجیدہ ہو کر بولی

اگلے دن سلیم اسٹیشن پر انہیں الوداع کہہ رہا تھا گاڑی دھوئیں کے بادل اڑاتی ہوئی آئی اور وہ سب سوار ہو گئے ارشد اپنے باپ کے ساتھ مردانہ ڈبے میں بیٹھا۔ عصمت، راحت اور امجد اپنی ماں کے ساتھ زنانہ ڈبے میں سوار ہو گئے ان کا نوکر علی الصباح ٹرک پر سامان لاد کر روانہ ہو چکا تھا۔

گاڑی نے سیٹی بجائی ارشد کے باپ نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے خدا حافظ کہا سلیم نے مصافحہ کیا پھر جلدی سے ارشد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ارشد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے عصمت اور راحت اس کی طرف جھانک رہی تھیں گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور انجن ''پھپ، پھپ'' کرتا چل پڑا۔ عصمت اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھ رہی تھی گاڑی نکل گئی اور ساتھ ہی سلیم کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

''ارے تم رو رہے ہو؟'' کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مجید کی آواز پہچان کر اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور کوئی بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔

دوسرا حصہ

دھڑکنیں

وقت گزرتا گیا شاہراہ حیات پر زندگی کے سادہ، رنگین اور دلفریب نقوش ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہوتے گئے۔ سلیم اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور کے ایک کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مجید میٹرک کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سلیم کے گاؤں کے دو اور ساتھی گلاب سنگھ اور رام لال میٹرک سے پہلے ہی سکول چھوڑ چکے تھے رام لال کو شہر کے کارخانے میں منشی کی جگہ مل گئی تھی اور گلاب سنگھ کاشتکاری میں اپنے باپ اور چچوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

پڑوس کے گاؤں میں بلونت سنگھ اور رکندن لال امرتسر کے کسی کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ پرائمری سکول والے گاؤں کے ماسٹر کا لڑکا احمد ضلع کے کسی دفتر کا کلرک اور پٹواری کا لڑکا معراج الدین ریلوے میں بابو بن چکا تھا۔

ڈاکٹر شوکت کی تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ ارشد کے ساتھ سلیم کی خط و کتابت رہی اس کے بعد سلیم کو چند خطوط کا جواب نہ آیا اور خط و کتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا، زبیدہ، امینہ اور صغریٰ کے نام عصمت کے خطوط آتے رہے لیکن ان کی طرف سے باقاعدہ جواب نہ جانے پر وہ بھی خاموش ہوگئی۔

کالج میں سلیم کی دلچسپیوں کے ہزاروں اسباب تھے وہ ان نوجوانوں میں سے

تھا جنہیں ہر ماحول میں دوست اور قدردان مل جاتے ہیں۔ ہوسٹل میں اس کی شگفتگی اور زندہ دلی مشہور تھی۔ طلباء کی کسی محفل میں کالج کے ذہین اور ہونہار لڑکوں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتیں تو سلیم کا ذکر بھی ضرور آتا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس نے چند نظمیں اور کہانیاں لکھیں تھیں جنہیں وہ چھپا کر رکھا کرتا تھا لیکن وہ خصائل جو قدرت کے عطا کردہ ہوں، دیر تک پوشیدہ نہیں رہتے سلیم نے جھجکتے جھجکتے اپنی ایک نظم کالج کے میگزین میں بھیج دی۔ ایڈیٹر نے نہ صرف اسے شائع کیا بلکہ اس کی تعریف میں ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا۔ یہ اس کی شہرت کا آغاز تھا اس کے بعد اس نے دیہاتی زندگی کے متعلق ایک افسانہ لکھا جسے نظم سے کہیں زیادہ پسند کیا گیا۔

اسی افسانے کی بدولت وہ اختر کے ساتھ متعارف ہوا۔ اختر اس سے ایک جماعت آگے تھا اور اس کا شمار کالج کے ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ کالج کے میگزین کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل اور اخبارات کے لیے سیاسی مضامین لکھا کرتا تھا۔ وہ چھریرے بدن کا ایک مختصر انسان تھا لیکن اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ ہوسٹل میں وہ بہت کم لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ کھانے کی میز پر لڑکے ایک دوسرے کی معمولی شرارتوں پر قہقہے لگاتے لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لڑکے کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیتے اور ہر ایک دوسرے کی سننے کی بجائے اپنی سنانے کے لیے زیادہ بے قراری ظاہر کرتا۔ اختر کو اگر موضوع سے دلچسپی نہ ہوتی تو چپکے سے کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا

لیکن جب کبھی وہ بولتا، سننے والے یہ محسوس کرتے کہ وہ بحث میں حصہ لینے کی بجائے اپنا فیصلہ سنا رہا ہے کبھی کبھی کالج میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر تقریریں ہوتیں تو اختر ان میں بھی حصہ لیتا اور موضوع کی موافقت اور مخالفت میں اس کی تقدیر فیصلہ کن سمجھی جاتی۔

سلیم کے ساتھ اختر کی پہلی ملاقات بہت مختصر تھی ایک دن وہ تیزی سے ہوسٹل کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا اور اختر اوپر آ رہا تھا۔موڑ پر دونوں کی ٹکر ہوگئی۔اختر کے ہاتھ سے کتابیں گر پڑیں۔

''اوہو معاف کیجئے!''سلیم نے پریشان سا ہو کر کہا

''کوئی بات نہیں''اس نے مسکرا کر جواب دیا

سلیم نے جلدی سے کتابیں اٹھا کر اسے پیش کیں اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا

اختر نے کہا''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں لیٹر بکس میں خط ڈالنے جا رہا ہوں''

''بھئی اگر تکلیف نہ ہو تو ایک خط میرا بھی لے جاؤ میں نے کل سے لکھ رکھا ہے باہر نکلتا ہوں تو یاد نہیں رہتا۔''

''بہت اچھا لائیے!''سلیم اختر کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوا اختر نے میز سے خط اٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔غالباً کالج میگزین میں''آخری مسکراہٹ''کے عنوان سے آپ ہی کا افسانہ شائع ہوا ہے!

''جی میں نے یونہی لکھ دیا تھا''

''مجھے آپ کی طرز تحریر بہت پسند آئی ہے افسانے کا پلاٹ بھی بہت دل کش تھا لیکن مجھے سب سے زیادہ اس کے وہ حصے پسند ہیں جن میں آپ نے گاؤں کے مناظر پیش کیے ہیں شاید اس لیے کہ میں گاؤں کی زندگی سے قطعاً نا آشنا ہوں دیہاتی زندگی کے متعلق آپ نے اور بھی کچھ لکھا ہے؟''

سلیم نے کہا ''گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے ایک مضمون لکھا تھا اس کا عنوان ہے ''میرا گاؤں'' وہ کافی طویل ہے آپ کو کبھی فرصت ہو تو میں دکھاؤں گا!''

''بھئی میں ضرور پڑھوں گا اگر آپ کے پاس ہے تو ابھی دے دیجئے۔ مجھے اس وقت کوئی کام نہیں!''

سلیم نے قدرے پریشان ہو کر کہا ''مجھے ڈر ہے کہ اس میں بعض واقعات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر آپ ہنسیں گے''

اختر نے مسکرا کر جواب دیا ''پھر تو میں ضرور پڑھوں گا لائیے!''

سلیم نے اپنے کمرے میں سے ایک کاپی لا کر اختر کے ہاتھ میں دے دی اور خط ڈالنے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

شام کے وقت اختر پہلی بار سلیم کے کمرے میں آیا اس کے ہاتھ میں وہ کاپی تھی جو دوپہر کے وقت سلیم نے اسے دی تھی ''لیجئے سلیم صاحب!'' اس نے کہا ''میں نے پڑھ لیا آپ کا مضمون!''

''تشریف رکھیے!'' سلیم نے کہا

اختر کرسی پر بیٹھ گیا اور سلیم اپنے دل میں مسرت اور اضطراب کی ملی جلی دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ اختر کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیلتی گئی اور سلیم کے خدشات دور ہوتے گئے۔

وہ بولا "سلیم صاحب! آپ کا مضمون بے حد دلچسپ تھا میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں گاؤں میں گھوم رہا ہوں اور وہ رمضان اگر آپ کے گاؤں کا کوئی جیتا جاگتا آدمی ہے تو میں اسے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھوں گا آپ اس مضمون کو اشاعت کے لیے ضرور بھیجئے!"

یہ ایک خوش گوار ابتدا تھی، اس کے بعد سلیم اور اختر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ سلیم کو اختر کی شخصیت میں ایک دوست، ایک نگران اور ایک رہنما مل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کالج کی لائبریری سے کتابیں منتخب کرتا۔ اس کے ادبی کارناموں کے عیوب و محاسن کے متعلق بے لاگ رائے دیتا۔ علی الصباح اسے اپنے ساتھ پڑوس کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے اور قرآن کا درس سننے کے لیے لے جاتا۔ شام کو وہ کبھی کبھی سیر کو نکل جاتے۔

اختر ماضی اور حال کا موازنہ کرنے کے بعد قوم کے مستقبل کے متعلق بے چین رہا کرتا تھا۔ اس کے خدشات کبھی کبھی سلیم کو بھی پریشان کر دیتے لیکن وہ احساس کی اس شدت سے آشنا نہ تھا جو اختر کو مضطرب رکھا کرتی تھی۔ سلیم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں نکھری ہوئی بہاریں تھیں، اس میں قوس کے رنگ تھے، اس میں دھوپ اور چھاؤں کا امتزاج تھا۔ وہ اگر ایک لمحہ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو فوراً ہی

قہقہہ لگانے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ وہ ابھی تک ان دھڑکنوں سے نا آشنا تھا جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں۔

انتہائی انس اور محبت کے باوجود سلیم کے لیے کبھی کبھی اختر کی صحبت بوجھل سی ہو جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب قوم کے سیاستدانوں اور لیڈروں پر نکتہ چینی کرنے کے بعد آنے والے دور کی بھیانک تصویریں پیش کرتا۔ سلیم یہ محسوس کرتا کہ اختر خفا ہے۔ ساری دنیا سے خفا ہے اور پھر اپنے گاؤں کا کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سنا کر گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا لیکن اختر کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا کہ آج اس کے کان ایسی باتوں کے لیے بند ہیں اس کی خشمگیں نگاہیں سلیم کو خاموش کر دیتیں۔ وہ کہتا ''سلیم! ہم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں ہم پر ایک بہت ہی نازک وقت آنے والا ہے۔ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے جس اجتماعی شعور اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں مفقود ہے، اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں ہمارا وہی حشر نہ ہو جو سپین میں ہو چکا ہے۔''

اس قسم کی تقریریں سلیم کو پریشان کر دیتیں اور رات کے وقت جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا تو اس کے کانوں میں اختر کے الفاظ گونجتے۔ کچھ دیر وہ بے چینی میں کروٹیں لیتا۔ پھر اس کے منتشر خیالات اپنے گاؤں پر مرکوز ہو جاتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی بھیانک صحرا سے نکل کر نخلستان میں پہنچ گیا ہے۔ وہ نخلستان جہاں زندگی کی دائمی مسکراہٹیں اور قہقہے ماضی، حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہیں وہ سو جاتا، اسے

چڑیوں کے چہچہے سنائی دیتے، پچھلے پہر کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے الغوزے کی آواز سنتا۔ جھیل کے شفاف پانی سے کنول کے پھول توڑتا۔ آم کے درخت کے ساتھ جھولا جھولتا اور گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر گھوڑا دوڑاتا، کبھی کبھی وہ سپنوں کی وادی کے ان گوشوں تک پہنچ جاتا جہاں زندگی کے ابتدائی نقوش وقت کی ریت میں دب چکے تھے اور جب وہ میٹھے اور سہانے سپنوں کے بعد بیدار ہوتا تو اختر کی باتیں اسے وہم معلوم ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

لیکن حال کے آئینے پر مستقبل کے چہرے کے جو خدوخال ظاہر ہو رہے تھے وہ تدریجاً بھیانک ہوتے گئے۔ زندگی کے افق پر گردوغبار جسے سلیم محض وہم سمجھتا تھا نمایاں ہوتا گیا، اس نے بچپن میں اس قسم کی کہانیاں سنی تھیں کہ ایک مسافر کسی شہر میں داخل ہوا۔ بازاروں اور گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ کہیں برات کی دھوم دھام تھی اور کہیں مداریوں اور بازیگروں کے تماشے تھے وہ ان دلچسپیوں میں کھو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے لیکن اچانک افق پر گردو غبار کے بادل اٹھے اور آن کی آن میں ایک تاریک آندھی چاروں طرف چھا گئی۔۔۔۔ لوگ سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مسافر بدحواس ہو کر ان سے پوچھ رہا تھا ''تم کیوں بھاگ رہے۔۔۔۔؟'' لیکن کسی نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی لوگ اس قدر خوفزدہ تھے کہ کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی بچے،

عورتیں، جوان اور بوڑھے سب چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس سراسیمگی کی حالت میں کئی بچے، بوڑھے اور اپاہج دوسروں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔

مسافر خوفزدہ ہو کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اچانک آندھی رک گئی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں لیکن مسافر حیران تھا کہ طوفان گزر جانے کے باوجود لوگوں کی سراسیمگی میں کمی نہیں ہوئی وہ پہلے سے زیادہ بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ اچانک ایک مہیب دیو نمودار ہوا۔ اس کا رنگ سیاہ اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں اس کے بڑے بڑے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی اور سر پر بالوں کی جگہ ہزاروں سانپ لہرا رہے تھے اور زمین اس کے پاؤں تلے لرز رہی تھی اس کے قہقہے بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہولناک تھے وہ بچوں، عورتوں اور آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر ہوا میں اچھالتا اور جب وہ گرتے تو انہیں اپنے پاؤں سے کچل دیتا۔ نوجوان لڑکیاں چیخیں مار مار کر کنوؤں، نہروں اور تالابوں میں کود رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر رکھے تھے لیکن اس کے مضبوط ہاتھوں کے سامنے یہ دروازے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے وہ انہیں ہاتھ پاؤں کی ایک ہی ضرب سے توڑ ڈالتا اور پھر قہقہہ لگا کر کہتا "اب تم کہاں جا سکتے ہو، آج میں آزاد ہوں سالہا سال قید میں رہنے کے بعد آج پہلی مرتبہ مجھے آزادی ملی ہے۔ قید میں میرے ہاتھ پاؤں مضبوط زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور میں بے بسی کی حالت میں دانت پیستا رہا۔ میرے کان خوبصورت لڑکیوں کی چیخیں سننے کے لیے

بے قرار تھے۔ میرے ہاتھ تمہیں ہوا میں اچھالنے اور میرے پاؤں تمہیں مسلنے کے لیے بے چین تھے۔۔۔۔ تم چیخ رہے ہو۔۔۔۔۔ لیکن قید خانے کی تنہائیوں میں میری چیخوں کا تصور کرو۔ میں تمہاری ہڈیوں کے تصور میں قید خانے کی آہنی سلاخوں کو مروڑا کرتا تھا اور میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں یہ عہد کیا کرتا تھا کہ آزادی ملتے ہی جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔ میں آج آزادی کا ناچ ناچوں گا۔ میرے لیے اپنی لاشوں کی سیج بچھا دو!''

بھارت ماتا ہندو سامراج کے اس عفریت کو جنم دے چکی تھی۔ جس کے ذہن میں آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوق آزادی سے محروم کرنا تھا۔ وہ سانپ اپنے بل سے سر نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔ جس کے زہر نے صدیوں پیشتر اچھوت کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین لی تھی صدیوں پیشتر ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلی دان دیا کرتا تھا اور دیوتاؤں نے اسے اچھوتوں کی بستیاں جلانے اور ان کی جھونپڑوں کی راکھ پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ صدیوں تک بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد اچھوت کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ برہمن اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تقدیس کے احترام میں اپنے تمام انسانی حقوق سے دست بردار ہو چکا تھا۔

لیکن اب ہندو کے سامنے دس کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ تھا اور یہ وہ قوم تھی جس نے اس ملک پر صدیوں تک حکومت کی تھی ہندو نے اچھوت کو ورن آشرم کی آخری

کڑی بنانے سے پہلے اپنی تلوار سے مغلوب کیا تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں محمد بن قاسمؒ کے زمانے سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک یہ تلوار بے اثر ثابت ہوئی پانی پت کی رزمگاہیں ہندو کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھیں کہ تلوار کی جنگ میں وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ پرانے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر ایک نئے دیوتا کی اعانت کا طلب گار رہوا یہ نیا دیوتا انگریز تھا۔

انگریز نے اس وقت ہندوستان میں قدم رکھے جب مسلمانوں کی سطوت کے ستون کھوکھلے ہو چکے تھے تاہم ان کی آخری قوت مدافعت جو بنگال میں سراج الدولہ اور جنوبی ہند میں سلطان ٹیپوؒ کی شخصیتوں میں ظاہر ہوئی، انگریز کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ اس قوم کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہندو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریز کی نظر میں اور زیادہ معتوب ہو گیا اور وہ چکی کے دو پاٹوں، انگریز اور ہندو کے درمیان پسنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے اندر مغربی طرز کی جمہوریت کے تصور سے ہندو کی وہ پرانی جبلت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا چولا پہن کر نیچ ذات کو ہمیشہ کے لیے حقوق انسانیت سے محروم کر دیا تھا۔ ہندو جانتا تھا کہ ایک مرکز کے تحت جمہوری نظام حکومت میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو بھی سیاسی اور اقتصادی اچھوت کا درجہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ چنانچہ ہندو ورن آشرم کی جگہ ہندی نیشنل ازم نے لے لی۔

☆☆☆☆☆

ہندی نیشنل ازم آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر میدان میں آیا۔اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منوجی کے وان آشرم سے مختلف نہ تھے۔صرف اتنا فرق تھا کہ منوجی کی تحریک نے برہمن کی تقدیس کا سہارا لیا تھا اور کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا چاہتی تھی۔منوجی کے ہاتھ میں تیز چھری تھی اور اس نے بلا تامل اچھوتوں کو ذبح کر کے برہمن کے قدموں میں ڈال دیا لیکن گاندھی کی آستین میں ایک زہر آلود نشتر تھا جسے استعمال کرنے سے پہلے وہ مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ لینا ضروری سمجھتا تھا۔منوجی نے اچھوت کو دھتکارا تھا لیکن گاندھی کو خطرہ تھا کہ یہ قوم جسے نابود کرنے کا کام سماج کے مقدس دیوتاؤں نے اسے سونپا ہے، سو رہی ہے، مردہ نہیں ہوئی۔اس لیے وہ اپنا زہر آلود نشتر آزمانے سے پہلے انہیں بیہوشی کے ٹیکے لگانا ضروری سمجھتا تھا گاندھی کا طریق کار وہی ہوتا جو منو کا تھا تو مورخ شاید پانی پت کی ایک اور جنگ دیکھتے اور دہلی کے لال قلعے پر جو جھنڈا انگریز کے جانے کے بعد لہرایا جاتا اس پر اشوکا کے چکر کی بجائے محمد بن قاسم کی تلوار کا نشان ہوتا، گاندھی نے ہندو اکثریت کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اچھوتوں کے لیے بھارت ماتا کی گود کشادہ کر دی۔ان کے لیے چند مندروں کے دروازے کھل گئے۔ انہیں سماج کے مقدس بیٹوں کے چند کنوئیں بھرشٹ کرنے کی اجازت بھی مل گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ صدیوں کے بعد ایک کروٹ لے کر پھر بھارت ماتا کے قدموں میں سو گئے۔۔۔۔۔۔مسلمانوں کا مدافعانہ احساس

کچلنے کے لیے گاندھی نے انہیں آزادی کا سراب دکھایا۔ تحفظات کا مطالبہ کرنے والوں کو تنگ نظر ، فرقہ پرست، انگریز کے ایجنٹ اور وطن کی آزادی کے دشمن کہا گیا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس سراب کی حقیقت سے واقف تھے۔ جو گاندھی کی آستین میں چھپے ہوئے خنجر کو اپنی شاہ رگ کے قریب آتا دیکھ رہے تھے، جو ہندو مقاصد کی چٹان کو بتدریج پانی سے ابھرتا ہوا دیکھ کر قوم سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری ناؤ رام راج کی اس خطرناک چٹان کی طرف دھکیل رہا ہے جس کے ساتھ ٹکرا کر یہ پاش پاش ہو جائے گی اور تم اچھوتوں کی طرح موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

لیکن ایسی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، گول میز کانفرنس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ کانگریس جس انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت کے بعد مسلمان اپنا سیاسی مستقبل ہندو اکثریت کو سونپ دیں۔

کانگریس نے کئی بار حکومت کے ساتھ سودا کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ انگریز اقلیتوں کو نظر انداز کر کے اس کی واحد نمائندگی کو تسلیم کر لے لیکن انگریز دس کروڑ مسلمانوں کے وجود سے قطعی انکار نہ کر سکا۔ بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کی تسکین کے لیے دس کروڑ مسلمانوں پر اپنی سنگینوں کا پہرا اٹھانے میں اسے کوئی مصلحت نظر نہ آئی۔ انگریز کے متعلق کانگرس کی پالیسی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ گاندھی جی کی آتما نے کئی چولے بدلے۔ لیکن مسلمانوں کے متعلق ان کے

طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ تاہم آزادی کے نعروں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ مسلم عوام کا جوش و خروش ابھی تک کانگرس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس جسے آزادی کہتی تھی، وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا 1937ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگرس کی حکومت ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دوراندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اتر آئے۔۔۔۔ واردھائی مہاتما کا زہر میں بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آ چکا تھا۔۔۔۔ رام راج کی برکات واردھا یا ودیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں رب کعبہ کے سامنے سربجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔ محمد عربی کی نعت پڑھنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جا رہا تھا۔ دخترانِ توحید کے نصابِ تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کیے جا رہے تھے۔ ۔۔۔۔ مسلمانوں کے حلق میں یہ زہر انڈیلنے کے لیے ان تجاویز کے بانیوں نے وہ ہاتھ منتخب کیے جن کی انگلیوں پر ابھی تک قرآن حکیم کی تفسیریں لکھنے والے قلم کی سیاہی کے نشان موجود تھے۔

رام راج کی بقا کے لیے مسلمانوں کے تمدن کے علاوہ ان کی زبان بدلنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جدوجہد زیادہ شدومد کے ساتھ شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے گاندھی جس موقع کا منتظر تھا، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا لیکن ہندو عوام جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے یہاں تک گوارا کر لیا تھا کہ اچھوت انکے چند مندروں کو بھرشٹ کر ڈالیں، کینہ اور نفرت کے ان جذبات کو دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکے، جن کی اساس پر ہندو نیشنلزم کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ چنانچہ وسط ہند کے صوبوں میں لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع ہوئیں، جس شہر یا گاؤں میں ہندو مسلمانوں پر حملہ کرتے، وہاں کانگرسی حکومت کی پولیس ثالث بن کر پہنچتی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جاتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی جواہر لال نہرو کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے ''ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک انگریز، دوسری کانگرس''

رام راج کا یہ دور اگرچہ مختصر تھا تاہم سنجیدہ مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ اگر انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو اندلس کی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مارچ 1940ء کو مسلمانوں کے مدافعانہ شعور کی عملی صورت پاکستان کی قرارداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

پاکستان کا مطالبہ سراسر مدافعانہ تھا۔ مسلمان ہندو فسطائیت کے اٹھتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایک دفاعی خط کھینچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خودمختاری کا حق دے کر اپنی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خودمختاری کا حق مانگا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے تین چوتھائی حصے پر ہندو اکثریت کا حق تسلیم کرلیا اور اپنے لیے جو علاقہ مانگا تھا وہ ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بھی کم تھا لیکن ہندو ایک مرکز کے ماتحت درہ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک اپنی اکثریت کے دائمی تسلط کے خواب دیکھ چکا تھا۔ واردھا کے صنم خانوں میں وہ اسکیمیں تیار ہوچکی تھیں جن کی بدولت چند سال میں مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور روحانی اعتبار سے یتیم بنایا جاسکتا تھا۔

مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان پر متحد ہوتا دیکھ کر بھارت کے بیٹوں نے یہ محسوس کیا کہ شکار ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مرغ حرم نے متحدہ قومیت کے اس دام فریب کو پہچان لیا ہے، جسے بظاہر بے ضرر بنانے کے لیے عدم تشدد کی بھٹی سے رنگ دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تلملا کر رہ گئے۔ جال بچھانے والے شکاری جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ منتشر پرندے بے تحاشا ان کی شکارگاہ کا رخ کر رہے ہیں۔ انہیں کسی اور طرف مائل پرواز دیکھ کر اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے۔ اضطراری حالت میں انہوں نے اپنے چہروں سے وہ نقاب اتار کر پھینک دیے جو مسلمانوں کو دھوکا دے رہے تھے مسلمان یہ دیکھ رہا تھا کہ آزاد خیال ہندو، تنگ نظر ہندو، دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے ہندو، دیوتاؤں سے بیزاری ظاہر کرنے والے ہندو، اچھوت کو گلے

لگانے والے ہندو اور اچھوت کو سب سے زیادہ قابل نفرت مخلوق سمجھنے والے ہندو، انگریز کی خوشامد اور چاپلوسی سے اقتصادی مراعات حاصل کرنے والے ہندو اور فقط بکری کے دودھ اور پھلوں کے رس پر قناعت کر کے انگریز کو مرن برت کی دھمکیاں دینے والے ہندو سب ایک تھے۔ کفر اپنے ترکش کے ہر تیر کو جمع کر چکا تھا لیکن مسلمان ابھی تک بکھرے ہوئے تیروں اور ٹوٹی ہوئی کمانوں کو گن رہے تھے۔

اگر مسلمان پاکستان کا مطالبہ دس [1] سال پہلے کرتے تو عدم تشدد کے دیوتا اور اس کے پجاری اس وقت بھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو جاتے اور مسلمانوں کو اپنی مدافعانہ تیاریوں کا موقع مل جاتا لیکن انہیں اس وقت اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کی چھت اور دیواروں کی مرمت کی فکر ہوئی جب افق پر چاروں طرف تاریک گھٹائیں اٹھ رہی تھیں۔ ہندو جس یقین محکم کے ساتھ اپنے جارحانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، وہ مسلمانوں میں مفقود تھا۔ نیم خوابی کی حالت میں وار دہائی مکر و فریب کے پھندے دیکھنے کے بعد مسلمان اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے پاکستان کی منزل مقصود کا رخ کر رہے تھے۔

---

[1] ترجمان حقیقت علامہ اقبالؒ دس سال قبل پاکستان کو مسلمانوں کی منزل مقصود قرار دے چکے تھے لیکن اس وقت اسے شاعر کا ایک خواب سمجھا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی غالباً تحریک پاکستان کے اولین محرکوں میں سے ایک ہیں۔ جو پاکستان کو اپنا مقصد حیات بنا چکے تھے لیکن وہ فقط ایک محدود طبقے کو متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور سیاسی شعور کے فقدان کے علاوہ یہ بھی تھی کہ ہندو

فسطائیت ابھی تک مکروفریب کے کئی چولوں میں چھپی ہوئی تھی۔

ہندو نے جہاں گزشتہ پندرہ بیس برس میں اپنی قوم کو متحد اور منظم کر لیا تھا، وہاں مسلمانوں کے اندر انتشار کے کئی بیج بو دیے تھے۔ وہ اس بات کے لیے تیار تھا کہ اگر متحدہ قومیت، عدم تشدد اور وطنیت کی لوریاں مسلمانوں کو موت کی نیند نہ سلا سکیں اور وہ اپنی شاہ رگ کے قریب اس کا زہر آلود خنجر دیکھ کر چونک پڑیں تو ان کے حلق میں خواب آور گولیاں ٹھونسنے کے لیے ان بزرگان دین کے ہاتھ استعمال کیے جائیں جن کا جبہ اور دستار یہ ظاہر کرتا ہو کہ جنت کی راہ دکھانے والے یہی ہیں۔ چنانچہ کانگرس ان ملت فروشوں کی ایک جماعت تیار کر چکی تھی، جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ان کے گلے میں ہندو کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔

☆☆☆☆☆

تجربہ کار شکاری جب یہ دیکھتے ہیں کہ پرندے ان کے جال کو پہچاننے لگے ہیں تو وہ سدھائے ہوئے ہم جنس پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے جال کے آس پاس جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ ان سدھائے ہوئے پرندوں کی بولی سے آس پاس بھٹکنے والے پرندے دھوکا کھا کر جال میں آ پھنستے ہیں اس طریقہ سے عام طور پر تیتر اور بٹیر کا شکار کیا جاتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کو بلا خطر جال کی طرف آنے کی ترغیب دینے والے تیتروں یا بٹیروں کو شکاریوں کی اصطلاح میں بلاوے[1] کے تیتر یا بٹیر کہا

جاتا ہے۔

1 پنجابی میں ''بلارا'' بھی کہتے ہیں

تلیروں کے شکار میں یہ طریق کار بدلنا پڑتا ہے سیر تلیر شکاریوں کی ہزار ناز برادری کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جال کی طرف رخ کرنے کا بلاوا نہیں دیتا۔ اس لیے اسے دھوکا دینے کے لیے ممولے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ممولا گھریلو چڑیا سے قدرے بڑا ہوتا ہے اور تلیرا اسے اپنا پیدائشی دشمن خیال کرتا ہے، شکاری مموے کو پکڑ کر پھندے کے قریب باندھ دیتے ہیں اور تلیروں کا غول اسے دیکھتے ہی پھندے یا جال سے بے پرواہ ہو کر اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

واردھا کے کہنہ مشق شکاری نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہندو سامراج کے دام فریب سے خطرہ محسوس کر کے پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں تو اس نے نام نہاد علمائے دین کے اس گمراہ ٹولے کو آگے کیا جو خدا پرستی سے توبہ کر کے وطن کا پجاری بن چکا تھا، جو محمد عربیؐ کے دامن کا سہارا چھوڑ کر لنگوٹی والے مہاتما سے رشتہ جوڑ چکا تھا۔ ان لوگوں کو وہی کام سونپا گیا جو شکاری بلاوے کے تیتروں اور بٹیروں سے لیتے ہیں یہ علماء ہندو سامراج کا جال بچھانے والے شکاریوں کی سکھائی ہوئی بولیاں بول رہے تھے ''مسلمانو! آؤ یہ تمہاری آزادی کی منزل ہے دیکھو ہم آزاد ہیں یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں یہاں پھنسانے کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہاں اناج بھی ہے اور پانی بھی پاکستان بھوکا ہے۔ تمہیں وہاں یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔ ہمیں دیکھو! ہمیں پہچانو! ہم تمہارے لیڈر ہیں ارے! تم یہ سمجھتے

ہو کہ ہندو تمہیں کھا جائے گا؟ یہ ہندو جس پر تم نے برسوں حکومت کی ہے! کیا یہ بزدلی نہیں کہ تم ہندو سے تحفظات مانگتے ہو؟ خدا کی قسم جب ہندو سے اپنے حقوق لینے کا وقت آئے گا تو ہم اس کے کان پکڑ کر اپنے مطالبات منوائیں گے اگر ہندو کی نیت خراب ہوتی تو ہم اس کے ساتھ کیوں ہوتے؟ وہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں جنہوں نے تمہیں مہاتما گاندھی جیسے بے ضرر انسان سے بدظن کیا ہے، مہاتما جی نے تمہارے لیے قیدیں کاٹیں، بکری کا دودھ پیا، چرخہ چلایا اور مرن برت رکھے۔ تمہارے یہ لیڈر جو تمہیں مہاتما گاندھی سے بدظن کرتے ہیں، وطن کی آزادی کے دشمن ہیں۔ اسلام کے دشمن ہیں۔ خدا کے دشمن ہیں۔ ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ پاکستان کا خیال ترک کر دو۔ آؤ! یہاں آؤ! یہاں دانے اور پانی کی فراوانی ہے، یہاں کوئی خطرہ نہیں آئے گا۔ آؤ! ہمارے ساتھ مل کر نعرہ لگاؤ ''انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!!

ایک طرف یہ ''بلاوے'' کے پرندے ہندو سامراج کی حمایت کے لیے نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت تیار کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندو پریس مَمولے کی مدد سے تلیروں کے پھانسنے کے طریق کار پر عمل کر رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان سے قبل جب بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان تحفظات کے لیے مصر ہو رہے ہیں، تو انگریز کے خلاف چند نعرے لگا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تلیر مَمولے کو دیکھ کر شکاری اور اس کے پھندے سے بے پروا ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہندو کے متعلق مسلمان کے شکوک اور شبہات انگریز دشمنی کے جذبات میں

دب کر رہ جاتے۔ حریت پسند مسلمان ہندوؤں کا ساتھ دے کر جیلوں میں چلے جاتے، پھر گاندھی جی مرن برت رکھ کر یا کسی اور بہانے سے جیل سے باہر آ جاتے اور حکومت کے ساتھ مصالحانہ باتوں کا دور شروع ہوتا۔ ہندو کچھ مراعات حاصل کر لیتے یا مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہتے۔ بہر حال مسلمانوں کی مدافعانہ تحریک قصہ ماضی بن کر رہ جاتی۔

مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ سے بہکانے کے لیے کانگرس نے ان کے سامنے آخری بار انگریز کا ممولا رکھا۔ چنانچہ ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے یہ نعرے بلند ہونے لگے "مسلم لیگ انگریز کی آلہ کار ہے۔ قائداعظم اگر پاکستان کے مطالبہ پر بضد رہا تو انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر جنگ کے بعد بھی اس ملک میں اپنے پاؤں جمائے رکھے گا۔ پاکستان مسلمانوں کا مطالبہ نہیں بلکہ انگریز کی شرارت ہے، لہٰذا یہ وطن سے غداری کے مترادف ہے اور اسلام کی تعلیمات کے صریحاً خلاف۔ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ انگریز نے پیدا کیا ہے۔ انگریز ہمارا اصلی دشمن ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی کانگرس مختلف طریقوں سے حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف فوراً کوئی اعلان کرے ورنہ کانگرس اس کی جنگی سرگرمیوں میں رخنہ انداز ہونے سے دریغ نہیں کرے گی۔ انگریز ہر قیمت پر ہندو کی ناز برداری کے لیے تیار تھا لیکن وہ مجبور تھا۔

اٹلی، جرمنی اور جاپان کے خلاف لاکھوں مسلمان سپاہی انگریز کے دوش بدوش لڑ

رہے تھے اور انگریز ہندو مہاشوں کے تعاون کی امید پر پاکستان کی مخالفت سے ان لوگوں کے احساسات مجروح کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

کانگرس کبھی چاپلوسی اور کبھی دھمکیوں سے کام لے رہی تھی۔ اسے اس بات پر اصرار نہ تھا کہ انگریز اس ملک کو فوراً خالی کر دیں، وہ صرف یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت اقلیتوں کو نظر انداز کریں گے۔

1942ء میں یورپ میں ہٹلر کا طوطی بول رہا تھا یورپ کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جرمن افواج روس پر یورش کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیل ہمہ گیر کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ جرمنی کی آبدوزیں امریکہ کے ساحلوں کا طواف کر رہی تھیں، لنڈن پر بمباری ہو رہی تھی، کبھی کبھی گاندھی جی کی آتما کو ان باتوں سے دکھ پہنچتا اور وہ فریقین کو عدم تشدد کا سبق دیتے لیکن جب جاپان میدان جنگ میں کود پڑا تو عدم تشدد کے دیوتا نے انگریز کی شکست کے متعلق پر امید ہو کر ہندو سامراج کے احیاء کی تمام توقعات جاپانیوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چنانچہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع ہوئی۔ کانگرس کے مہاتما نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ کامل آزادی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بیرونی حکومت انگریز کی ہو اور اندرونی تسلط ہمارا ہو۔۔۔۔ اب کامل آزادی کے لیے انگریز کی بجائے جاپان کے بیرونی تسلط کے لیے راہ صاف کی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ ہندو کو یقین تھا کہ وہ اس نازک موقعے پر اپنے آپ کو انگریز کا دشمن ظاہر کر کے اس ملک کے نئے فاتحین یعنی جاپانیوں کی نگاہ میں انعامات کا مستحق سمجھا

جائے گا۔کم از کم جاپانی مسلم اقلیت کے حقوق کے متعلق اس کے نقطہ نظر کی حمایت ضرور کریں گے۔لیکن یہ شاید مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جاپانیوں کا سیلاب برما سے آگے نہ بڑھ سکا اور عدم تشدد کے دیوتا کے پجاری چند پل توڑنے،ٹیلیفون کے تار کاٹنے،پوسٹ آفس جلانے،چند بابوؤں کو دھول دھپا کرنے،چند چپراسیوں کی وردیاں پھاڑنے اور بعض سرکاری عمارتوں سے انگریز کا جھنڈا اتار کر اس کی جگہ کانگرس کا جھنڈا لہرانے کے بعد خاموش ہو گئے۔مشرق کا وہ نیا دیوتا جو کانگرسی دیش بھگتوں کے خیال کے مطابق بھارت ماتا کی عظمت رفتہ کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے آرہا تھا،منی پور سے آگے نہ بڑھ سکا۔

☆☆☆☆☆

سلیم ایک ادیب کی حیثیت میں اپنے ہوسٹل کے لڑکوں کا ہیرو بن چکا تھا۔اس کی شاعری میں برسات کی ندیوں کی روانی،پرندوں کی موسیقی اور بہار کے پھولوں کی رعنائی تھی اس کے افسانے اور مضامین دیہاتی زندگی کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کے آئینہ دار تھے لیکن اختر جس نے شروع شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کی تھی،اب اس کے ادبی رجحانات بدلنے کی کوشش کیا کرتا تھا"سلیم"!وہ کہتا تم بہت اچھا کہتے ہو،تم خوب لکھتے ہو لیکن یہ بے مقصد ادب اس قوم کے لیے مفید نہیں جس کے گرد چاروں طرف سے آلام و مصائب کی آندھیاں گھیرا ڈال رہی ہیں اس میں شک نہیں کہ تمہارے گاؤں کی قمریوں کے ترانے دل کش ہیں،تمہارے باغ کے

پھولوں کی مہک خوشگوار ہے اور تمہارے افسانوں کے دیہاتی کردار بے حد دلچسپ ہیں لیکن تم اس طوفان کو نظر انداز کر رہے ہو جو کسی دن ان دلفریب مسکراہٹوں کو آنسوؤں میں تبدیل کر دے گا اس آگ سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو تمہارے خرمن کو راکھ کا انبار بنانے والی ہے، بے شک تمہارے گاؤں کی محفلیں دلچسپ ہیں لیکن اس قوم کے متعلق سوچو، جو ہزاروں برس پہلے اس ملک میں آزادی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس قوم کے شاعر تمہاری طرح برسات کی ندیوں کے نغمے سنتے ہوں گے، موسم بہار کے پھولوں سے باتیں کرتے ہوں گے، اور پھر تمہارے گاؤں کے لوگوں کی طرح وہ اپنی اپنی بستیوں میں محفلیں منعقد کرتے ہوں گے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوں گے، جو تمہارے گاؤں میں ہوتی ہیں لیکن بھیڑیا خصلت انسانوں کا ایک گروہ آیا۔ اس نے یہ بستیاں ان سے چھین لیں اور یہ محفلیں درہم برہم کر ڈالیں جانتے ہو یہ لوگ کون ہیں؟

اور پھر وہ خود ہی جواب دیتا ”یہ ہندوستان کے سات کروڑ اچھوت ہیں جو آرین حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور مغلوب ہونے کے بعد اس ملک کے سیاسی، روحانی اور اقتصادی یتیم بن کر رہ گئے۔۔۔۔ سلیم! تم کہو گے کہ وہ احمق تھے جو دشمن کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی نہ لگا سکے لیکن ان کے شاعروں اور مفکروں کو کیا کہو گے جو انہیں بروقت جگا نہ سکے، جو اس وقت بھی جب دشمن سر پر کھڑا تھا، الاؤ کے گرد یا درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انہیں میٹھے راگ اور دلچسپ کہانیاں سناتے رہے؟ میرے دوست! نفرت اور حقارت کا وہ طوفان جس نے برہمن کی

تقدیس کا لبادہ اوڑھ کر اچھوتوں کو تباہ و برباد کیا تھا، آج صدیوں کے بعد پھر اٹھ رہا ہے اور اس مرتبہ اس کا رخ ہماری طرف ہے۔ ہندو سماج کا احیاء ہندو نیشنلزم کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تو ہمارا حال اچھوتوں سے بھی برا ہو گا۔ اچھوتوں کو ہندو سوسائٹی کا قابل نفرت حصہ بن کر زندہ رہنے کی اجازت مل گئی لیکن ہمارے لیے دو ہی راستے ہوں گے موت یا ترک وطن۔''

''سلیم!'' اختر کے لہجے میں سختی آجاتی ''اگر تم اجتماعی زندگی کا شعور نہیں رکھتے تو کم از کم اس گاؤں کے لیے جس کی حسین فضاؤں میں تم نے نغمے اور قہقہے سیکھے ہیں، آنے والے خطرات کا احساس کرو۔ جب طوفان دوسری ہزاروں بستیوں کو تباہ و ویران کر دے گا تو تمہارا گاؤں اس لیے نہیں بچ رہے گا کہ وہاں تم جیسے شاعر نے پرورش پائی ہے۔ بربریت کے ہاتھ جب ہزاروں محفلیں ویران کریں گے تو تم انہیں یہ کہہ کر نہیں روک سکو گے کہ اس محفل کی طرف مت بڑھو یہاں میں نے مسکرانا اور ہنسنا سیکھا ہے۔ اس وقت تمہیں یہ سمجھ آئے گی کہ اجتماعی آلام و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تم کہو گے کہ کاش میں قوم کو میٹھے اور سہانے نغمے سنانے کی بجائے جھنجھوڑ کر جگاتا۔''

پھر سلیم کا چہرہ دیکھ کر اختر کے لہجے میں ملائمت آجاتی ''سلیم! میری باتیں ذرا تلخ ہیں لیکن میں حقیقت کے چہرے پر حسین پردے نہیں ڈال سکتا۔ قدرت نے جو صلاحیتیں تمہیں دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کا استعمال غلط نہ ہو۔ تمہاری تحریر میں جادو ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ جادو قوم کو سلانے کی بجائے جگانے کے کام آئے۔

موجودہ حالت میں صرف پاکستان ہی ہماری بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہو کر، ہم ہندو فاشزم کے سیلاب کا منہ پھیر سکیں گے۔ شاعروں اور ادیبوں نے کئی اقوام کو موت کی نیند سلانے کے لیے لوریاں دی ہیں لیکن ایسے شاعر بھی تھے، جن کے الفاظ نے شکست کھا کر پیچھے ہٹنے والی فوج میں نئی روح پھونک دی۔ قرون اولیٰ میں ہمیں ایسے شعراء کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو روم و ایران میں اسلام کی عظمت کے پرچم لہرانے والے مجاہدین کے دوش بدوش جہاد کیا کرتے تھے۔۔۔۔ آج کا شاعر اگر پاکستان کی اہمیت محسوس نہیں کرتا تو میں کہوں گا کہ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ ہے۔"

اختر کے ساتھ ایسی ملاقاتوں کے بعد سلیم اپنے دل میں نئے ارادے اور نئے ولولے لے کر اٹھتا۔ اسے اپنے گاؤں کی محفلیں عزیز تھیں اپنے کھیتوں اور باغوں کے پھول پیارے تھے۔ اسے ان سیدھے سادھے لوگوں کے قہقہوں اور مسکراہٹوں سے انس تھا جو وقت کو منٹوں اور سیکنڈوں کے پیمانے کی بجائے دنوں مہینوں اور برسوں کے پیمانے سے ناپا کرتے تھے، پھر اسے جگر دوز چیخیں سنائی دیتیں، اپنے گاؤں کی عورتوں اور بچوں کی چیخیں، وہ کپکپا اٹھتا۔۔۔۔ وہ اس دیو کو روکنے کے لیے پاکستان کی چار دیواری کی ضرورت محسوس کرتا۔ وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا اور پاکستان کے متعلق کوئی مضمون شروع کر دیتا۔ وہ ظالم ہیں، وہ سامراجی ہیں، وہ فسطائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو آریہ فاتحین نے ہندوستان کی مفتوح اقوام کے ساتھ کیا تھا۔۔۔۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچتا "کیا وہ انسان نہیں؟ کیا

ہم انسان نہیں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا سلوک کیونکر کرسکتا ہے۔۔۔۔؟''

پھر وہ خود ہی جواب دیتا ''کیا ہندوستان کے قدیم باشندے انسان نہ تھے اور برہمن نے انسان ہوتے ہوئے۔۔۔؟ لیکن وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں اب دنیا میں علم کی روشنی پھیل چکی ہے''سلیم اپنے دل کو تسلی دیتا۔ حقیقت کا بھیانک چہرہ تھوڑی دیر کے لیے تصورات کے خوشگوار دھندلکے میں چھپ جاتا اور اس دھندلکے میں اڑتا ہوا وہ اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا گاؤں کے چھوٹے بچے اسے دیکھتے ہی شور مچاتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے۔ مسلمانوں کے بچے، سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچے، وہ سب سے پیار کرتا تھا۔۔۔ وہ اس سے لپٹ جاتے۔۔۔کوئی اس کے کندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا کوئی اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونس دیتا۔ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کی شلوار یا پتلون کا ستیا ناس کر دیتے۔ وہ انہیں کھانڈ کی ٹکیاں یا کوئی اور کھانے کی چیز تقسیم کرتا۔ بچے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر اپنا ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ''بھائی جان مجھے دو مجھے دو!''سلیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ یہ روشنی کا زمانہ ہے وہ مطمئن سا ہو کر قلم رکھ دیتا لیکن اچانک وہ دل کی ایک اور آواز سنتا ''کیا اس روشنی کے زمانے میں ان دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی، جن کے سامنے کبھی اچھوتوں کا بلی دان دیا جاتا تھا۔۔۔۔؟''

☆☆☆☆☆

کالج کی علمی اور ادبی مجالس کی طرح ہوسٹل کی بزم ادب بھی کبھی کبھی جلسے کیا کرتی تھی۔ ان جلسوں میں عام طور پر ٹھوس علمی و ادبی مباحثوں کی نسبت ہنسنے اور ہنسانے کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرہ ہوتا تو سن کر داد دینے والوں کی نسبت سنے اور سمجھے بغیر شور مچانے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی اور گھبرائے ہوئے اور سہمے ہوئے نوجوان شعراء کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ انہیں داد مل رہی ہے یا گالیاں!

کسی موضوع پر مباحثہ ہوتا تو ہوسٹل کے زندہ دلوں کا ایک گروہ پہلے ہی فیصلہ کر کے آتا کہ آج کس کے لیے تالیاں بجانی ہیں اور کس کی بات پر قہقہے لگانے ہیں کبھی کبھی لڑکے اختر کو بھی ان جلسوں میں کھینچ لاتے۔ اختر اب پاکستان کا مبلغ ہو چکا تھا لیکن اس کے ایک اور ہم جماعت الطاف کو پاکستان کے نام سے چڑ تھی۔ وہ گاندھی کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان اور اس کے ان مسلمان چیلوں کو اپنا روحانی اور سیاسی پیشوا سمجھتا تھا۔ جو رام راج کی ضروریات کے مطابق آیات ربانی کی تفسیریں کیا کرتے تھے کالج میں بھی وہ طالب علموں کے اس گروہ کا لیڈر تھا جو نیشنلسٹ کہلانے کے لیے کبھی کھدر پہن لیا کرتے تھے۔۔۔ اختر تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو الطاف اٹھ کر احتجاج کرتا ”صاحب صدر! پاکستان ایک اختلافی مسئلہ ہے اختر کی تقریروں سے وطن پرست مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اس لیے اس موضوع پر بولنے کی اجازت نہ دی جائے؟“

الطاف کے ساتھی یکے بعد دیگرے اس کی تائید میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے

جواب میں اختر کے حامی اٹھتے ''ہم اختر کی تقریر ضرور سنیں گے'' جب دونوں طرف کا جوش وخروش انتہا کو پہنچ جاتا تو آفتاب، چھ فٹ کا ایک قوی ہیکل پٹھان اٹھ کر صاحب صدر کی میز کے قریب آ جاتا اور ایک فیصلہ کن انداز میں کہتا ''الطاف! اگر تم اختر کی تقریر نہیں سن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ ہم خود نکال دے گا تم خواہ مخواہ ہر جلسے کو خراب کرتے ہو۔''

سلیم اپنے دونوں ہاتھ الطاف کے کندھوں پر رکھ دیتا الطاف صاحب! تشریف رکھیے نا!!

یہ الفاظ جس قدر نرم ہوتے اسی قدر الطاف کے کندھوں پر ان کا دباؤ نا قابل برداشت محسوس ہوتا ''الطاف صاحب!'' سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ کالج کا ایک اور طالب علم منصور بھی کبڈی کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اس کی کلائیاں الطاف کی پنڈلیوں کے برابر تھیں وہ سلیم کا اشارہ پا کر آگے بڑھتا اور مسکراتا ہوا اپنا ایک ہاتھ الطاف کے کندھے پر رکھ دیتا اور اپنے مخصوص انداز میں کہتا'' ارے یار! کیوں سر کھپا رہے ہو بیٹھ بھی جاؤ!''

الطاف بیٹھ جاتا۔ شور اور ہنگامے میں بہت کم لڑکوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ وہ بیٹھا نہیں، بٹھایا گیا ہے۔

سلیم اب دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہتا'' بھئی بیٹھ جاؤ۔ الطاف صاحب نے اپنا اعتراض واپس لے لیا ہے۔''

الطاف اچانک اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن منصور اور سلیم کے ہاتھوں کے شکنجے میں

بے بس ہو کر رہ جاتا۔

مجلس میں سکون کے آثار دیکھ کر آفتاب کہتا ''دیکھو الطاف! خدا کی قسم اگر اب تم نے تقریر ختم ہونے سے پہلے کوئی شرارت کی تو ہم بہت برا سلوک کریں گے اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو اختر کی تقریر کے بعد اسٹیج پر آ جاؤ!''

صدر عام طور پر ہوسٹل ہی کی کوئی مرنجاں مرنج شخصیت ہوتی۔ وہ اکثریت کے فیصلے کا احترام کرتا اور اکثریت کا فیصلہ عام طور پر یہی ہوتا کہ اختر کی تقریر سنی جائے۔

☆☆☆☆☆

بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سلیم نے اختر کی تقلید کی، اور ایم اے میں داخل ہو گیا۔ کالج اور ہوسٹل میں اختر پاکستان کا ایک ان تھک مبلغ تھا۔ اور اب تک کئی نوجوان اس کے ہم خیال ہو چکے تھے پاکستان کے متعلق ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے جو معاندانہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا، اس نے مسلم عوام کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔

ہوسٹل کی بزم ادب کے زیر اہتمام ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس میں بحث کا موضوع یہ تھا کہ کیا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح حل پیش کرتا ہے؟ اس جلسے میں ہوسٹل کے طلباء کے علاوہ کالج کے دوسرے طلباء کو بھی حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔

مباحثے کی تاریخ سے دو دن پہلے اختر کو کھانسی اور زکام کے ساتھ بخار کی

شکایت ہو گئی پہلے دن اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ کی دوسرے دن بخار زیادہ شدید ہو گیا اور سلیم ڈاکٹر کو بلا لایا ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے نمونیا ہے۔

سلیم اسے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق دوائی پلاتا رہا۔ رات کے وقت سلیم کے ساتھ آفتاب اور منصور بھی اس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ دو بجے کے قریب اختر کی آنکھ لگ گئی آفتاب اور منصور اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن سلیم وہیں بیٹھا رہا۔

تنہائی سے اکتا کر اس نے اختر کی میز سے ایک کتاب اٹھائی لیکن چند سطریں پڑھنے کے بعد اس نے کتاب پھر میز پر رکھ دی اور دوسری کتاب اٹھالی، اس میں بھی وہ دلچسپی نہ لے سکا۔ اس کے بعد ان کاغذوں کی باری آئی جو اختر کی میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ کے پرزے پر چند فقرے لکھے ہوئے تھے سلیم نے کاغذ کا یہ پرزہ اٹھا لیا اور بے توجہی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد وہیں رکھ دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے کوئی خیال آیا اور اس نے پھر یہ کاغذ کا پرزہ اٹھا لیا۔ وہ فقرے جو اسے پہلی نظر میں بے ربط سے نظر آئے، اب بہت اہم محسوس ہوتے تھے۔۔۔۔ یہ اختر کی تقریر کے نقات تھے۔

سلیم نے چند بار یہ سرخیاں پڑھیں اور پھر کاغذ کا پرزہ میز پر رکھ کر اختر کی طرف دیکھنے لگا اسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اختر کل بحث میں شریک نہیں ہو سکے گا الطاف اور اس کے ساتھی سخت تیاری کے بعد مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے آرہے ہیں اختر کی غیر حاضری میں شاید پاکستان کے حق میں بولنے والوں میں سے کوئی ان

کے دانت کھٹے نہ کر سکے۔ اگر انہوں نے میدان مار لیا تو اختر کو یقیناً اس بات کا صدمہ ہو گا پاکستان اختر کے لیے محض ایک نظریاتی مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی یہ وہ مرکز تھا جس کے گرد اس کے خیالات پرواز کیا کرتے تھے۔ وہ ساحل تھا جہاں پہنچنے کے لیے وہ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔۔۔۔ یہ وہ نعرہ تھا جس میں اس کی زندگی کے تمام نغمے گم ہو چکے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کے لیے میں اپنے دل میں دس کروڑ مسلمانوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہوں ایک دن میری آواز دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہو گی اگرچہ ہماری راہ میں کانٹوں کی باڑیں کھڑی کی جائیں گی لیکن ہم انہیں روندتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جائینگے ایک دن اس نے کہا تھا ''سلیم! تم میں ابھی تک اجتماعی زندگی کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک تم یہ سمجھتے ہو کہ وقت کا بہترین مصرف اس قسم کے افسانے لکھنا اور شعر کہنا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب تم یہ محسوس کرو گے کہ ان چند لمحات کے سوا جن میں تم نے پاکستان کے لیے کوئی عملی کام کیا ہے، تمہاری باقی زندگی بے حقیقت تھی آج تم کسی فرضی محبوب کے کوچے کی خاک کو سرمایہ حیات سمجھتے ہو لیکن وہ دن دور نہیں جب تمہیں پاکستان کی ایک ایک انچ زمین کو دشمن سے بچانے کے لیے زندگی کی عزیز ترین خواہشات کو قربان کرنا پڑے گا۔۔۔۔ سلیم! میں تمہیں افق افق پر اٹھنے والی آندھی کے آثار دکھا رہا ہوں اور تم اسے میرا وہم سمجھتے ہو لیکن جب یہ آندھی آئیگی تو تم محسوس کرو گے کہ پاکستان کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں میں بارش سے پہلے مکان پر چھت ڈالنا چاہتا ہوں اور تم بارش

میں کھڑے ہو کر چھت ڈالنے کی فکر کرو گے میرے دوست! پاکستان کی جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور اگر تم اپنی موت وحیات دس کروڑ مسلمانوں کی موت وحیات سے وابستہ کر چکے ہو تو اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے سلیم! آؤ! میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلو تا کہ اگر کہیں میرے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو میں تمہارے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے سکوں۔ کم از کم مجھے یہ تسلی ضرور ہو گی کہ میں تنہا نہیں لیکن کل تمہیں زخمیوں اور اپاہجوں کو اٹھا کر پاکستان کی منزل کا رخ کرنا پڑے گا۔"

"اختر تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں!" سلیم اپنے دل میں نئے ولولے اور نئی امنگیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میز سے قلم اٹھایا اور کورے کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔۔۔ اس نے رک رک کر چند ابتدائی سطور لکھیں لیکن اس کے بعد وہ اپنے قلم میں بلا کی روانی محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو صبح کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد وہ اپنے مضمون پر نظر ثانی کرنے کیلئے کرسی پر آبیٹھا رات کی بے آرامی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا تھوڑی دیر ستانے کی نیت سے اس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹیک دیں اور کلائیوں پر سر رکھ دیا چند منٹ بعد اسے نیند آ گئی۔

آفتاب کمرے میں داخل ہوا تو اختر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بستر پر بیٹھا سلیم کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ "بھئی اختر! اپنی جان پر اتنا ظلم نہ کرو" یہ کہتے ہوئے آفتاب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیے اور پھر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا" بھئی تمہارا بخار ابھی اترا نہیں، ذرا کم ہوا ہے۔ خدا کے لیے آج مباحثے میں حصہ

لینے کا خیال چھوڑ دو۔ ہم تمہاری جگہ کسی اور کو بھرتی کر لیں گے۔''

اختر نے اطمینان سے کہا'' آفتاب! یہ پڑھو تو سہی!''

''بھئی میں پڑھے بغیر بھی تمہیں داد دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایسی کیا مصیبت تھی کہ تم رات کے وقت اٹھ کر لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ساری رات تمہاری رکھوالی کرتا۔''

''بھئی آہستہ بات کرو، سلیم سو رہا ہے۔''

''سلیم بھی کیسا نالائق ہے جس نے تمہیں منع نہیں کیا۔''

''میں بھی اٹھا ہوں معلوم نہیں ڈاکٹر کی دوا کیا تھی۔ میں نے تو کروٹ بھی نہیں بدلی۔ یہ سلیم کا کارنامہ ہے۔''

''لیکن یہ ہے کیا؟''

''بھئی یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے''

آفتاب اختر کے قریب بستر پر بیٹھ گیا چند سطور بے توجہی سے دیکھنے کے بعد اس نے مضمون کو دوبارہ شروع سے پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموشی سے پڑھنے کی بجائے اختر کو سنا رہا تھا الفاظ اور فقروں کی ترتیب اس کی آواز میں زیر و بم پیدا کر رہی تھی۔

اس تحریر میں اس پہاڑی ندی کی روانی اور موسیقی تھی جو کبھی سنگریزوں اور چٹانوں سے ٹکرا کر شور مچاتی ہے اور کبھی ہموار زمین میں پہنچ کر اچانک اپنی بلند تانیں گہرے اور میٹھے سروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر ایک اور ڈھلوان آجاتی ہے اور

یہ سر آہستہ آہستہ ابھرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ایک گہرے کھڈ کے سرے پر پہنچ کر یہ ابھرتی ہوئی تانیں ایک آبشار کے ہنگاموں میں تبدیل ہو جاتی ہیں سلیم کبھی پاکستان کے باغ کے متعلق ایک شاعر کا تصور پیش کر کے فرزندان قوم کو ان طوفانوں سے خبردار کر رہا تھا، جن کی آغوش میں ہزاروں تخریبی عناصر چھپے ہوئے تھے۔۔۔۔

اور کبھی دلائل کے پہاڑ پر کھڑا ہو کر پاکستان کے مخالفین پر مہیب چٹانوں کی بارش کر رہا تھا۔آخری چند فقرے آفتاب نے کچھ ایسے جوش وخروش سے ادا کیے کہ سلیم گہری نیند سے جاگ اٹھا۔آفتاب اور اس سے زیادہ اختر کے چہرے پر اپنی تحریر کے اثرات دیکھ کر اس نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔مضمون ختم ہوا اور وہ دونوں سلیم کی طرف دیکھنے لگے۔

آفتاب نے کہا ''بھئی سلیم! میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں تم نے پہلی بار اپنے قلم کا صحیح استعمال کیا ہے اب وقت بہت تھوڑا ہے لیکن اگر تم یہ تقریر یاد کر لو تو بہت اچھا ہو گا۔الطاف اختر کی بیماری پر بہت خوش ہے۔''

سلیم نے کہا ''بھئی میں نے یہ تقریر مباحثے میں حصہ لینے کی نیت سے نہیں لکھی تھی میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اختر کی تقریر کی سرخیاں دیکھیں اور لکھنے بیٹھ گیا اور اب معلوم نہیں میں کیا لکھ چکا ہوں۔''

اختر نے کہا ''سلیم! بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں بر وقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا مشن کیا ہے بعض آدمیوں میں قوم کے سپاہی بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں قدرت انہیں قوم کی عزت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی

ہیں لیکن وہ شاعر، قوال اور گویے بن جاتے ہیں بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور وہ قوم کی بدقسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ بعض قدرت کی طرف سے بلند پایہ موجد کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں غایت درجہ کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے، ایک ادیب ہے۔ اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مسکراہٹ مضراب کا کام دیتی ہے۔ وہ ایک مصور ہے جس کے دل میں قدرت نے قوس قزح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ وہ ایک مغنی ہے جس نے آبشاروں اور پرندوں کے نغمے چرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں شاعر پھولوں کی مسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچوں کی جگر دوز چیخوں سے متاثر ہوتا ہے وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ جھنجھوڑتا ہے۔ مصور قلم پھینک کر تلوار اٹھا لیتا ہے اور مغنی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کی بجائے تیغوں کی جھنکار اور توپوں کی دنا دن سنائی دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی سیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی

انتشار پیدا کر رہے ہیں، جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا ہمیں للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے۔'' ٹھہرو! میں تمہیں ایک نیا گیت سناتا ہوں۔ میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے یہ ادب برائے ادب ہے یہ نئے دور کی ابتدا ہے ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے رباب کے تار درست کر رہا ہے۔ سلیم! مجھے تمہاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تم نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی طرف توجہ دی ہے جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے خدا کرے کہ یہ تمہارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو میں اس مباحثے میں حصہ نہیں لوں گا۔ اب ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی لیکن تمہاری تقریر ضرور سنوں گا۔

آفتاب نے کہا'' بھئی آج سلیم کی جگہ تم شاعر بن گئے ہو۔ اب خدا کے لیے لیٹ جاؤ اور سلیم! تم اپنے کمرے میں جا کر تقریر کی تیاری کرو۔''

☆☆☆☆☆

شام کے آٹھ بجے ہوسٹل کے کامن روم میں مباحثہ ہو رہا تھا صدارت کے فرائض کالج کے ایک نوجوان پروفیسر سر انجام دے رہا تھا۔ اختر اپنے کمرے کی

بجائے کامن روم کے قریب ایک اور کمرے میں لیٹا مباحثے میں حصہ لینے والوں کی تقریریں سن رہا تھا۔ منصوراس کی تیمارداری سے زیادہ آزادی کے ساتھ حقہ پینے کی نیت سے اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس باہر کی طرف کھلنے والے دریچے سے مقررین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

الطاف اوراس کے ساتھیوں کی تقریروں میں پاکستان کے کلاف وہی دلائل تھے جو بارہا ہندو اخبارات میں دہرائے جا چکے تھے اختر کے ہونٹوں پر کبھی حقارت آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور کبھی غصے کی حالت میں وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا اور منصور تقریر کے الفاظ سے زیادہ اس کے چہرے سے متاثر ہوکر بار بار کہتا "بکواس کررہا ہے گدھا کہیں کا اب آفتاب اس کی خبر لے گا۔"

الطاف اپنے گاندھی بھگت ساتھیوں کا ایک منظم گروہ لے کرآیا تھا اور وہ اس کی تقریر کے دوران میں بار بار تالیاں بجا رہے تھے جب آفتاب کی باری آئی تو اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خفا ہو چکا ہے۔ اس کی تقریر پاکستان کے مخالفین کے خلاف ایک اعلان جنگ تھی اور سننے والے یہ محسوس کررہے تھے کہ اگر صدر کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ کرنے پر اتر آتا۔

پاکستان کی حمایت میں ایک ایم اے کے طالب علم کی تقریر نہایت عالمانہ تھی لیکن اپنی باریک آواز کے باعث وہ سننے والوں کو زیادہ متاثر نہ کرسکا۔

بالآخر صاحب صدر نے کہا "اب مسٹر سلیم موضوع کے حق میں تقریر کریں گے"

سلیم کرسی پر بیٹھا ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا ان پر اس نے رات کے وقت تقریر لکھی تھی یہ تقریر اسے حفظ ہو چکی تھی لیکن الطاف کی تقریر یا نا خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھی جس نے اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ سلیم اس کی تقریر کے دوران میں محسوس کر رہا تھا کہ خیالات کے وہ ''حسین پھول'' جو اس نے جمع کئے ہیں اپنی رنگینی اور رعنائی کے باوجود الطاف کا منہ بند کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس نے گالیوں کے جواب میں شعر لکھے ہیں الطاف کے بعد اس کے ساتھیوں کی تقریروں کے دوران میں بھی وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اس کے ذہن میں نئے نئے دلائل اور نئے نئے الفاظ آ رہے تھے، یہاں تک کہ جب اسے تقریر کے لیے بلایا گیا تو اسے یقین نہ تھا کہ وہ کیا کہے گا وہ جھجکتا ہوا کرسی صدارت کے قریب پہنچا تو اپنی لکھی ہوئی تقریر سے زیادہ مخالفین کی تقریروں کے الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

الطاف نے اچانک کہہ دیا ''سلیم صاحب! پاکستان کے متعلق تقریر کریں گے یا کوئی قصیدہ سنائیں گے؟''

آفتاب نے فوراً جواب دیا ''سلیم صاحب ملت فروشوں کا مرثیہ پڑھیں گے۔''

حاضرین تھوڑی دیر شور مچاتے رہے۔ بالآخر صدر نے اٹھ کر انہیں خاموشی کی تلقین کی سلیم نے مذبذب سی آواز میں تقریر شروع کی چند فقرے کہنے کے بعد سلیم نے لکھے ہوئے کاغذات ایک نظر دیکھنے کے بعد میز پر رکھ دیے اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ تقریر کرنے لگا۔ الفاظ رک رک کر اس کی زبان پر آ رہے تھے۔

حاضرین میں کانا پھوسی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اچانک وہ سنبھل گیا اس کی آواز صاف اور بلند ہوتی گئی وہ خیالات کی ایک نئی رو میں بہہ رہا تھا وہ کہہ رہا تھا:

''حضرات! اگر الطاف صاحب اور ان کے ساتھی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں تقریریں کرنے سے نہیں شرماتے تو مجھے پاکستان کے متعلق قصائد لکھنے میں عار نہیں متحدہ ہندوستان الطاف صاحب کو ہندو اکثریت کی غلامی کا طوق پہناتا ہے اور پاکستان مجھے ایک آزاد قوم کے فرد کی حیثیت عطا کرتا ہے، اگر انہیں ہندو کی دائمی غلامی اور ذلت کا شوق ہے تو مجھے عزت اور آزادی سے محبت ہے لیکن کاش! یہ مسئلہ میری اور الطاف صاحب کی ذات یا ان لوگوں تک محدود ہوتا جنھوں نے اس بحث میں حصہ لیا ہے۔ اس صورت میں ہماری بحث اپنے اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی تک محدود رہتی لیکن یہ دو قوموں کا مسئلہ ہے۔ یہ دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان کے مفادات کی ٹکر ہے۔ ہندو متحدہ ہندوستان چاہتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں پر دائمی تسلط رکھ سکے۔ درہ خیبر سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک رام راج کے جھنڈے لہرا سکے اور حکومت کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد وہ کسی دقت کے بغیر مسلمانوں کو برہمو سماج کا قابل نفرت حصہ بنا سکے۔''

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں اور ایک

قوم کو بڑھنے، پھولنے اور پنپنے کیلئے آزاد وطن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ جب مسلمان پاکستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں وہ دفاعی مورچہ ہوتا ہے جہاں اسے ہندو اکثریت کے جارحانہ مقاصد سے نجات مل سکتی ہے اور جب ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسی وسیع شکار گاہ ہوتی ہے جہاں اکثریت کے بھیڑیے کسی روک ٹوک کے بغیر اقلیت کی بھیڑوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔

ہندو پاکستان کے خلاف متحد اور منظم ہو چکا ہے۔ مہا سبھائی ہندو، کانگرسی ہندو، سناتن دھرمی ہندو، آریہ ساجی ہندو، تشدد پر ایمان رکھنے والا ہندو اور عدم تشدد کی تبلیغ کرنے والا ہندو، بظاہر مسلمانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ہندو، اور در پردہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کرنے والا ہندو سب ایک ہو چکے ہیں اور اگر ہم نے اپنے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر لیں تو ہمیں بھی ایک ہونا پڑے گا۔ یاد رکھیے! اگر ہم اجتماعی نجات کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے تو مشترکہ تباہی میں ایک دوسرے کے ساتھی ضرور ہوں گے۔

ہندو سارے ہندوستان میں اپنے دیوتاؤں کے مندر تعمیر کرنا چاہتا

ہے۔وہ اپنے اس ماضی کی طرف لوٹنے کے لیے بے قرار ہے جب وہ اپنے گناہوں کے بدلے اچھوت کا بلیدان دیا کرتا تھا۔اور مسلمان ہندوستان کے ایک گوشے میں اپنی ان مساجد کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جہاں توحید کے چراغ روشن ہیں جہاں ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو عدل اور مساوات کا پیغام ملتا ہے۔ ہندو اکھنڈ ہندوستان میں برہمن کا اقتدار چاہتا ہے، مسلمان پاکستان میں خدا کی بادشاہت چاہتا ہے لیکن آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ نیشنلسٹ یا گاندھی بھگت مسلمان کیا چاہتے ہیں؟

آفتاب نے دبی زبان سے کہہ دیا ''دال روٹی'' اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

سلیم نے قدرے توقف کے بعد اپنی تقریر پھر شروع کی:

''یہ لوگ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کے علیحدہ وجود سے منکر ہیں ان کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی ہے اور ان خطرناک الزامات سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی رسی سے جکڑ کر اس تاریک گڑھے میں پھینک دیا جائے، جہاں سے ابھی تک اچھوت کے کراہنے کی آواز آرہی ہے۔ یہ وطن پرست ہیں اور وطن کا دیوتا دس کروڑ مسلمانوں کا بلیدان لیے بغیر خوش نہیں ہوسکتا۔ یہ اقتصادیات کے ماہر ہیں اور انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ پاکستان بھوکا اور ننگا ہوگا

لیکن کاش! یہ دردمند ان قوم ذرا جرأت سے کام لیں اور یہ کہہ دیں کہ انہیں اپنی دال روٹی کی فکر ہے اگر پاکستان بن گیا تو یہ اس من وسلویٰ سے محروم ہو جائیں جو ان کے لیے وارد ھاکے آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔"

میں آزادی کی نعمت کو روٹیوں کے ساتھ تولنے کا قائل نہیں، تاہم وہ ہندو جو پاکستان کی بھوک کے تصور سے گھلے جا رہے ہیں، اگر حق گوئی سے کام لیں تو انہیں یہ کہنا پڑے گا کہ اگر پاکستان کے زرعی صوبے ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو انہیں گندم کی بجائے کوئی اور غذا تلاش کرنی پڑے گی اگر پاکستانیوں کو کپڑے کی ضرورت ہے تو دنیا بھر کے کارخانہ دار پاکستان کی روئی کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ فنون حرب کے بھی ماہر ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان دفاعی لحاظ سے بھی کمزور ہوگا۔ لہٰذا ان کی قیمتی رائے کا احترام کرتے ہوئے ہمیں پاکستان کے قیام کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہندو کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔۔۔ پاکستان کی فتح یا شکست کا فیصلہ تو کسی پانی پت کے میدان میں ہوگا لیکن یہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موت سے پہلے ہی اپنی قبریں کھود چکے ہیں۔ پاکستان کے دفاع کو اگر کوئی خطرہ ہوگا تو وہ ان شکست خوردہ لوگوں کی طرف سے ہوگا۔ میں انہیں اطمینان دلاتا

ہوں کہ ان کی پیشانیوں پر ملت فروشی کا جو داغ آج ہم دیکھ رہے ہیں، اسے کل تک ہر شخص پہچان سکے گا۔ یہ لوگ زیادہ عرصہ قوم کو اپنے نیک مشوروں سے مستفید نہیں کرسکیں گے۔ یہ لوگ امن پسند ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے نعرے سے ہندو مہاشے خفا ہو جاتے ہیں اور اس سے آپس کا فساد بڑھتا ہے اور فساد بڑھنے سے گاندھی کی آتما کو دکھ ہوتا ہے لہٰذا اگر مسلمان پاکستان کا خیال ترک کر کے ہندو اکثریت کی دائمی غلامی قبول کرلیں تو نہ ہندو مہاشہ خفا ہوگا نہ فساد بڑھے گا اور نہ گاندھی جی کی آتما کو دکھ ہوگا اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا ہمیں تنگ نظر اور فسادی کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ یعنی اگر ہم اپنی خوشی سے اکھنڈ ہندوستان کے سیاسی قبرستان میں دفن ہونے کیلئے تیار ہو جائیں تو آثار قدیمہ کے ماہرین ہمارا مزار دیکھ کر یہ کہا کریں گے کہ یہ ہے وہ قوم جس نے ہندو کو اپنی شرافت، امن پسندی، نیک نیتی اور وسیع النظری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ یہاں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے معماروں کے وہ جانشین دفن ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں ہندو اقتدار کا محل کھڑا کرنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کو آگ لگا دی تھی۔ یہ ان امن پسند بھیڑوں کی ہڈیوں کا انبار ہے جنہوں نے بھیڑیوں کو اپنا نگہبان بنا لیا تھا۔

پاکستان کو اس ملک میں ہم اپنا آخری دفاعی مورچہ سمجھتے ہیں، یہ

ہندو فسطائیت کو روکنے کے لیے ہماری آخری دیوار ہے ہم ہندو کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں۔ ہم اس کی آبادی کی نسبت سے ہندوستان کے تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصے پر اس کی حکومت کا حق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندو کو اپنی آزادی سے زیادہ ہمیں غلام بنانے کی فکر ہے۔ جب ہندو مسلمانوں کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مثال اس ڈاکو سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے ہمسائے سے یہ کہہ رہا ہو۔ بھائی دیکھو تم اپنے گھر کے گرد چار دیواری کیوں بنا رہے ہو؟ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو ایسی غلط فہمیوں سے بھائی چارے میں فرق آتا ہے اس لیے میں تمہیں یہ دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہوشیار ڈاکو عام طور پر گھر کے کسی بھیدی کو ساتھ ملا لیتے ہیں یہ گھر کا بھیدی آکر مالک سے کہتا ہے ارے یار! یہ کیا مصیبت ہے کہ تم ساری رات لٹھ اٹھائے دروازے پر پہرا دیتے ہو، جاؤ! اطمینان سے سو جاؤ۔ ورنہ پڑوسی یہ خیال کریں گے کہ تم انہیں چور سمجھتے ہو۔ حضرات! یہ کانگرسی مسلمان ہمارے گھر کے بھیدی ہیں۔

اطاف اور اس کے چند ساتھی یکے بعد دیگرے احتجاج کے لیے اٹھے لیکن ان کی آواز مخالفین کے نعروں اور قہقہوں میں دب کر رہ گئی ''بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! پاکستان زندہ باد! گھر کے بھیدی مردہ باد''

الطاف چلایا ''صاحب صدر! سلیم کی تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔''

آفتاب نے اٹھ کر کہا ''نہیں، ہم سنیں گے!''

اکثریت نے آفتاب کی تائید کی اور صدر نے کہا ''میرے خیال میں دونوں فریق یہاں سمجھنے اور سمجھانے کی نیت سے آئے ہیں۔ اس لیے میں مسٹر سلیم کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت دیتا ہوں۔ اسکے بعد حزب مخالف کا لیڈر کچھ کہنا چاہے تو میں اسے موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔''

حاضرین کی اکثریت نے تالیوں کے ساتھ صدر کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور سلیم نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کی:

''حضرات! اگر میں پاکستان کو محض ایک علمی اور نظریاتی مسئلہ سمجھتا، تو شاید اس بحث میں حصہ نہ لیتا۔ مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ پاکستان کا مسئلہ ہماری موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ طوفان بڑی تیزی سے آ رہا ہے اور جو لوگ آج پاکستان کا تمسخر اڑا رہے ہیں، کل اس کی چار دیواری کو اپنی آخری جائے پناہ خیال کریں گے۔ جب دوپہر کی جھلستی ہوئی ہوا چلتی ہے تو منتشر قافلے خود بخود درختوں کی چھاؤں میں جمع ہو جاتے ہیں میں ہندو کے قہر و غضب سے پریشان نہیں بلکہ اسے قیام پاکستان کے لیے ایک نیک فال سمجھتا

ہوں پاکستان کی مخالفت میں اس کا متحدہ محاذ ہمیں پاکستان کی حمایت میں متحدہ محاذ بنانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن میں آپ کو ان نام نہاد مسلمانوں سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو پاکستان کی مخالفت اور ''رام راج'' کے جواز میں قرآن پاک کی آیات پیش کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔۔۔۔۔ جب بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہونے والا تھا، اس قسم کے لوگوں نے مسلمانوں کو مناظروں میں الجھائے رکھا۔ آج جب ہندو ہم پر یلغار کرنے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کر رہا ہے تو ان لوگوں نے پاکستان کو موضوع بحث بنا رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جس وقت تک ہندو کی تیاری مکمل نہیں ہو جاتی، جب تک ان کے مندر اور سکھوں کے گوردوارے بم سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل نہیں ہو جاتے، یہ لوگ ہمیں ذہنی انتشار میں مبتلا رکھیں گے۔ ان لوگوں کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث شاید پاکستان کے متعلق مسلمانوں کی جدوجہد چند برس اور محض تقریروں، قراردادوں اور نعروں تک محدود رہے اور ہمیں مورچہ بنانے کی اس وقت فکر ہو جب دشمن چاروں طرف سے گولہ باری کر رہا ہو۔''

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قیام پاکستان عملی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری آزادی اور بقا کے دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں اور ہم اگر مکمل تباہی نہیں چاہتے تو ہمیں

پاکستان یا موت کا نعرہ لگا کر میدان میں آنا پڑے گا۔

ہم ان لوگوں کی چیخ پکار سے پریشان کیوں ہوں، جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیروں کی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں جو رب کعبہ سے منہ پھیر کر بھارت کے دیوتاؤں پر ایمان لا چکے ہیں ہمیں اپنی ساری توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول کر دینی چاہیے جو اسلام کے لیے زندہ رہنا اور اسلام کے لیے مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو عملی جدوجہد کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہمیں ملک کے ہر گوشے میں یہ پیغام پہنچانا ہے کہ اب اپنی عزت، آزادی اور بقا کے لیے آگ اور خون میں کھیلنے کا وقت آ گیا ہے۔

میرے دوستو! اب تقریروں، قراردادوں اور بیان بازی کا وقت نہیں۔ عمل اور حرکت کا وقت ہے۔

سلیم کی تقریر کے بعد الطاف اور اس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بہت حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ صدر نے الطاف کو دوبارہ اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، تو وہ قدرے تذبذب کے بعد اٹھا لیکن کسی نے بلند آواز میں نعرہ لگا دیا "گھر کا بھیدی" اور آفتاب نے "لنکا ڈھائے" کہہ کر فقرہ پورا کر دیا۔ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور الطاف نے اسٹیج تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

☆☆☆☆☆

جب مجلس برخاست ہوئی تو سلیم کے چند دوست اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر ان کی داد و تحسین سننے کے بعد سلیم کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سلیم صاحب السلام علیکم!"

یہ دلکش آواز سلیم کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل تک اتر گئی۔ سلیم نے وعلیکم السلام کہہ کر پیچھے دیکھا۔۔۔ ایک خوش وضع نوجوان مسکرا رہا تھا۔ سلیم پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہ سکا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ تم نے اسے دیکھا ہے، تم اسے جانتے ہو، تم اس آواز سے آشنا ہو۔ دوسری نگاہ میں ماضی کے حسین اور دلفریب نقوش دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی سطح پر آ گئے۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے سادہ اور معصوم مسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔ اس کے کانوں میں دلکش قہقہے گونجنے لگے، وہ بے اختیار "ارشد! ارشد!" کہتا ہوا نو وارد سے لپٹ گیا "تم کب آئے؟ تم کہاں تھے؟ اتنی دیر تم کہاں غائب رہے؟ تم نے مجھے خط تک نہیں لکھا۔۔۔" سلیم جواب کا انتظار کیے بغیر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے اردگرد دوسرے لڑکوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے کہا "چلو کمرے میں بیٹھتے ہیں"

ارشد اس کے ساتھ چل دیا۔ سلیم نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا بجلی کا بٹن دبایا اور ارشد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود چارپائی پر بیٹھ گیا اب وہ قدرے اطمینان سے اپنے سوالات دہرا رہا تھا۔

ارشد نے ان سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ "میں

امرتسر کے میڈیکل سکول سے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ اب تم مجھے چھوٹا سا ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔ فوج کو اپنی خدمات پیش کر چکا ہوں۔ خیال ہے کہ جلد ہی بلا لیا جاؤں گا۔ لاہور میں میرے خالو بیمار تھے میں ابا جان کے ساتھ ان کی تیمار داری کے لیے آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کی مزاج پرسی سے زیادہ تمہیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ شام کو یہاں پہنچا تو مباحثہ ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ تمہاری تقریر بھی سن لی۔ اگر پاکستان کے لیے کوئی فوج بھرتی کر رہے ہو تو میرا نام بھی لکھ لو۔''

سلیم نے پوچھا ''لاہور کب آئے؟''

''بس ہم کوئی چار بجے یہاں پہنچے تھے''

''لیکن تمہیں میرے متعلق کیسے معلوم ہوا؟''

''بھئی میں تمہارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں''

''کب؟''

''پچھلے مہینے آخری ہفتے کے روز میں، ابا جان اور امی وہاں گئے تھے رات ہم وہاں رہے اور اتوار کی شام واپس چلے آئے۔''

''اور اس کے بعد بھی تم نے مجھے خط نہ لکھا!''

''بھئی میں نے خط کی بجائے خود لاہور آنے کا ارادہ کیا تھا''

''تو پھر مجھے تمہارے خالو جان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے بیمار ہو کر تمہیں اس نیک ارادے کی تکمیل کا موقع دیا۔۔۔۔ اچھا میں تمہارے لیے کھانا منگواتا ہوں ابھی تک میں نے خود بھی نہیں کھایا۔''

ارشد نے جواب دیا ''بھئی تکلف کی ضرورت نہیں اب بہت دیر ہو گئی ہے اور مجھے ماڈل ٹاؤن پہنچنا ہے وہاں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔''

''نہیں تم ماڈل ٹاؤن نہیں جاؤ گے میں تمہارے لیے چارپائی اور بستر کا انتظام کرتا ہوں تم رات یہیں رہو!''

''لیکن ابا جان پریشان ہوں گے ہمیں کل دوپہر کو واپس جانا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ علی الصباح تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''

''بھئی نہیں، اگر تمہارے ابا جان کو یہ معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو تو وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے تمہیں روک لیا ہے۔ صبح میں تمہارے ساتھ جا کر معذرت کر لوں گا۔''

''بھئی یہ تو ابا جان بھی کہتے تھے کہ میں نہیں آسکوں گا۔''

ہوسٹل کے نوکر نے کمرے کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا'' سلیم صاحب! کھانا لے آؤں؟''

''ہاں بھئی، دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ''

نوکر چلا گیا اور سلیم نے ارشد کی طرف متوجہ ہو کر کہا'' ارشد! میں ایک دوست کی مزاج پرسی کر آؤں۔ پانچ منٹ میں آتا ہوں اس کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

☆☆☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد سلیم اور ارشد بستروں پر لیٹے ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ ارشد سے اچانک ملاقات پر سلیم کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال تھا، وہ ابھی تک اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وہ مقدس دھڑکنیں تھیں جنہیں اس کے ہونٹوں تک آنا گوارا نہ تھا۔

اچانک ارشد نے کہا ''سلیم! بڑے دنوں کی چھٹیوں میں تم امرتسر ضرور آؤ اگر میں اپنے گاؤں گیا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ امی نے بھی تاکید کی ہے کہ تم ضرور آؤ!''

سلیم نے کہا ''بھئی! یہ آج پتہ چلا کہ تم گاؤں کے رہنے والے ہو تم تو کہا کرتے تھے کہ مجھے گاؤں کی زندگی دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔''

ارشد نے جواب دیا ''ہاں بھئی ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے پہلی بار اس وقت اپنا گاؤں دیکھا تھا جب میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہاں ہماری تھوڑی سی زمین تھی جس کا بیشتر حصہ دادا مرحوم نے اپنی زندگی میں گروی رکھ دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ابا جان نے اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرنے کے لیے باقی کھیت بھی گروی رکھ دیے۔ ملازم ہونے کے بعد مکان انہوں نے اپنے چچا زاد بھائیوں کے حوالے کر دیا۔ اور وہاں سے یہ عہد کر کے نکلے کہ وہ گاؤں میں اس وقت تک آباد نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنی زمین نہیں چھڑا لیتے۔ اب ابا جان نے نہ صرف وہ زمین چھڑا لی ہے بلکہ کچھ اور خرید لی ہے، گاؤں سے باہر ہم نے ایک چھوٹی سی کوٹھی بھی بنوا لی ہے سلیم تم ضرور آؤ عصمت اور راحت بھی تمہیں بہت یاد کرتی

ہیں۔ عصمت ابھی تک اپنی سہیلیوں کو تمہاری کہانیاں سنایا کرتی ہے۔‘‘

’’وہ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟‘‘ سلیم نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

’’عصمت دسویں میں ہے اور راحت ساتویں میں‘‘

سلیم دو ننھے اور معصوم چہروں پر زمانے کی تبدیلیوں کا تصور کرنے لگا اور ماضی کے دلفریب نقوش اسے موہوم تصویریں نظر آنے لگے۔ وہ بچپن کے بے اختیار قہقہوں کو جوانی کی سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا عصمت اب بڑی ہوگئی ہے رواج کے ہاتھ اس کے چہرے پر نقاب ڈال چکے ہوں گے اب وہ اس کے لیے پھولوں کے گلدستے نہیں بنا سکے گا۔ اب وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہہ سکے گا ’’دیکھو! اسے گرا نہ دینا‘‘ وہ ان دنوں، مہینوں اور برسوں سے خفا تھا جو اس کی شاہراہ حیات کے ہر رنگین اور دلکش نقش کو اپنی آغوش میں چھپا رہے تھے۔

ارشد سو گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سلیم کو بھی نیند آ گئی خواب میں وہ ماضی کی دیواریں پھاندتا ہوا اس رنگین وادی میں جا پہنچا جہاں بچپن اچھلتا کودتا اور قہقہے لگاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بڑے دنوں کی چھٹیوں میں سلیم کو سیدھا اپنے گاؤں جانے کی بجائے امرتسر

اترنا پڑا۔ ارشد گزشتہ ملاقات میں اسے بتا چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے نوکری سے مستعفی ہو کر اپنی دکان کھول لی ہے وہ امرتسر میں اپنے مکان کا پتہ بھی اس کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

دوپہر کے وقت دکان بند تھی، اس لیے سلیم نے تانگے والے کو مکان کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ تانگے والے کو ڈاکٹر شوکت کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے محلے میں داخل ہو کر جس دکاندار سے مکان کا پتہ پوچھا وہ خود ہی ساتھ آ کر اسے مکان کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ سلیم نے تانگے سے اپنا سوٹ کیس اتار کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ اور تانگے والے کو کرایہ ادا کرنے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے باہر جھانکتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں'' اور پیشتر اس کے کہ سلیم کچھ کہتا، اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

سلیم نے قدرے تذبذب کے بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسی لڑکے نے پھر ایک بار کواڑ کھول کر اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کہا ''میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں'' وہ دوبارہ دروازہ بند کرنے کو تھا کہ سلیم نے جلدی سے کہا '' ارے امجد! تم مہمانوں کے ساتھ اسی طرح پیش آیا کرتے ہو؟ ارشد کہاں ہے؟''

''بھائی جان باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

کسی نے امجد کا کان پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا اور کہا'' آپ لاہور سے آئے ہیں؟''

''جی ہاں!''سلیم نے راحت کو پہچانتے ہوئے جواب دیا

راحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور وہ امی جان! آپا جان! کہتی ہوئی واپس بھاگ گئی۔

ماں کی آواز آئی ''اری کیا ہے؟''

''امی جان وہ آگئے ہیں؟''

''کون سلیم؟''

''ہاں وہ آگئے ہیں''

عصمت کتاب پھینک کر اپنے کمرے سے نکلی اور دروازے کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگی اچانک سلیم نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔عصمت جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ماں نے کہا ''راحت تم بیٹھک کا دروازہ کھول کر بھائی کو اندر بٹھاؤ، آج خدا جانے نوکر کہاں غارت ہو گیا ہے۔''

راحت نے امجد سے کہا ''امجد تم جاؤ انہیں بیٹھک میں لے آؤ میں دروازہ کھولتی ہوں''

امجد نے جواب دیا ''بس میں نہیں مانتا تمہارا کہنا تم نے میرا کان کیوں کھینچا تھا۔''

''تھپڑ لگاؤ اس کے منہ پر''ماں نے بگڑ کر کہا

''بڑا کمینہ ہے یہ''عصمت نے آگے بڑھ کر کہا

امجد ایسے مہمان کی آمد پر قطعاً خوش نہ تھا جس نے آن کی آن میں گھر کی فضا بدل دی تھی تاہم اسے مجبوری سمجھتے ہوئے وہ مکان سے باہر نکل آیا اور سلیم سے مخاطب ہو کر بولا ''آؤ جی بیٹھک میں!''

اتنی دیر میں راحت بیٹھک کا دروازہ کھول چکی تھی سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اندر داخل ہوا۔۔۔۔راحت تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی سلیم نے سلام کیا۔

وہ بولی ''بیٹا جیتے رہو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ارشد ابھی باہر گیا ہے۔۔۔۔۔بیٹھ جاؤ بیٹا! راحت! تم نے بھائی کو سلام نہیں کیا!'' اور وہ ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ ''بھائی جان السلام علیکم'' کہہ کر ساتھ والے کمرے میں غائب ہوگئی۔ عصمت دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔راحت نے اس کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں کہا ''آپا جان! اب تو وہ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔''

''چڑیل چپ رہو!'' عصمت اسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے دور لے گئی۔

بیٹھک میں ان کی ماں سلیم سے کہہ رہی تھی ''بیٹا تم آرام سے بیٹھو، ارشد ابھی آ جائے گا۔ میں تمہارے لیے چائے تیار کراتی ہوں۔امجد! تم اپنے بھائی کے پاس بیٹھو!''

وہ چلی گئی تو سلیم امجد کی طرف متوجہ ہوا امجد ادھر آؤ!'' امجد جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔امجد پڑوس میں اپنے ایک

ہم جماعت کے گھر جا کر پتنگ اڑانا چاہتا تھا اور وہ اس خیال سے پریشان تھا کہ جب تک ارشد نہیں آئے گا، اسے چھٹی نہیں ملے گی لیکن سلیم بچوں کو بہلانا جانتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔"

سلیم نے پوچھا "امجد! تم اپنے گاؤں کب جا رہے ہو؟"

"ہم کل جائیں گے آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں نا؟"

"ہاں! تم میرا گاؤں دیکھ چکے ہو لیکن تم اس وقت بہت چھوٹے تھے"

"بھلا گاؤں میں سانپ ہوتے ہیں؟"

"ہوتے ہیں"

"بہت بڑے بڑے سانپ جو آدمی کو سالم نگل جاتے ہیں؟"

"نہیں ایسے سانپ نہیں ہوتے یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"راحت نے وہ کہتی تھی کہ سانپ جب پھنکارتے ہیں تو آگ نکلتی ہے اور اگر انہیں ڈنڈا مارا جائے تو ڈنڈے کو آگ لگ جاتی ہے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ گاؤں میں ریچھ، شیر اور چیتے ہیں۔"

"وہ تم سے مذاق کرتی ہوگی۔"

"مجھے معلوم ہے، وہ مذاق کرتی ہے۔ یہ جانور جنگلوں میں ہوتے ہیں لیکن بھوت اور جن گاؤں میں ضرور ہوتے ہوں گے اور رات کے وقت وہ لوگوں کو ڈراتے بھی ہوں گے؟"

"نہیں، اگر انسان کو ڈرپوک نہ ہو تو اسے کوئی نہیں ڈراتا"

''آپ کو کبھی نہیں ڈرایا کسی نے؟''

''نہیں''

''راحت کہتی ہے کہ بھوت بڑا خطرناک ہوتا ہے وہ بچوں کو چمٹ جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ اسے ٹھنڈے پانی میں غوطے نہ دیے جائیں بعض بھوت بہت ضدی ہوتے ہیں اور ان سے جان چھڑانے کے لیے منہ کو سیاہی لگا کر گدھے پر سواری کرنی پڑتی ہے۔ بھلا یہ سچ ہے؟''

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا اور راحت دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کھڑی اپنی دانت پیس رہی تھی۔

''یہ سب جھوٹ ہے نا؟''

سلیم نے کہا ''تمھیں یہ سب باتیں راحت نے بتائی ہیں؟''

''ہاں جی وہ بہت جھوٹ بولتی ہے وہ کہتی تھی گاؤں میں جب بارش ہوتی ہے تو پانی لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتا ہے اور جو تیرنا نہیں جانتے وہ ڈوب جاتے ہیں اس لیے مجھے گاؤں میں نہیں جانا چاہیے۔''

سلیم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''وہ تم سے مذاق کرتی ہے''

امجد بولا ''یہ بھی کہتی ہے کہ رات کے وقت جب گاؤں کے لوگ سو جاتے ہیں تو چوہے ان کے اوپر چڑھ کر ناچتے ہیں اور گیدڑ کھیتوں سے نکل کر'' راحت نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔

سلیم کی توجہ امجد کی طرف تھی، اس لیے وہ راحت کو نہ دیکھ سکا۔امجد کے اچانک خاموش ہو جانے پر اس نے کہا ''ہاں بھئی! گیدڑ کیا کرتے ہیں کھیتوں سے نکل کر؟''

''بھائی جان! یہ بکواس کرتا ہے'' راحت یہ کہتے ہوئے اندر آ گئی

امجد بولا ''ہونہہ! تم نے کہی نہیں تھیں مجھ سے یہ باتیں؟''

راحت نے کہا ''بھائی جان، یہ کانگرسی ہے اس کی باتوں پر یقین نہ کیجئے یہ کٹر کانگرسی ہے۔''

راحت نے امجد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا کانگرسی کہلانا اس کے لیے ایک گالی کے مترادف تھا اور کٹر کانگرسی کہلانا اس کے نزدیک بدترین گالی تھی بالخصوص جب سے اس نے مہاتما گاندھی کی تصویر دیکھی تھی، کانگرسی بن جانے کا تصور بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔اس کے ذہن میں کانگرس اور مہاتما گاندھی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔اس نے غصے میں آ کر کہا ''مجھے کانگرسی کہو گی تو میں تمہاری ساری باتیں بتا دوں گا تم نے مجھے مینڈکوں، کچھوؤں اور نیولوں کے متعلق بھی بتایا تھا کہ وہ سردیوں کی راتوں میں بچوں کے ساتھ آ کر سو جاتے ہے۔اور بھینسے مکان کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں بھینسے کے متعلق تو بڑی آپا نے بھی کہا تھا۔۔۔''

عصمت نے دوسرے کمرے سے آواز دی ''امجد!''

اور اس نے جواب دینے کی بجائے فریاد کے لہجے میں کہا ''آپا جان! چھوٹی آپا مجھے کٹر کانگرسی کہتی ہیں''

''امجد! ادھر آؤ!'' اندر سے دوبارہ آواز آئی

امجد اٹھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا لیکن راحت نے جلدی سے اس کا کان پکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

سلیم ہنس رہا تھا امجد چند منٹ کے بعد دوبارہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ کافی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد آ گیا سلیم نے اس کے ساتھ چائے پی اور شام کے وقت دونوں سیر کے لیے نکل گئے رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد سلیم، ارشد، ڈاکٹر شوکت اور ان کی بیوی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ راحت اور امجد خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ سلیم عصمت کی غیر حاضری کے باعث اس محفل میں ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔

گفتگو کا موضوع پاکستان تھا سلیم کی گرمجوشی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے کہا ''خدا کا شکر ہے کہ تم جیسے نوجوان اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہے، ہندو بہت زیادہ تیار ہو چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ابھی تک اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہمیں ایک وطن کی ضرورت ہے تم نوجوانوں کو بہت کام کرنا ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ طوفان آ چکا ہو گا اور ہم ابھی تک یہ بحث کر رہے ہوں گے کہ ہمیں کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔''

ارشد کی ماں بولی ''بھئی سلیم! ارشد تمہاری تقریر کی بہت تعریف کرتا تھا اگر یہاں تمہارے پاس اس کی کوئی نقل ہے تو ہمیں بھی سنا دو''

''جی، جو تقریر میں نے کی تھی، وہ تو مجھے اسی دن بھول گئی تھی میں نے فقط مخالفین

کے اعتراضات کا جواب دینے پر اکتفا کا ہے تھا۔"

"اچھا جو لکھی تھی، وہ سنا دو!"

سلیم نے اپنا سوٹ کیس کھول کر چند کاغذ نکالے اور انہیں پڑھ کر سنانے لگا ڈاکٹر صاحب نے اسے کئی بار "خوب اور بہت خوب" کہہ کر داد دی اور اختتام پر کہا "بھئی خدا تمہیں ہمت دے تم پاکستان کے لیے بہت کام کر سکو گے!"

ارشد کی ماں بولی "بیٹا! جب تم عصمت اور راحت کو عجیب و غریب کہانیاں سنایا کرتے تھے میں اسی وقت کہا کرتی تھی کہ خدا نے تمہیں بہت اچھا ذہن دیا ہے۔"

راحت نے آہستہ سے امجد کے کان میں کچھ کہا اور وہ بلبلا اٹھا "ابا جان راحت مجھے پھر کانگرسی کہتی ہے۔"

راحت کو ماں نے ڈانٹا اور وہ رنجیدہ ہونے کی بجائے ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

راحت اور امجد کے جھگڑے گھر کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے تھے۔ راحت اسے چھیڑتی وہ ماں یا باپ کے پاس جا کر فریاد کرتا۔ کبھی کبھی راحت کو ڈانٹ پڑتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے امجد کے ساتھ بول چال بند کر دیتی۔ پھر امجد کی باری آتی۔ وہ دوسروں سے نظر بچا کر اس کا منہ چڑاتا۔ جب اس پر بھی وہ متوجہ نہ ہوتی تو وہ اس کے ہاتھ سے کتاب، قلم یا سویٹر بننے کی سلائیاں چھین کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔ راحت اس کا پیچھا کرتی کبھی کبھی امجد جان بوجھ کر اس کے ہاتھ آ جاتا اور راحت اسے پیٹنا چاہتی لیکن وہ ہاتھ جو غصے سے بلند ہوتے، امجد کے حسین گالوں

تک پہنچتے پہنچتے رک جاتے ''پھر کرو گے شرارت؟'' وہ اس کا کان پکڑ کر کہتی۔

''نہیں! نہیں! آپا جان معاف کر دو'' وہ ہنستے ہوئے کہتا اور آپا جان بھی اپنا غصہ بھول کر ہنس پڑتیں اور اگر کبھی راحت کچھ دیر کے لیے سچ مچ خفا ہو جاتی تو امجد محسوس کرتا کہ گھر کی فضا پر اداسی چھا رہی ہے۔

آج بھی جب راحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد امجد کو سلیم، ارشد اور اپنے والدین کی محفل میں تنہائی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر اس نے اپنے دل پر جبر کیا۔ بالآخر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا راحت جو عصمت کے پاس بیٹھی اس سے کھسر پھسر کر رہی تھی، دبی زبان میں بولی'' آپا یہ کانگرسی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا''

☆☆☆☆☆

رات کے وقت یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ سلیم، ارشد کی والدہ اور بچوں کے ساتھ ان کے گاؤں جائے گا اور وہ تین دن وہاں رہے گا۔

چنانچہ صبح دس بجے کے قریب وہ ان کے ساتھ امرتسر سے اجنالہ کی طرف جانے والی موٹر پر سوار ہو گیا۔ ڈاکٹر شوکت اپنی مصروفیات کے باعث ان کا ساتھ نہ دے سکے۔

اجنالہ سے چند میل آگے ارشد نے ڈرائیور کو لاری کھڑی کرنے کے لیے کہا گاؤں کے چار آدمی جنہیں ڈاکٹر شوکت کے چچا زاد بھائی نے سامان اٹھانے کے

لیے بھیجا تھا، سڑک پر کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ارشد نے سامان ان کے حوالے کیا اور یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل گاؤں کی طرف چل دیے۔

ارشد کی والدہ اور عصمت سیاہ برقعے پہنے ہوئے تھیں اور راحت نے موڑ سے اترنے کے بعد برقعہ اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔

ارشد سلیم سے کہہ رہا تھا "یہ راحت بڑی چڑیل ہے پچھلے دنوں اسے خیال آیا کہ برقع پہننے سے چھوٹی لڑکیاں بھی معتبر بن جاتی ہیں چنانچہ اس نے ہمیں برقع سلوانے پر مجبور کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی۔ اب اس کی جان عذاب میں ہے۔ اگر ایک دن برقع پہن لیتی ہے تو دو دن دوپٹے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی ابھی ہم گاؤں پہنچیں گے تو وہاں کے بچوں پر رعب ڈالنے کے لیے فوراً برقع پہن لے گی۔"

کوئی دو میل پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ارشد نے سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "سلیم! وہ ہمارا گاؤں ہے اور وہ آم کے درخت کے ساتھ ہمارا نیا مکان ہے وہ درخت بہت پرانا ہے، میرے دادا نے لگایا تھا۔"

سلیم دو دن وہاں رہا اس عرصہ میں راحت اور امجد اس کے ساتھ کافی مانوس ہو چکے تھے رات کو کھانا کھانے کے بعد سلیم کافی دیر ارشد، راحت، امجد اور ان کی والدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں اس کے گاؤں میں کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جو سننے والوں کے لیے بیحد دلچسپ تھے۔ چچا اسماعیل گاؤں کی زندگی میں نئے قہقہوں اور نئی مسکراہٹوں کا اضافہ کر چکا تھا۔۔۔ چودھری

رمضان سے کئی اور بدحواسیاں سرزد ہو چکی تھیں کا کو عیسائی اور ہری سنگھ لوہار کی لفظی جنگ کئی نئے مراحل طے کر چکی تھی سلیم انہیں یہ واقعات سناتا اور کبھی کبھی اسے ان کے علاوہ ساتھ والے کمرے سے کسی کے دبے دبے میٹھے اور دلفریب قہقہوں کی آواز بھی آتی اور اسے اس دیوار کا احساس ہونے لگتا جو وقت نے اس کے اور عصمت کے درمیان حائل کر دی تھی۔

دوسری رات وہ انہیں ایک ادبی رسالے سے اپنا مضمون 'میرا گاؤں' پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اس کی کرسی کمرے کے ایک کونے میں میز کے قریب تھی جس پر لمپ جل رہا تھا۔ ارشد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک چارپائی پر ارشد کی والدہ، امجد اور راحت بیٹھی ہوئی تھیں عصمت ساتھ والے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی دبے پاؤں آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی سلیم کو اس کمرے میں اس وقت اس کی موجودگی کا احساس ہوا جب کسی واقعہ پر وہ ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز ساتھ والے کمرے کی بجائے اب اس کمرے کے کونے سے آ رہی تھی۔

اچانک امجد چلایا "امی جان! اب بڑی آپا بھی مجھے کانگرسی کہتی ہیں" اس پر سب ہنس پڑے اور عصمت اپنا سارا وجود سمیٹ کر ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد عصمت راحت کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور امجد چوکنا ہو کر سننے کی کوشش کر رہا تھا عصمت نے غصے کی حالت میں اسے گردن سے پکڑ کر پرے

دھکیلتے ہوئے کہا ''کانگرسی پیچھے ہٹو!''

امجد اپنے مطلب کی کوئی بات تو نہ سن سکا تاہم اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ کانا پھوسی اس کے سوا کسی اور کے متعلق نہیں چنانچہ وہ اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

راحت نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''بھائی جان! اس پیر کا واقعہ سنائیے جو آپ کا گھوڑا خریدنے آیا تھا۔''

امجد گھوڑا خریدنے والے پیر کے ساتھ اپنا کوئی تعلق قائم نہ کرسکا تاہم اس نے سلیم کو ایک بات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بولا ''بھائی جان! یہ بات بڑی آپا نے چھوٹی آپا کے کان میں کہی ہے۔ میں سن رہا تھا۔''

ماں نے ڈانٹا ''تم بہت شریر ہو گئے ہو''

امجد اب محسوس کر رہا تھا کہ ہر معاملے میں صاف گوئی سودمند ثابت نہیں ہوتی۔۔۔۔ ماں اسے گھور رہی تھی راحت اس کی پنڈلیوں میں اپنے ناخن چبھونے کی کوشش کر رہی تھی اور عصمت نظر بچا کر اس کے کان مروڑ رہی تھی۔ وہ زہر کے گھونٹ پی کر اٹھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں سلیم کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا۔

سلیم نے پیر ولایت شاہ کی سرگزشت کے ساتھ رمضان کے کوٹھے پر چڑھنے والے بھینسے کا قصہ بھی سنا دیا۔ اختتام پر جب سب قہقہے لگا رہے تھے، امجد ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گیا اور ارشد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''بھائی جان! ہم اپنے مکان کے پچھواڑے کسی کو پیال کا ڈھیر نہیں لگانے دینگے۔''

ارشد نے سلیم سے کہا ''بھئی جب ہم تمہارے گاؤں گئے تھے،تو اس گھوڑے کی تصویر تمہاری بیٹھک میں لگی ہوئی تھی، مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔''

ارشد کی ماں نے پوچھا ''بیٹا کیسے مرا وہ؟''

''یوسف میری غیر حاضری میں اسے گھر والوں سے چوری چنے کھلا دیا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ میری غیر حاضری میں اسے پوری غذا نہیں ملتی۔ ایک دن اس نے اس کے آگے بہت زیادہ چنے ڈال دیے۔۔۔۔گھر والوں کو اس کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ یوسف کی محبت کا شکار ہوا ہے۔''

امجد نے برہم ہو کر کہا ''یوسف کون ہے؟''

''وہ میرا چھوٹا بھائی ہے،وہ تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا،تم اسے بھول گئے؟''

امجد نے کہا ''جب آپ کو پتہ چل گیا کہ گھوڑے کے آگے اس نے زیادہ چنے ڈال دیے تھے تو آپ نے اسے کچھ نہ کہا؟''

''بھئی اسے کیا معلوم تھا کہ زیادہ چنے کھانے سے گھوڑا مر جائے گا۔''

امجد کو اچانک اپنی مظلومیت کا احساس ہوا اور اس نے کہا ''دیکھو جی! ایک دن میں نے بھائی جان کی میز سے دوات گرا دی تو انہوں نے مجھے دو تین تھپڑ لگا دیے۔ ایک دن مجھ سے بڑی آپا کا قلم ٹوٹ گیا تو انہوں نے بھی مجھے پیٹا تھا۔''

ارشد ہنستے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور کہا ''سلیم بھائی! یہ بڑا خطرناک آدمی ہے!''

راحت بولی ''بھائی جان! سب کانگرسی خطرناک ہوتے ہیں'' اور امجد دانت پیس کر رہ گیا۔

ماں بولی ''خبردار! میرے بیٹے کو کسی نے کانگرسی کہا تو۔۔۔۔۔!''

☆☆☆☆☆

اگلے دن سلیم نے اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہا۔ ارشد سڑک تک اس کے ساتھ آیا اور اسے موٹر پر بٹھا کر واپس چلا گیا۔ شام کے پانچ بجے سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھائے اس پگڈنڈی پر جا رہا تھا جس کے ہر موڑ اور ہر کھیت کی تصویر اس کے دل پر نقش تھی لیکن اس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک نئے راستے کے نقوش اس کے دل میں ابھر رہے تھے گاؤں کے قریب پہنچ کر اسے بڑ کا وہ درخت نظر آنے لگا جو اس کے مکان کے سامنے تھا اور اس کا تصور آم کے اس درخت تک جا پہنچا جس کی شاخیں ارشد کے مکان پر پھیلی ہوئی تھیں وہ سوچ رہا تھا کاش! یہ درخت اس قدر قریب ہوتے کہ ان کی شاخیں ایک دوسرے سے مل جاتیں۔ کاش وہ مکان اس قدر پاس ہوتا کہ وہ کسی کے شرمائے ہوئے دبے دبے قہقہوں کو سن سکتا۔ سلیم کے ذہن میں ماضی کے خیالات کی منتشر کڑیاں ایک زنجیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں نئی امنگیں اور نئے ولولے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے شعور و احساس میں ایک گہرائی آ چکی تھی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، اس نے گاؤں سے باہر رہٹ کے پانی سے

وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا تو اس کی دعا میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ دعا ختم کر کے اٹھنے والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کر لیں اور وہ ہاتھوں اور کلائیوں کو ٹٹولتے ہی چلا اٹھا ''کون مجید؟''

مجید ہنس پڑا اور وہ اٹھ کر اس کے گلے لپٹ گیا مجید کے ساتھ ایک اور قوی ہیکل نوجوان کھڑا تھا۔ سلیم نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور جواب طلب نگاہوں سے مجید کی طرف دیکھنے لگا مجید بولا ''بھلا بتاؤ تو یہ کون ہے؟''

سلیم نے غور سے اس کی طرف دیکھا، اچانک ماضی کے چند دھندلے نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے ''ارے داؤد!'' وہ چلایا

مجید نے ہنستے ہوئے کہا ''داؤد نکالو ایک روپیہ! دیکھو سلیم! یہ مجھ سے شرط لگاتا تھا کہ تم اسے نہیں پہچان سکو گے۔''

سلیم بولا ''بھئی مجھے پہچاننے میں کچھ تکلیف ضرور ہوئی اب اس نے استرے سے سر منڈانے کی بجائے بال رکھ لیے ہیں بھئی داؤد! کب آئے؟''

اس نے جواب دیا ''مجھے کوئی آٹھ دن ہو گئے ہیں آج پتہ چلا کہ چودھری مجید آئے ہوئے ہیں، اس لیے یہاں چلا آیا۔ اب واپس جا رہا تھا کہ آپ مل گئے۔''

''بس اب تم یہیں ٹھہرو گے!''

مجید بولا ''ہاں بھئی، اب تم نہیں جا سکتے''

رات کے وقت مجید اور داؤد اپنی فوجی زندگی کے کارنامے سنا رہے

تھے۔۔۔۔۔۔مجید اب جمعدار ہو چکا تھا اور داؤد ابھی تک سپاہی تھا۔

☆☆☆☆☆

جنگ کے اختتام کے بعد برطانیہ کی وزارت ہندوستان کو آزادی کے اس درخت کا پھل تقسیم کرنے والی تھی جسے جرمنی اور جاپان کی گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے غلام اقوام سے خون اور پسینے کی بھیک مانگی گئی تھی۔ انگریز بظاہر ہندوستان کی سیاسی جنگ میں ایک فریق کی بجائے ثالث کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کانگرس جس نے 1942ء میں جاپان کی سنگینوں کے سائے میں ہندو سامراج کے احیاء کے امکانات دیکھ کر "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا تھا، اب مایوسی کی حالت میں ٹوکیو کی بجائے لندن کو اپنی توقعات کا مرکز بنا چکی تھی۔

انگریز بہر حال جا رہا تھا کب جا رہا تھا؟ کن حالات میں جا رہا تھا؟ کانگرس کو اس کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی اس کے سامنے فقط ایک نصب العین تھا اور وہ یہ کہ گورا سامراج جن اختیارات سے دستبردار ہو، وہ کالے فاشزم کے ہاتھ آ جائیں انگریزی اقتدار کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور کانگرس چاہتی تھی کہ اس کی ٹمٹماتی لو سے ہندو اقتدار کی مشعل روشن کر لی جائے "شیر برطانیہ" بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے اور وہ ہندوستان کی وسیع شکار گاہ کو چھوڑنے والا تھا اور بھارت کے بھیڑیوں کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی وہ کہہ رہے تھے "ان داتا! تم جا رہے ہو تو یہ شکار گاہ ہمارے سپرد کر جاؤ۔ دیکھو ہماری اکثریت ہے تمہیں ان بھیڑوں

کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جو پاکستان کی چراگاہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ ہماری ہیں ہم ان کی رکھوالی کریں یا شکار کھیلیں، تمہیں اس کے متعلق پریشان ہونے کا حق نہیں۔"

ہندو کے سامنے صرف ایک محاذ تھا اور اس محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری قوتیں بروئے کار لا چکا تھا، اور یہ محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ کانگرس ایک طرف ان جنونیوں کی افواج تیار کر رہی تھی جنہوں نے تاریخ انسانیت میں ظلم، وحشت اور بربریت کے ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا اور دوسری طرف انگریز کے ساتھ اس کی منطق یہ تھی کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں، اس لیے آزاد ہندوستان میں جو ہمارے حصے آتا ہے، وہ ہمیں دے دو جو مسلمان کے حصے آتا ہے، وہ بھی ہمیں دے دو۔ اور صرف یہی نہیں تم جانے سے پہلے ہمیں اقتدار کے گھوڑے پر سوار کر دو۔ ہمارے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دے دو اور مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو۔ پھر تم اطمینان سے چلو جاؤ۔ پھر کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔۔۔۔ کوئی فساد نہیں ہوگا۔ اس ملک میں شانتی ہی شانتی ہوگی۔۔۔۔۔ اگر تم نے پاکستان کے نعروں کی طرف توجہ دی تو ہم یہ کہیں گے کہ تم فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد رکھ کر جا رہے ہو۔ ہم ہندوستان کی مقدس گائے کے دو ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔

☆☆☆☆☆

دوڑ شروع ہو چکی تھی مسلمان پاکستان کو اپنا آخری حصار سمجھ کر طوفان سے پہلے

وہاں پہنچنا چاہتا تھا اور ہندو فاشزم پاکستان کو اپنے جارحانہ مقاصد کے سامنے سد سکندری سمجھ کر اس کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہندو فاشزم اپنی پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن مسلمانوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ ان کے راستے میں وہ نام نہاد نیشنلسٹ مسلمان کانٹے بچھا رہے تھے جو ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض ہندو کے ساتھ قوم کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکے تھے۔ ان کے راستے میں وہ یونینسٹ مسلمان گڑھے کھود رہے تھے جن کے اسلاف نے کبھی سکھوں اور کبھی انگریزوں سے اپنی قوم کے شہیدوں کے خون کی قیمت وصول کی تھی۔ یہ ابن الوقت انگریزی راج کے خاتمہ کے آثار دیکھ کر ہندو فسطانیت کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔ پنجاب کو یہ اپنے باپ دادا کی میراث سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور یہ کہ ان کے اقتدار کا طرہ بلند رہے۔ خواہ یہ مقصد انگریز کے بوٹ چاٹنے سے حاصل ہو، خواہ ہندو کی قدم بوسی سے۔

کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو عملی تیاریوں میں مصروف تھے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر رکھنے کے لیے ملت فروشوں کے گروہ کئی ناموں اور کئی چولوں کے ساتھ میدان میں آ چکے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے:

کانگرس نے ایک مسلمان کو "راشٹر پتی" کے لقب سے سرفراز کر دیا ہے اس لیے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں۔

پنجاب میں فلاں مولوی فلاں پروفیسر نے اپنے تازہ بیان میں کہا

ہے کہ مسلم عوام پاکستان نہیں چاہتے لہٰذا پاکستان محض ایک نعرہ ہے۔

سندھ میں فلاں سید اور فلاں حاجی پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مضرت رساں خیال کرتا ہے لہٰذا سمجھ دار مسلمان پاکستان کے مخالف ہو گئے ہیں۔

بلوچستان میں ایک شخص نے قراقلی اتار کر گاندھی ٹوپی پہن لی ہے اس لیے پاکستان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبہ سرحد کے فلاں خان صاحب نے گاندھی جی پرارتھنا سبھا سے اٹھنے کے بعد یہ بیان دیا کہ گاندھی جی بہت اچھے آدمی ہیں بکری کا دودھ پیتے ہیں مرن برت رکھتے ہیں اور چرخہ کاتتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کی نجات پاکستان بنانے میں نہیں چرخہ کاتنے میں ہے۔

مسلمان بدحواس تھے پریشان تھے ان کے کندھوں پر لولے لنگڑے اور سیاسی بصیرت سے کورے رہنماؤں کی لاشیں تھیں۔ ان پر منافقوں اور ملت فروشوں کی شخصیتوں کے بھوت سوار تھے۔ یہ راہنما مختلف راستوں سے اپنے اپنے گروہ کو اس سیاسی قبرستان کی طرف ہانک رہے تھے۔ جہاں کانگرس ان کے کفن دفن کے انتظامات مکمل کر چکی تھی۔

ان مایوسیوں میں ایک آواز ڈگمگاتے، اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے مسلمانوں کے لیے صور اسرافیل کا کام دے رہی تھی۔ ایک دبلا پتلا اور عمر رسیدہ رہنما انہیں منزل کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے نحیف اور لاغر ہاتھوں سے قوم کے سفینے کے

پھٹے ہوئے بادبانوں کی مرمت کرتا اور کبھی دشمن کے چہرے سے مکر دریا کے نقاب نوچتا۔اس کی گرجتی ہوئی آواز سننے والوں کی رگوں میں بجلی کی لہر بن کر دوڑ جاتی ۔وہ کانٹوں کو روندتا ہوا اور مخالفت کی چٹانوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ تھا۔

☆☆☆☆☆

1945ء میں کانگرس کا رویہ جس قدر مسلم لیگ کے ساتھ غیر مصالحانہ تھا اسی قدر وہ انگریز کی طرف جھک رہی تھی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب انگریز کو شمالی ہند سے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔اب ان جری نوجوانوں کی کوئی قدر نہ تھی جنہوں نے جرمنی اور جاپان کا سیلاب روکنے کے لیے اپنے فراخ سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔اب برطانیہ کے تجارتی مقاصد کو بڑی بڑی توندوں والے مہاجنوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔مشرق کے ممالک میں امریکہ کے تاجروں کی اجارہ داری کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے برطانوی کارخانہ دار کانگرس کے ٹاٹاؤں، برلوں اور ڈالمیوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔کانگرس کے سرمایہ دار سرپرستوں کے گروہ کا لیڈر سیٹھ برلا برطانیہ میں اپنی تجارتی مہم کے لیے گاندھی کی اشیر باد حاصل کرکے اس حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم اشارہ کر چکا تھا کہ انگریز اور کانگرس کے سیاسی سمجھوتے میں اور برطانوی تاجر اور ہندو مہاجن کی سودا بازی کو ایک لازمی شرط قرار دیا جائے گا۔

مرکز میں عبوری دور کے لیے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے سلسلہ میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ مرکز میں ہندو اور مسلم نمائندوں کی برابری کے اصول کی مخالف تھی۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے حصے میں سے بھی کم از کم ایک نیشنلسٹ مسلمان کو نامزد کرنے کا حق تسلیم کروانا چاہتی تھی تاکہ بوقت ضرورت اسے وارد ھا کے سامراجی مقاصد کے رتھ میں جوتا جا سکے۔

بظاہر یہ نیشنلسٹ یا سیاسی یتیموں کا گروہ کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت یہ وہ بے جان پتھر تھے جن کی آڑ لے کر کانگرس ہندو کی فرقہ وارانہ جنگ کو غیر فرقہ دارانہ رنگ دینا چاہتی تھی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے عام انتخابات مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ تھے کانگرس کو کسی دوسری ہندو جماعت سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا۔ وہ ہندو عوام پر یہ ثابت کر چکی تھی کہ اسلام دشمنی یا پاکستان کی مخالفت میں اس کی ذہنیت ہندو مہاسبھا کی ذہنیت سے مختلف نہیں لیکن مسلم لیگ کے سامنے کئی محاذ تھے۔ ہر صوبے میں کسی نہ کسی نام سے ملت فروشوں کی ٹولیاں موجود تھیں اور انہیں مسلم لیگ کے مقابلہ میں کامیاب کروانے کے لیے کانگرس کے مہاجن اپنی تجوریاں کھول چکے تھے۔

پنجاب میں ابن الوقت یونینسٹوں کا گروہ یہ دیکھ کر کہ اس کے سر سے انگریز کا سایہ اٹھنے والا ہے، اپنے اقتدار کا طرہ بنیے کی دھوتی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔

بیرونی حملے کی نسبت اندرونی حملہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اقوام کو دشمن سے زیادہ اپنے غدار تباہ کرتے ہیں اور یہاں غدار ایک نہ تھا، دو نہ تھے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کی کوئی بستی، کوئی شہر اور کوئی مجلس ایسی نہ تھی جو ان کے وجود سے خالی ہو۔۔۔۔۔ اور آج تک کسی قوم نے ایسے غدار پیدا نہیں کیے جنہوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر قوم کو یہ سمجھانے کی جسارت کی ہو کہ تمہیں اپنی بقاء کے لیے آزاد وطن کی ضرورت نہیں۔ رائے عامہ کتنی کمزور کیوں نہ ہو، ملت فروشوں کو پہلوانوں کی حیثیت سے اپنے سیاسی اکھاڑے میں کودنے کی اجازت نہیں دیتی۔۔۔۔ وہ قوم کی آنکھوں کے سامنے زہر کا پیالہ بھر کر یہ نہیں کہتے کہ میں دشمن کی طرف سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ موت کے بعد تمہاری لاش کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ چھپ چھپ کر انتشار کا بیج بوتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں میں اجتماعی شعور کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ وہ ملت فروش جنہیں صبح و شام دشمن کے دستر خوان کی ہڈیاں چوستے دیکھا جاتا تھا، بازاروں میں دندناتے تھے، چوراہوں پر کھڑے ہو کر تقریریں کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ ان کی جماعتیں تھیں، انجمنیں تھیں، اور وہ علی الاعلان قوم کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ اے قوم! اگر تجھے پاکستان مل گیا تو تیرا ستیاناس ہو جائیگا۔ عزت، آزادی اور خود مختاری تیرے لیے بھوک، افلاس اور قحط کا پیغام لائے گی، ہندو ناراض ہو جائے گا اور مہاتما گاندھی کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔۔۔۔ مسلمانو! یہ کیا بزدلی ہے کہ تم ہندو اکثریت کے اقتدار سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ دنیا کیا کہے گی

کہ تم اس قدر تنگ نظر تھے۔

مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقوں میں پنجاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور یہی وہ محاذ تھا، جہاں کامیابی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کے لیے پاکستان کی منزل مقصود کی طرف ایک قدم آگے بڑھانا ناممکن تھا

بنگال کے حالات امید افزاء تھے، وہاں کانگرس جن مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی، وہ اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے لیکن پنجاب میں ہندو فسطائیوں کو اپنی بندوقوں کے لیے یونینسٹوں کے کندھے کا سہارا مل چکا تھا۔ کانگرس یہ سمجھ چکی تھی کہ مسلم عوام اس کے پرانے نمک خواروں یعنی نیشنلسٹ مسلمانوں کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں اس لیے پنجاب میں مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے انہوں نے یونینسٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور اپنے تمام ذرائع ان کی کامیابی کے لیے وقف کر دیے۔ یہ لوگ انتخاب کی جنگ لڑنے کے لیے انگریز پرست حکام کی مدد سے لاکھوں روپیہ جمع کر چکے تھے اور اب کانگرسی مہاجنوں کی سرپرستی کے باعث ان کی پونجی بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

ان حالات میں مسلمان نوجوان اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اجتماعی خطرات کے سامنے آنکھیں بند کر کے نہ بیٹھ سکا۔ وہ اپنی درس گاہیں، اسکول اور کالج چھوڑ کر طرے اور لنگوٹی کے اس ناپاک اتحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں آ گیا پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی نسبت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا جوش وخروش کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو کی اسلام دشمنی ان

پر زیادہ واضح تھی، اس لیے ان صوبوں کے سینکڑوں طلباء جن کی بیشتر تعداد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی تھی، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

ضلع گورداسپور کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقامی مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر صدارت کی کرسی پر رونق افروز تھا اور ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اس جلسے کے انعقاد سے قبل شہر اور اردگرد کے دیہات میں منادی کی گئی تھی کہ ایک پیر صاحب کے صاحبزادے اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور چند مشہور لیڈر تقریریں کریں گے دیہات کے لوگ کچھ بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھنے اور کچھ پیر صاحب کے صاحبزادے سے عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے شہر میں جمع ہو چکے تھے جلسے کا وقت ہو چکا تھا کہ صاحبزادے کا پیغام پہنچ گیا کہ انہیں راستے میں روک لیا گیا ہے اور وہ اگلے دن پہنچ سکیں گے۔ مقررین کے متعلق کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔

مقامی ذیلدار اور تھانیدار اس جلسے کے مخالف تھے۔ تحصیلدار صاحب دو دن قبل اس شہر کے اردگرد کے دیہات کے معتبرین کو بلا کر خبردار کر چکے تھے کہ حکام بالا کو علاقے میں بدامنی کا اندیشہ ہے، اس لیے لوگوں کو جلسے میں شریک ہونے سے روکا جائے۔ تھانیدار صاحب شہر کے دکاندار کو دھمکی دے چکے تھے کہ اگر اس نے مسلم

لیگ کے جلسے کے لئے لاؤڈ سپیکر دیا تو اچھا نہ ہوگا۔ ذیلدار صاحب بھی نمبر داروں کی ٹولی کے ساتھ دیہات کا چکر لگا چکے تھے کرائے کے چند مولوی علاقے میں سب سے بڑے مہاجن کی موٹر کار پر بیٹھ کر سادہ دل دیہاتیوں کو یہ بتا چکے تھے کہ پاکستان کا نعرہ ان کے لیے بہت خطرناک ہے لیکن اس گاؤں کے چند لڑکے امرتسر اور لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے اور مقامی اسکول کے طالب علموں کی ایک بھاری تعداد ان کے زیر اثر تھی۔ چنانچہ وہ ان کے منظم گروہ کے ساتھ قرب وجوار کی بستیوں میں اس جلسے کی منادی کر چکے تھے۔

جلسہ شام کے چار بجے ہونا تھا اور دیہات کے طالب علم دوپہر سے پہلے ہی اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کے گروہ لے کر شہر پہنچ رہے تھے۔ طالبعلموں کے ہاتھوں میں سبز جھنڈیاں تھیں اور ہر ٹولی کے آگے ایک شخص ڈھول بجاتا آ رہا تھا۔۔۔۔ یونینسٹ امیدوار نے ڈسٹرکٹ کانگرس کے صدر کو یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ یہاں ایک عدد ہوشیار مولوی کی اشد ضرورت ہے۔

پیر صاحب کے صاجزادے کا پیغام ملنے کے بعد منتظمین جلسہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب صدارت کون کرے گا؟ ایک ضعیف العمر ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ذیلدار تھانیدار اور حکام بالا کے عتاب سے بے پرواہو کر کرسی صدارت پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گیا تو لیڈروں کا انتظار ہونے لگا۔۔۔۔ ساڑھے چار بج گئے حاضرین میں اضطرات پیدا ہونے لگا۔ بالآخر کالج کے ایک نوجوان نے تقریر شروع کر دی۔۔۔۔ وہ پاکستان کے حق میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے جوش وخروش کا مظاہرہ

کر رہا تھا لیکن جو لوگ دور سے چل کر آئے تھے، بوڑھے اور نحیف و لاغر سکول ماسٹر کو پیر جی کے صاحبزادے اور اس نوعمر لڑکے کو کسی بڑے لیڈر کا نعم البدل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی تقریر کا اثر اسٹیج کے اردگرد بیٹھنے والے آدمیوں تک محدود تھا۔۔۔ اور جو ذرا دور تھے، وہ بے پروائی سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔ اچانک اس جلسہ گاہ سے کوئی سو قدم دور سڑک پر دو نئی خوب صورت کاریں اور ان کے پیچھے ایک لاری آ کر رکی جس پر لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا۔۔۔۔ یونینسٹ امیدوار کار سے اترا۔ اس کے ساتھ ایک کانگرسی مولوی اور اس علاقے کے تین با اثر زمیندار بھی کار سے اترے دوسری کار سے علاقے کا ذیلدار، سفید پوش اور تین نمبر دار نمودار ہوئے نتھا سنگھ تھانیدار اور کریم بخش حوالدار نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا یونینسٹ امیدوار کے اشارے سے پروپیگنڈا کی لاری کے لاؤڈ سپیکر پر گراموفون ریکارڈ لگا دیا تھا اور مسلم لیگ کی جلسہ گاہ سے پچھلی صفوں کے لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر سڑک پر جمع ہونے لگے۔ کانگرسی مولوی صاحب لاری کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور مائیکرو فون ہاتھ میں لے کر قرآن کی تلاوت کے بعد تقریر شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں اس مسلم لیگ کے جلسہ کی رونق آدھی سے کم رہ گئی۔

مسلم لیگ کے مقابلہ میں یونینسٹ امیدوار کی اس ہنگامہ آرائی کو تقویت دینے کے لیے بازار اور آس پاس کی گلیوں کے ہندو اور سکھ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ مسلم لیگ کے جلسے میں تقریر کرنے والے نوجوان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ''مسلم لیگ زندہ باد! پاکستان زندہ باد!''

اس کے جواب میں موٹر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا ”نعرہ تکبیر!“ اور اس کے جواب میں بیک وقت دو مختلف آوازیں بلند ہوئیں مسلمان ”اللہ اکبر“ کہہ رہے تھے لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے بدحواسی کے عالم میں ”زندہ باد“ کہہ دیا مسلمان ہنس پڑے، وہ ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے۔ ”دیکھو بھئی! جب مولوی صاحب نعرہ لگائیں تو اللہ اکبر کہنا چاہیے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا ”ہندو مسلم اتحاد“ تو سکھوں اور ہندوؤں نے ”زندہ باد! کہہ کر پہلی غلطی کی تلافی کر دی۔

اچانک سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ جس پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سلیم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے چار اور نوجوان بھی تھے۔ سلیم کے اشارے سے ڈرائیور نے جیپ مسلم لیگ کے اسٹیج کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ گاؤں کے وہ لوگ جو ابھی تک دل پر جبر کر کے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، اٹھ اٹھ کر جیپ سے اترنے والے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا ”لیڈر آ گئے“ کوئی کہہ رہا تھا ”نہیں یار! یہ لیڈر نہیں لیڈر ان کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔“

سلیم اور اس کے ساتھی جیپ سے اترے ان میں دو علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور ان کی سیاہ اچکن اور تنگ پاجامے دیکھ کر بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ یہی لیڈر ہیں نوجوان مقرر نے اسٹیج سے اتر کر سلیم اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کیا اس سے چند سوالات پوچھنے کے بعد سلیم صورت حالات کا جائزہ لے چکا تھا اس نے جلسے کے منتظمین کو تسلی دے کر کہا ”آپ فکر نہ کیجئے، ہمارے پاس لاؤڈ

سپیکر موجود ہے، آپ اسے جیپ سے نکلوا کر اسٹیج پر لگوا دیجیے۔‘‘

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ’’بھئی ناصر علی! یہ وہی مولوی ہے، جسے ہم نے پرسوں امرتسر میں بھگایا تھا۔‘‘

’’ارے یہ کیچوا یہاں بھی پہنچ گیا‘‘ کالی اچکن والے ایک نوجوان نے حیران ہو کر کہا ’’یار بڑا ڈھیٹ ہے یہ‘‘

لاؤڈ سپیکر فٹ ہو گیا تو سلیم نے کہا ’’ناصر علی صاحب! ذرا نعت پڑھ دیجیے‘‘

ناصر علی نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نعت شروع کی اور سامنے تقریر کرنے والے مولوی کی آواز اس کی بلند اور دل کش تانوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ مسلمان جو تھوڑی دیر قبل جلسے سے اٹھ کر سڑک پر جمع ہو گئے تھے اب واپس آ رہے تھے۔

نعت ختم ہوئی تو سلیم مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ تھانے دار اور کریم بخش حوالدار وہاں آ دھمکے تھانیدار نے اسٹیج کے قریب آ کر کہا ’’شہر میں فساد کا خطرہ ہے، اس لیے آپ یہاں جلسہ نہ کریں!‘‘

سلیم نے جواب دیا اچھا صاحب! لیکن وہ سامنے سڑک پر کیا ہو رہا ہے؟

تھانیدار نے جواب دیا ’’ادھر مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں‘‘

’’تو آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں پٹاخے چلانے آیا ہوں؟‘‘

لوگوں نے قہقہہ لگایا اور تھانیدار نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ’’تم کون ہو؟‘‘

’’آپ نے ان مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے کہ وہ کون ہیں؟‘‘

”تمھیں اس سے کیا واسطہ؟ تم میری بات کا جواب دو!“

”سردار جی! آپ پاکستان کے متعلق کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟“

تھانیدار نے قدرے نرم ہو کر کہا ”دیکھو جی! میں یہاں دو جلسوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور چاہیے کہ ایک کی آواز دوسرا نہ سن سکے یہ میری ڈیوٹی ہے۔“

”ٹھیک ہے سردار صاحب! انہوں نے خواہ مخواہ اس جلسے میں خلل ڈالنے کے لیے لاری لا کر یہاں کھڑی کر دی ہے۔ انہوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ آپ یہاں ڈیوٹی پر کھڑے ہیں یہ یونینسٹ بہت شریر ہیں۔ یہ فساد کا بیج بوتے ہیں اور بدنام ہو جاتے ہیں آپ جیسے افسر۔ آپ انہیں کہیں کہ موٹر یہاں سے ہٹا لیں اور اگر پٹرول نہ ہونے کی وجہ سے موٹر یہاں رک گئی ہے تو سپاہیوں کو کہیں کہ اسے دھکیل کر ذرا دور لے جائیں۔“

کریم بخش حوالدار نے تلخ ہو کر کہا ”دیکھو! تم تم نے تقریر کی تو ہم لاٹھی چارج کر دیں گے“

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا ”کیسے بدتمیز ہو تم! میں تمہارے افسر سے بات کر رہا ہوں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو تمھیں یہ بھی خبر نہیں کہ جب تھانیدار کسی کے ساتھ بات کر رہا ہو تو حوالدار کو خاموش رہنا چاہیے!“

تھانیدار پہلے ہی اس الجھن سے باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا وہ حوالدار پر برس پڑا۔ ”تم کون ہو بیچ میں بولنے والے اور لاٹھی چارج کرنے کے لیے کس الو

کے چیلے نے کہا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد سلیم تقریر کر رہا تھا تھانیدار نہ ادھر تھا نہ ادھر، بلکہ درمیان میں کھڑا اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

گزشتہ تین ہفتوں میں امرت سر اور گورداسپور کے اضلاع کے دورہ کرنے کے بعد سلیم یہ سمجھ چکا تھا کہ شہروں کے باشندوں کو پاکستان کا حامی بنانے کے لیے اب تقریروں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ شہروں کے تاجر، مزدور اور ملازم پیشہ مسلمان ہندو ذہنیت کو خوب سمجھتے ہیں اور کانگرس یونینسٹ مسلمان کے کندھے پر اپنی بندوق رکھ کر انہیں فریب نہیں دے سکتی۔ شہروں کے تعلیم یافتہ بچے اور بوڑھے طرے اور لنگوٹی کے ناپاک اتحاد کے خلاف میدان میں آچکے تھے، لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ لوگ بہت کم تھے اور ان میں سے اکثر گھروں سے باہر سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے اور وہ چھوٹے یا بڑے تعلیم یافتہ زمیندار جو ملازم نہیں تھے، تھانیداروں، تحصیلداروں، ذیلداروں اور پولیس کے سپاہیوں، آنریری مجسٹریٹوں اور جھوٹی گواہیاں دینے والے معتبروں سے بہت مرعوب تھے۔ تاہم سلیم یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے بھی ستر یا اسی فیصدی ایسے ہیں جو بظاہر ابن الوقت یونینسٹوں کے ساتھ ہیں، لیکن وقت آنے پر پاکستان کو ووٹ دیں گے اگر وقت سے پہلے انہیں یہ پتہ چل گیا کہ اس انتخاب کے بعد پانچ دریاؤں کی سرزمین سے طرے کا اقتدار ختم ہونے والا ہے، تو وہ علی الاعلان پاکستان کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں آجائیں گے سب سے اہم مسئلہ دیہات کے ان پڑھ عوام کا تھا جن کے ووٹوں کی قیمت

چکانے کے لیے زمیندار لیگ کے چندے میں سود در سود لینے میں اور بلیک مارکیٹ کرنے والے مہاشوں کا فالتو روپیہ بھی شامل ہو چکا تھا دیہات کے لوگ ان معتبروں کو جو پانچ روپے کے عوض جھوٹی گواہی دینے کے لیے دس دس میل پیدل جایا کرتے تھے، اب خوبصورت کاروں پر یونینسٹ امیدواروں کے حق میں نعرے لگاتے دیکھ رہے تھے، وہ دیہاتیوں کے ساتھ اس قسم کی عام فہم باتیں کیا کرتے تھے:

''تمہیں مٹی کے تیل کی ضرورت ہے؟''

''جی ہاں!''

''اور تمہیں کھانڈ بھی نہیں ملتی؟''

''جی وہ بھی نہیں ملتی''

''تمہیں کپڑے کی بھی ضرورت ہے؟''

''جی ہاں! اب تو مردوں کے لیے کفن بھی نہیں ملتے۔''

''یونینسٹ امیدواروں کو ووٹ دو۔ تمہیں مٹی کا تیل بھی ملے گا، کھانڈ بھی ملے گی اور مردوں کے لیے کفن بھی ملیں گے کفن مفت ملیں گے۔''

''جی مفت؟''

''ہاں! بالکل مفت یونینسٹ پارٹی زمینداروں اور کسانوں کی پارٹی ہے تمہارے لیے ہر گاؤں میں اسکول اور ہسپتال کھولے جائیں گے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام ہوگا۔ لگان بالکل کم کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ ہاں! کفن کی اگر کسی کو ضرورت ہو تو اب بھی مفت مل سکتا ہے امیدوار خود تقسیم کرتا ہے۔''

گاؤں کے بچے خوب صورت کار کے گرد جمع ہو جاتے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ موٹر والوں کو بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ موٹر کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے، کوئی ہارن بجاتا۔ کوئی مڈگارڈ پر بیٹھ کر گنا چوستا۔ بزرگ انہیں ڈانٹتے لیکن کار والے کہتے ''بھئی! بچوں کو کچھ نہ کہو، ڈرائیور! ذرا ان کو سیر کرادو۔ ہاں بھئی! ذرا نعرہ لگاؤ'' فلاں چودھری زندہ باد! زمیندار اور کسان زندہ باد! اور گاؤں کے بچے اسے موٹر پر سواری کی فیس سمجھ کر نعرے لگا دیتے۔

سلیم اس اجتماع میں ان لوگوں کی بڑی تعداد دیکھ رہا تھا جو اس قسم کے پروپیگنڈے سے مرعوب کیے جا رہے تھے چنانچہ اس کی تقریر ان تقریروں سے بہت مختلف تھی، جو شہر کے لوگوں کے لیے کی جاتی تھیں وہ کہہ رہا تھا:

''بھائی! آج میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ میرے سامنے ایک مسلمان مولوی تقریر کر رہا ہے اور مسلمانوں سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں۔۔۔ اور وہ خوشی سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں۔۔۔۔ اور وہ خوشی سے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤ کہ تم نے پہلے کبھی یہ تماشا دیکھا ہے کہ ایک مولوی وعظ کر رہا ہو اور ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہوں؟''

سامعین میں سے بعض نے جواب دیا ''نہیں''

''اچھا بھائی! تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسا خضر صورت مولوی قرآن اور حدیث سنا رہا ہو، اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گلے میں پھولوں کے ہار

ڈال رہے ہوں؟''

''نہیں''لوگوں نے جواب دیا۔

''اچھا بھئی! یہ بتاؤ کہ وہ دو کاریں اور وہ موٹر جس کی چھت پر مولوی صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں، کس کی ہیں؟''

ایک نوجوان نے اٹھ کر جواب دیا''یونینسٹ امیدوار کی''

''لیکن بھئی! میں نے تو یہ سنا ہے کہ اس کے پاس اپنا صرف ایک ٹانگہ تھا اور وہ بھی ٹوٹ چکا ہے یہ نئی کاریں کہاں سے آ گئیں؟''

ایک شخص نے جواب دیا''یہ دونوں کاریں سیٹھ دھنی رام کی ہیں، اور لاری سردار گوپال سنگھ کی ہے۔''

''تو بات یوں ہے کہ سیٹھ دھنی رام نے مسلم لیگ کے مخالف امیدوار کو انتخاب کی جنگ کے لیے اپنی کاریں دی ہیں گوپال سنگھ نے اپنی لاری دی ہے اور لاؤڈ سپیکر بھی شاید کسی سردار صاحب یا سیٹھ صاحب نے دیا ہو۔ ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے ضرورت کے وقت ہمارے ایک غریب بھائی کی مدد کی ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب ہندو ساہوکار ایک غریب کسان سے قرضہ وصول کرتا ہے تو اس کے گھر سے دو آنے کا تو ابھی قرق کرا لیتا ہے لیکن آج یونینسٹ امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں دے رہے ہیں، روپیہ دے رہے ہیں۔ کل تک یہ لوگ کفن کا کپڑا بھی بلیک مارکیٹ میں بیچتے تھے لیکن اب مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کو، سینکڑوں تھان مفت دیے جا رہے ہیں تا کہ وہ تمہیں مفت کفن دے کر

ووٹ حاصل کر سکیں۔۔۔میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمارا ہندو بھائی جو سود در سود لے کر ایک آنے کا ایک روپیہ بنانے کا عادی تھا، اس قدر فضول خرچ کیوں ہو گیا ہے؟''

اس سوال کا جواب شاید تم نہ دے سکو اچھا یہ بتاؤ کہ ہندو پاکستان کا مخالف ہے یا نہیں؟]

''مخالف ہے'' سامعین نے جواب دیا

''اور وہ چودھری صاحب جو اس کے پیسوں سے مسلم لیگ کے خلاف انتخاب لڑ رہے ہیں؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''اور سکھ جنہوں نے انہیں اپنی لاری دی ہے؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''اور یہ مولوی صاحب، جن کی تقریر سن کر ہندو اور سکھ بھائی خوش ہو رہے ہیں؟''

''یہ بھی مخالف ہیں''

''اور وہ تھانیدار صاحب جو ابھی مجھ پر ناراض ہو رہے تھے؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''لیکن کیوں؟''

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سلیم نے قدرے تامل کے بعد کہا:

''بھئی! پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں، وہاں

مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں''

''لیکن ہندو کو اعتراض ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں ہندو زیادہ ہیں، وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور اگر چند دن کے لیے پاکستان کی مخالفت کرنے والے مسلمان امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں، کھانڈ کی بوریاں اور کفن کے لیے کپڑا دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا سکتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس کا ساہوکارہ ہوگا، اسی کا قانون ہوگا، اسی کی عدالتیں ہوں گی۔ وہ آج اگر ایک روپیہ خرچ کر رہا ہے، تو اس امید پر کہ کل وہ ایک لاکھ وصول کر سکے گا۔۔۔ اگر وہ پانچ سو یا ایک ہزار آدمیوں کو مفت کفن دے کر دس کروڑ مسلمانوں کو ذلت، افلاس اور غلامی کے قبرستان کی طرف دھکیل سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔''

کانگرسی مولوی اس سے پہلے بھی اس قسم کی تقریریں سن چکا تھا سلیم کے ساتھ امرتسر کے ایک قصبے میں اس کی مٹھ بھیڑ ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس سیدھی سادی راگنی کی جو تان اس پر ٹوٹنے والی ہے، وہ خطرناک ہے۔ وہ تقریر کرتے کرتے رک جاتا اور سمت مخالف سے چند الفاظ سننے کے بعد پھر کوئی بات شروع کر دیتا لیکن اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔

سلیم کہہ رہا تھا۔۔۔ ''کانگرسی ہندو یا سکھ پاکستان کے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ سارے ہندوستان پر ہندو کا راج چاہتے ہیں یہ یونینسٹ مسلمانوں کا گروہ اس

لیے پاکستان کے مخالف ہے کہ انہوں نے انگریز کے بعد ہندو کو اپنا مائی باپ بنالیا ہے لیکن تم حیران ہو گے کہ وہ خضر صورت مولوی صاحب جن کے سر پر ہندو کی سی چوٹی ہے، نہ سکھوں کے سے بال اور نہ یونینسٹوں کا سا طرہ، انہیں پاکستان کی مخالفت سے کیا ملتا ہے؟''

سلیم کے ایک ساتھی نے اٹھ کر جواب دیا ''دال روٹی اور کیا!''

اب لوگ مولوی صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے سلیم نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا ''نہیں بھئی! دال روٹی کے لیے کوئی شخص اتنا بدنام ہونا گوارا نہیں کرتا۔ یہ مرغ اور حلوے کی ڈکاریں ہیں۔۔۔لیکن مولوی صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہندو بھائی حلوہ اور پلاؤ کھلا کر ان سے کیا کام لے رہے ہیں۔تم جانتے ہو کہ شکاری کانٹے کے ساتھ مچھلی کیسے پکڑتا ہے؟ وہ ڈوری کے ساتھ کانٹا باندھتا ہے؟ پھر ایک کیڑا پکڑتا ہے جسے کیچوا کہتے ہیں اور اسے کانٹے کے ساتھ لگا کر پانی میں پھینک دیتا ہے مچھلی سمجھتی ہے کہ یہ اس کی غذا ہے وہ منہ کھول کر اس کی طرف دوڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کانٹا اس کے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ بھائی! تم مچھلیاں ہو، ہندو شکاری ہے، یونینسٹ امیدوار کانٹا ہے اور یہ مولوی کیچوا ہے۔اس کی شکل سے دھوکا نہ کھاؤ! یہ بڑا خطرناک ہے ہندو شکاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکل وصورت مسلمانوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔''

اب کانگرسی مقرر ایک ہدف تھا اور سلیم کے ترکش کے تمام تیروں کا رخ اس کی طرف تھا جب وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوتا تو سکول کے لڑکے یہ کہنا شروع کر

دیتے ''مولوی کیچوا۔۔۔۔مولوی کیچوا۔۔۔۔مولوی کیچوا ہائے ہائے'' بعض لڑکے اب جلسے سے اٹھ کر ایک دکان کی چھت پر جا چڑھے اور ان کے نعرے موٹر کے گرد کھڑے ہونے والے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

مولوی صاحب ایک حساس طبیعت کے آدمی تھے وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن کانگرس کے تمام انعامات کے عوض انہیں اس نئے لقب سے سرفراز ہونا گوارا نہ تھا۔ اب بچوں کی آوازوں کے ساتھ دیہاتیوں کے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔ یہ نئی صورت حال اور بھی زیادہ المناک تھی اور پھر جب چھت پر بیٹھے ہوئے بچوں نے ایک ساتھ ''مولوی کیچوا ہائے ہائے'' کہنا شروع کیا اور بعض ہندو سکھ بھی ہنس پڑے تو ان کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور وہ قائداعظمؒ کو برا بھلا کہنے کے بعد نیچے اتر آئے۔

جب ان کی موٹر روانہ ہو رہی تھی تو لڑکے آگے آگے بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے ایک لڑکے کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن غصے کی حالت میں وہ موٹر کی کھڑکی کا شیشہ نہ دیکھ سکے چنانچہ ان کا ہاتھ جس تیزی کے ساتھ اٹھا تھا اس سے زیادہ پھرتی کے ساتھ واپس آیا وہ تلملا کر ہاتھ جھٹک رہے تھے کہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا ذیلدار بلبلا اٹھا ''ارے ظالم! مار ڈالا''

اگلی سیٹ سے یونینسٹ امیدوار نے مڑ کر دیکھا۔ ذیلدار صاحب کا ہاتھ ان کی دائیں آنکھ پر تھا ''کیا ہوا چودھری صاحب'' اس نے سوال کیا

''مولوی نے میری آنکھ میں انگوٹھا ٹھونس دیا ہے تو بہ میری ان کے ناخن ہیں یا

نشتر؟''

مولوی صاحب کو کار سے باہر کھینچوا کہا جا رہا تھا ان کے ہاتھ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب ان کے ناخنوں کی تعریف ہو رہی تھی وہ کہنے لگے؟''لا حول ولا قوۃ'' دیکھو جی! میرے ناخن بڑے ہیں یا ذیلدار کے؟

ذیلدار نے اپنی پگڑی کا پلو گول مول کر کے اپنی آنکھ میں ٹھونستے ہوئے کہا''خدا کا شکر ہے کہ آپ کے ناخن بڑے نہیں، ورنہ آپ نے میری آنکھ نکالنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی خدا کی قسم! آپ تھوڑا سا زور اور لگا دیتے تو معاملہ ختم تھا''

☆☆☆☆☆

رات کے وقت سلیم اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے ایک ٹھیکیدار کے ہاں قیام کیا کھانا کھانے کے بعد وہ اگلے دن کا پروگرام تیار کر رہے تھے کہ شہر کے چند معززین آ گئے ان کے ساتھ وہ بوڑھا سکول ماسٹر بھی تھا جس نے شام کے جلسے کی صدارت کی تھی اس نے سلیم اور اس کے ساتھیوں سے ان لوگوں کو متعارف کرانے کے بعد کہا''بھئی آج آپ لوگ آ گئے، خدا نے ہماری عزت رکھ لی، ورنہ حالات بہت خراب ہو چکے تھے آپ لوگ بہت کام کر رہے ہیں خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسے نوجوان بیدار ہو گئے ہیں میں نے سنا ہے کہ علی گڑھ سے بھی کافی طلباء یہاں پہنچے ہیں؟''

سلیم نے کہا''جی ہاں! یہ مسٹر ناصر علی اور مسٹر ظفر، علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب

علم ہیں ناصر صاحب صوبہ بہار کے رہنے والے ہیں اور ظفر صاحب کا وطن یو پی ہے اور یہ مسٹر عزیز اور جعفر لاہور سے آئے ہیں۔"

ماسٹر نے کہا "خدا تمھیں ہمت دے!"

اس کے بعد اہل مجلس کی توجہ ناصر علی اور ظفر کی طرف مبذول ہوگئی کسی نے سوال کیا "آپ کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کی کامیابی یقینی ہے نا؟"

ناصر نے جواب دیا "جی ہاں! وہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں وہاں کے مسلمان ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں وہاں کانگرس کے ایجنٹ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔۔۔سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں عوام کو اس لیے پاکستان کی ضرورت کا احساس نہیں کہ ہندو یہاں انہیں بے ضرر نظر آتا ہے۔ اگر ایک پنجابی یا پٹھان کو یہ کہا جائے کہ ہندو بڑا وحشی اور ظالم ہے تو وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوگا کیونکہ وہ یہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ بالخصوص سرحد کے پٹھان سے اگر ہم ایسی بات کریں تو وہ ہمارا مذاق اڑائے گا۔ اس کے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صوبہ سرحد میں پاکستان کا نعرہ ابھی تک زیادہ مقبول نہیں ہوا۔۔۔۔یو پی، بہار اور اقلیت کے دوسرے صوبوں میں ہمارا بچہ بچہ پاکستان پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ وہاں یہ حالت ہے کہ ہندو حلوائی کی کڑاہی اگر کتا چاٹ رہا ہو تو وہ اسے دھتکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر سودا لیتے وقت مسلمان اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔"

ایک نوجوان نے کہا ''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے صوبوں کی مسلم اکثریت کو تو یقیناً فائدہ پہنچے گا، کیونکہ وہ آزاد ہوں گے اور ان کی اپنی حکومت ہو گی۔ ان کے لیے فلاح و ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔ لیکن آپ لوگوں کو جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں۔ اس سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے ایثار کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قیام پاکستان کے بعد اگر ہندو نے آپ سے انتقام لیا تو آپ کی بے بسی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟''

حاضرین مجلس اس سوال سے بہت برہم تھے لیکن ناصر نے اطمینان سے جواب دیا ''آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان کی حمایت میں ہمارے نعرے محض سطحی جذبات کی پیداوار ہیں اور ہم نے اپنے مستقبل کے متعلق نہیں سوچا لیکن ہم کسی اور رنگ میں سوچتے ہیں ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی غلامی قبول کریں دوسرا یہ کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خود مختار ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ہم سب ہندو کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ درہ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک رام راج کا جھنڈا لہرائے گا۔ ہم سب استبداد کی ایک ہی چکی میں پس رہے ہوں گے اور ہم سب کا مستقبل یکساں تاریک ہو گا۔ دوسری صورت میں کم از کم مسلم اکثریت کے صوبے ہندو کی غلامی سے بچ جائیں گے اور ہم یہ کہہ سکیں گے کہ

پاکستان ہمارے آزاد بھائیوں کا وطن ہے بیشک ہندو کا سلوک ہمارے ساتھ بیحد سفاکانہ ہوگا لیکن ہم اس امید پر جی سکیں گے کہ ہمارے بھائیوں کو ایک آزاد وطن مل چکا ہے اور وہ ہمارے حال سے بے پروا نہیں اگر راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان لڑکی کی فریاد نے دمشق کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا تو آپ تین چار کروڑ مسلمانوں کی فریاد سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیں گے۔ اگر قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہو گئیں تو کوئی محمد بن قاسمؒ اور کوئی محمود غزنویؒ ضرور پیدا ہوگا پاکستان کی سرزمین سے کوئی مردِ مجاہد ہماری فریاد سن کر ضرور تڑپ اٹھے گا بیشک ایک عبوری دور کے لیے ہمارے گرد تاریکیوں کا ہجوم ہوگا لیکن ہمارے دلوں میں امید کے چراغ جگمگاتے رہیں گے ہم اپنے ظلمت کدوں میں بیٹھ کر پاکستان کی خاک سے نمودار ہونے والے سورج کا انتظار کریں گے اور فرض کیجئے پاکستان میں ہمارے آزاد بھائی ہمیں بھول بھی جائیں یا ہماری فریاد انہیں متاثر نہ کر سکے تو بھی ہم اسے خسارے کا سودا نہیں سمجھ سکتے ہمیں مرنے کے بعد بھی یہ تسکین ضرور حاصل ہوگی کہ جن سفاک ہاتھوں نے ہمارا گلا گھونٹا ہے، وہ ہمارے بھائیوں کی شاہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اگر عزت اور آزادی کی زندگی میں ان کے ساتھی نہ بن سکے تو یہ ہمارے مقدر کی بات ہے لیکن ہم یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ذلت اور غلامی کی موت میں آپ بھی ہمارے ساتھی بن جائیں اگر ہم آپ کے ساتھ تیر کر ساحل تک نہیں جا سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ڈوب جائیں۔''

ناصر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جھلک رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

صوبہ سرحد کے سوا مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی پنجاب میں یونینسٹوں کا سفینہ انتخابات کے بھنور کی نذر ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں انہوں نے بہت بڑی شکست کھائی تھی۔ جہاں لیگ کے اسی امیدوار کامیاب ہوئے تھے، وہاں ابن الوقتوں کی تعداد فقط نو تھی لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے یونینسٹ اقتدار کے گرتے ہوئے محل کو سہارا دیا۔ انگریز گورنر نے ان کی سرپرستی فرمائی اور مسلم لیگ کے جو صوبے کی سب سے بڑی پارٹی تھی، نظر انداز کر کے خضر حیات کو وزارت کی تشکیل کا موقع دیا۔ چند ملت فروشوں کے باعث پنجاب کے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبہ میں اقلیتوں کے محکوم ہو چکے تھے مسلم لیگ ایک ہندو یا سکھ کو بھی اپنے ساتھ نہ ملا سکی، کیونکہ پنجاب میں لیگی وزارت کے قیام سے انہیں پاکستان کے محاذ کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن کانگرس کو پاکستان کے خلاف سامراجی مقاصد کی توپ کھینچنے کے لیے وہ آزمودہ کار خچر مل چکے تھے۔ جنہیں انگریز نے اپنے سیاسی اصطبل میں بڑے شوق اور محنت سے پالا تھا۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت بن چکی تھی سندھ میں بھی ابن الوقت مسلمانوں کا ایک ٹولا وزارت کا توبرا دیکھ کر کانگرس کے اقتدار کی رتھ کھینچنے کے لیے تیار تھا لیکن مسلم لیگ وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی اکثریت اس قدر نمایاں تھی کہ کانگرس کو جوڑ توڑ کا موقع نہ ملا بہر حال کانگرس اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر اس کا

تسلط تھا اور وہاں ہندو عوام کو پاکستان کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے منظم کیا جا رہا تھا۔ کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی میں ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی افواج کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھیں۔ ہندو مہاجن انہیں روپے دے رہے تھے اور ہندو ریاستوں سے ان کے پاس اسلحہ اور بارود پہنچ رہا تھا۔۔۔۔۔ مدافعانہ جنگ کے لیے پنجاب اور سرحد مسلمانوں کے اہم تعین مورچے تھے لیکن یہاں بھی سکھوں کے گوردوارے اسلحہ سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندوؤں کے مندروں اور اسکولوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی فوجیں تیار ہو رہی تھیں لیکن شاہ پور کا وہ سیاست دان جس نے اپنی قوم کی بقا اور آزادی کے عوض وزارت کا سودا کیا تھا، خاموش تھا۔ پنجاب کا مورچہ مضبوط بنانے کے لیے ہندو اور سکھ صوبہ سرحد سے اسلحہ بھیج رہے تھے لیکن عدم تشدد کے دیوتا کے سرحدی چیلے اس صورت حالات سے قطعاً پریشان نہ تھے۔

ہندوستان کے سیاسی اکھاڑے میں کانگرس کی جدوجہد بظاہر آئینی تھی لیکن در پردہ وہ اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیاریاں کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اس صورت حالات سے بے خبر نہ تھا لیکن پنجاب اور سرحد میں ان کے دفاعی مورچوں پر چند افراد کی ملت فروشی، یا کوتاہ اندیشی کے باعث دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔

برطانیہ کا وزارتی مشن اپنی تجاویز لے کر آیا ان تجاویز میں نہ وہ اکھنڈ ہندوستان تھا جو کانگرس چاہتی تھی اور نہ وہ پاکستان تھا جس کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا۔

گروپ بندی کی صورت میں مسلمانوں کے تحفظ کے تھوڑے بہت امکانات دیکھ کر مسلم لیگ اپنے اصل مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوگئی لیکن کانگرس کو مرکز کے اختیارات کا محدود ہو جانا گوارا نہ تھا۔ اس کے فسطائی مقاصد کی تکمیل کے لیے مرکز میں ہندو اکثریت کے اختیارات کا لا محدود ہونا ضروری تھا۔ گروپ بندی میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو جو معمولی خود اختیاری ملتی تھی، اس میں کانگرس کے سیاسی مہاتما کو اپنی ماہ سبھائی خوردبین کی بدولت پاکستان کے خطرناک جراثیم نظر آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس تجویز کے بانیوں کو اپنے مخصوص انداز میں یہ سمجھا رہے تھے کہ تمہارا مطلب یقیناً وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو عبوری دور کی حکومت کے لیے بھی کانگرس مسلم لیگ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مانگتی تھی چنانچہ مرکزی کابینہ کی تشکیل کے لیے وائسرائے نے پانچ کانگرس پانچ مسلم لیگ اور دو اقلیتوں کی نسبت کو چھ، پانچ اور دو کی نسبت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد کانگرس لمبے عرصہ کے لیے وزارتی مشن کی تجویز کی لنڈنی زبان کا واردھائی ترجمہ نافذ کرنے پر مصر تھی اور جب تجاویز کے بانیوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا مطلب وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے تو گاندھی کی آتما کو دکھ ہوا تجاویز رد کر دی گئیں۔

وائسرائے لارڈ ویول یہ اعلان کر چکا تھا کہ اگر کوئی پارٹی رضامند نہ ہوئی تو بھی اس کے تعاون کے بغیر عبوری دور کے لیے مرکزی کابینہ کی تشکیل کی جائے گی۔۔۔۔۔ اعلان کے مطابق اب لیگ کو کابینہ کی تشکیل کا موقع ملنا چاہیے تھا، لیکن مسلم لیگ کو جلد یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے انگریز کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں

دھوکا[1] کھایا ہے۔

[1] اس نئی صورت حالات میں سر کرپس نے یہ کہہ کر کانگرس کی مشکل حل کر دی کہ کانگرس نے لمبے عرصے کی تجاویز مان لی ہیں، اس لیے عبوری دور کی حکومت کی تشکیل کی پیشکش واپس لی جاتی ہے۔

دراصل ہندو اور انگریز کے اس تمام ہیر پھیر کا مقصد پاکستان کی چٹان سے مسلم لیگ کے پاؤں متزلزل کرنا تھا اب مسلم لیگ ہوا کا رخ دیکھ چکی تھی اور چند قدم ڈگمگانے کے بعد اس کا رخ پھر اپنی اصلی منزل مقصود یعنی پاکستان کی طرف ہو چکا تھا۔

مسلمان کے میدان سے نکلتے ہی انگریز اور ہندو نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور لارڈ ویول عبوری دور کے لیے کانگرس کو تشکیل وزارت کی دعوت دینے کا تہیہ کر چکے تھے۔ مسلم لیگ کا آخری حربہ ڈائرکٹ ایکشن تھا جو انگریز کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف احتجاج تھا لیکن ہندو اپنے آپ کو انگریز کا جانشین سمجھ کر میدان میں آ چکا تھا۔ بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندو نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی اس کے بعد کلکتہ کی باری آئی اور یہاں ڈائرکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر اینٹوں گولیوں اور ردتی بموں کی بارش کی گئی۔ ان حالات میں وائسرائے نے آگ پر مزید تیل چھڑکنا ضروری سمجھا اور مرکزی میں کانگرس کی وزارت بنا دی۔۔۔۔

وہ ہندو جس نے اقتدار حاصل ہو جانے کی امید پر اتنا کچھ کیا تھا، اب طاقت کے

نشے میں چور ہو چکا تھا پنڈت نہرو کے وزارت عظمیٰ کا قلم دان سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میری وزارت مخالفین کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کر دے گی پٹیل نے بمبئی میں تقریر کی اور وہاں فساد کی سلگتی ہوئی آگ کے شعلے زیادہ تیز ہو گئے۔

ابھی تک مسلم اکثریت کے کسی شہر یا علاقے میں فساد نہیں ہوا تھا لیکن ہندوؤں نے کلکتہ میں جو آگ لگائی تھی، اس کے چند شعلے نواکھالی جا پہنچے۔ یہ مسلم اکثرت کا علاقہ تھا اور کلکتہ کے کچھ پناہ گزین ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی لرزہ خیز داستانیں سنانے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے چنانچہ فساد شروع ہو گیا۔ مسلم لیگی وزارت کا عہدہ دار اور لیڈر صورت حالات پر قابو پانے کے لیے فوراً وہاں پہنچے ـــــ صلح اور امن کے لیے اپیلیں کی گئیں اور صورت حالات پر قابو پا لیا گیا۔ مسلم پریس کی اطلاعات کے مطابق قتل ہونے والے ہندوؤں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی اور بعض لیڈر اسے چھ 1 سے تک شمار کرتے تھے اس کے برعکس صرف کلکتہ میں تین ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے لیکن ہندو اور مسلمان کے قتل میں بہت فرق تھا۔ مہاتما گاندھی کی وہ آتما جس نے انتہائی صبر و سکون سے بمبئی، الہ آباد، احمد آباد، کانپور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا، بے چین ہو گئی۔ ہندو پریس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مہاتما گاندھی دہلی کی بھنگی کالونی سے مسلمانوں کی سفاکی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوا اٹھا اور نواکھالی پہنچ گیا اور وہاں سے یہ خبریں آتی تھیں کہ آج مہاتما گاندھی نے اتنے میل پیدل سفر کیا

ہے۔آج مہاتماجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور ہندوستان کے طول وعرض میں مہاتماجی کے چیلے ان کے آنسو پونچھنے کی تیاریاں کر رہے تھے بالآخر وہ آتشیں مادہ پھوٹ نکلا جو بھارت ماتا کے سینے میں مدت سے پک رہا تھا عدم تشدد کے دیوتا کے پجاری بہار کے مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے ہندو فسطائیت، وحشت، بربریت اور سفاکی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی۔

---

1 یہاں تعداد گھٹا کر دکھانا مقصود نہیں مسلم اکثریت کے علاقے میں ہندوؤں کا تھوڑا یا بہت قتل بہ ہر حال افسوس ناک بات تھی۔ اگر اس میں لیگی وزارت یا کسی اور ذمہ دار سیاسی پارٹی کا ہاتھ ہوتا تو یہ بات اور بھی شرم ناک ہوتی لیکن موقع پر پہنچنے والے بنگالی ہندوؤں کے اپنے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں اور وزارت نے اس فساد کو دبانے کی کوشش کی بلکہ مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ہندوؤں کو پناہ دی۔ ایسے حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہو گا، کہ یہ مقامی مسلمانوں کی سازش نہ تھی بلکہ ایسا حادثہ تھا جس کے اسباب بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں سے فراہم ہو چکے تھے۔

گھر میں مجید کی شادی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ لائل پور سے اس کی بہن امینہ اپنے شوہر کے ساتھ دوپہر کی گاڑی سے آنے والی تھی سلیم اور مجید انہیں لینے کے لیے

اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے گاڑی آئی امینہ کا خاوند انٹر کلاس کے ڈبے سے اترا ساتھ والے زنانہ ڈبہ کی کھڑکی سے امینہ نے اپنے برقعے کا نقاب اٹھا کر باہر جھانکا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اس کی گود سے آٹھ دس ماہ کا بچہ لے لیا امینہ نے ماں بننے کے بعد پہلی بار سلیم کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔ وہ لجاتی، شرماتی اور سمٹتی ہوئی گاڑی سے اتری۔ نوکر سامان اتار چکا تھا اور مجید اپنے بہنوئی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ سلیم نے پلیٹ فارم پر شیشم کے درخت کے نیچے لکڑی کے بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''امینہ وہاں بیٹھ جاؤ! ذرا بھیڑ کم ہو جائے تو چلتے ہیں۔ امینہ کا خاوند اور مجید بھی وہاں آ گئے مجید نے نوکر سے کہا تم جا کر ٹانگے میں سامان رکھو ہم ابھی آتے ہیں'' نوکر چلا گیا۔ امینہ کے خاوند نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''سلیم صاحب! آپ کی بہن آپ سے بہت ناراض ہے۔''

سلیم نے امینہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا ''کیوں ری چڑیل! مجھ سے خفا ہو؟''

امینہ نے برقعہ کا نقاب اٹھا کر چہرے پر مصنوعی غصہ لاتے ہوئے کہا ''بھائی جان! میں آپ سے بات نہیں کروں گی''

''ارے ارے! اتنا غصہ ٹھیک نہیں بھئی مجید! ہماری صلح کرا دو!''

امینہ نے اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر جھجکتے ہوئے کہا ''بھائی جان! آپ تو بھلا فوج میں تھے، اس لیے نہ آ سکے لیکن ان سے پوچھیے، یہ لاہور سے لائل پور نہیں پہنچ سکتے تھے؟ پہلے تو یہ امتحانوں کا بہانہ کرتے تھے لیکن اب کون سی مصروفیت تھی؟''

امینہ کے خاوند نے کہا ”ہاں جی پہلے انہوں نے مجھے لکھا کہ ایم اے کا امتحان دینے کے بعد ضرور آؤں گا اس کے بعد لکھا کہ کتاب لکھ رہا ہوں اسے ختم کرنے کے بعد آؤں گا کتاب چھپ کر ہمارے پاس پہنچ گئی لیکن یہ نہ آئے ۔۔۔۔۔۔امینہ کہتی تھی کہ انہیں شکار کا شوق ہے اور میں ہر روز ان کے لیے بندوقیں صاف کیا کرتا تھا۔“

سلیم نے کہا ”بھئی میں ابا جان کے پاس سیالکوٹ چلا گیا تھا وہاں سے انہوں نے کشمیر جانے کی اجازت دے دی۔ اب میں بالکل فارغ ہوں کسی دن ضرور آؤں گا اور جب تک میری بہن تنگ نہیں آجائے گی، وہیں رہوں گا۔“

ریلوے پلیٹ فارم سے مسافر خانے کی طرف کھلنے والے گیٹ پر ریلوے بابو کسی مسافر سے جھگڑ رہا تھا اور چند لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ مجید، سلیم کو امینہ اور اس کے خاوند کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر اس طرف چلا گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اس نے ہنستے ہوئے مڑ کر دیکھا اور سلیم کو ہاتھ سے اشارہ کیا سلیم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا ”کیا ہے یہاں؟“ اس نے سوال کیا۔

مجید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا ”ارے ادھر دیکھو! چودھری رمضان بابو کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔“

سلیم نے چودھری رمضان کو بابو کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجید نے اسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا ”ارے ٹھہرو ذرا باتیں سننے دو“

بابو کہہ رہا تھا ''تم کو ساڑھے تین روپے دینے پڑیں گے میرے ساتھ زیادہ باتیں مت کرو۔''

چودھری رمضان نے جواب دیا ''واہ جی اگر تمہیں تین روپے دینے تھے تو میں ٹکٹ کیوں لیتا؟''

''ارے میں ٹکٹ کی بات نہیں کرتا تمہارے سامان کا وزن زیادہ ہے، میں اس کا کرایہ مانگتا ہوں۔''

رمضان نے جواب دیا ''خدا کی قسم! یہ تمام ہانڈیاں دوسروں کی ہیں میں نے اپنے گھر کے لیے صرف ایک خریدی تھی۔''

''مجھے اس سے کیا واسطہ کیا تم نے اپنے لیے ایک ہانڈی خیردی ہے، یا سب خریدی ہیں۔ یہ پوری تمہاری ہے اور اس میں جتنا سامان ہے، میں اس کا کرایہ تم سے وصول کروں گا۔''

''دیکھو بابو جی! میں نے ایک بار آپ سے کہا ہے کہ میں پسرور کے قریب اپنے رشتہ داروں کو ملنے گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ پسرور کی ہانڈیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے ضرور لیتے آنا۔ نجی، سنتی، ہرنام کور، بھاگو، تیلن، رحمت بی بی، ریشمے جولاہی اور پڑوس کی کئی عورتیں میرے گرد ہو گئیں۔ وہ مجھے پیسے دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے سوچا، گاؤں کی مائیں بہنیں ہیں اگر ایک دو روپے خرچ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں بابو جی! میں نے کوئی برا کام نہیں کیا آپ خود سوچیں، اگر آپ میرے گاؤں کے رہنے والے ہوں اور آپ کی ماں مجھے یہ کہے کہ چودھری رمضان!

میرے لیے پسرور سے ایک ہانڈی لے آنا، تو مجھے انکار کرتے شرم نہ آئے گی؟''

''بس چپ رہو'' بابو نے گرج کر کہا'' کرایہ نکالو!''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ ہانڈیوں کا کرایہ ان کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے؟''

''بس آج تمہیں معلوم ہوگیا نا آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کروگے''

''بابو جی! اگر تمہیں خدا نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی توفیق نہیں دی تو دوسروں کو کیوں منع کرتے ہو؟''

''مذاق مت کرو میں ڈیوٹی پر کھڑا ہوں''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ڈیوٹی کے اوپر کھڑے ہو، ورنہ میں نہ لاتا یہ ہانڈیاں''

لوگ ہنس رہے تھے اور بابو کا پارہ چڑھ رہا تھا وہ چلایا'' زبان بند کرو اور پیسے نکالو''

رمضان نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا'' بابو جی! تم خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہو اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو ہانڈیوں کی بوری یہاں رکھ لو، گاؤں کی عورتیں خود لینے کے لیے آجائیں گی ان سے دو دو آنے لے لینا۔ تمہاری رقم پوری ہو جائے گی۔۔۔۔ ورنہ میرا ٹکٹ مجھے واپس دے دو۔ میں یہ ہانڈیاں پسرور چھوڑ آتا ہوں۔''

''تم کسی جنگل سے تو نہیں آئے؟''

''بابو جی! پسرور شہر ہے جنگل نہیں''

عمر رسیدہ اسٹیشن ماسٹر یہ تماشا دیکھ کر آگے بڑھا اور اس نے نرمی سے رمضان کو محکمہ ریلوے کے قواعد وضوابط سمجھانے کی کوشش کی۔

چودھری رمضان نے فریاد کے لہجے میں کہا ''بابو خدا کی قسم! گاڑی میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں سارا راستہ یہ بوری اپنی گود میں رکھ کر لایا ہوں۔ ہانڈیوں کی قیمت میں نے دی، ٹکٹ کے پیسے میں نے دیے۔ تکلیف میں نے اٹھائی، اب آپ ہی بتائیے اگر ساڑھے تین روپے اس بابو کو دے دوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''فائدہ یہ ہوگا کہ تم جیل نہیں جاؤ گے اور تمہاری عزت بچ جائے گی۔''

چودھری رمضان کچھ سوچ کر بولا ''بابو جی میں نے کوئی چوری کی ہے جو جیل جاؤں گا؟ یہ لو ساڑھے تین روپے اور ایسی تیسی ان ہانڈیوں کی'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے تین روپے گن کر بابو کو دے دیے پھر جھک کر بوری کھولی اور ایک ہانڈی نکال کر فرش پر مارتے ہوئے بولا ''یہ مائی فجی کی''

پھر اس نے دوسری اٹھا کر پھینکی اور کہا ''یہ سنتی کی'' اسی طرح اس نے یکے بعد دیگرے باقی ہانڈیاں توڑتے ہوئے کہا ''یہ ہرنام کور کی، یہ بھاگو تیلن کی، یہ رحمت بی بی کی، یہ ریشمے جولاہی کی، یہ جلال کی ماں کی!''

جوں جوں ہانڈیاں کم ہو رہی تھیں اس کا جوش اور غصہ زیادہ ہو رہا تھا۔ سلیم، مجید اور دوسرے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان نے آخری ہانڈی اٹھائی تو اسے بروقت کسی کا نام یاد نہ آیا اس نے بابو کی طرف غضب ناک ہو کر دیکھا اور یہ ''بابو کی ماں کی'' کہتے ہوئے زمین پر دے ماری۔

بابو نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

بابو سلیم کو جانتا تھا، وہ بولا ''دیکھو جی! یہ گالیاں دیتا ہے۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔''

''رمضان بولا'' بابو جی! میں نے تم کو کونسی گالی دی ہے گالیاں تو ان کی سننے والی ہوں گی جن کی یہ ہانڈیاں تھیں مجھے افسوس ہے کہ آج شام بھاگو تیلن کی آواز تمہارے کانوں میں نہیں پہنچے گی ورنہ تم میری باتوں کو گالیاں نہ کہتے۔

سلیم نے اسٹیشن ماسٹر کو ایک طرف لے جا کر کہا ''وہ غریب آدمی ہے لیکن اگر میں اسے پیسے دوں تو وہ نہیں لے گا وہ میرے گاؤں کا ہے۔ آپ اپنی طرف سے اسے یہ پیسے دے دیں'' سلیم نے پانچ روپے کا نوٹ اسٹیشن ماسٹر کو دے دیا۔

چودھری رمضان اب ازسر نو لوگوں کو اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کے قریب آکر کہا ''بھئی چودھری! ناراض ہو کر نہ جاؤ، یہ لو پانچ روپے میں دیتا ہوں لیکن اب دوبارہ پسرور سے ہانڈیوں کی بوری لاؤ تو بک کروا لینا۔''

''نہیں جی اپنے پیسے پاس رکھو، میں باز آیا ایسی نیکی سے۔''

''نہیں بھائی لے لو! ہم تمہیں جرمانہ اور ہانڈیوں کی قیمت واپس کرتے ہیں۔''

چودھری رمضان نے مجید اور سلیم کی طرف دیکھا اور ان کے اشارے سے نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اس کے بعد خالی بوری اپنے کندھے پر رکھ لی۔

مجید نے کہا ''چودھری! چلو ہمارے ساتھ تانگے پر چلو''

جب وہ تانگے پر سوار ہوئے تو رمضان کہہ رہا تھا "بھئی! دنیا میں شرافت کی کوئی قدر نہیں وہ بابو جس کا نیولے کی طرح منہ ہے مجھے کہہ رہا تھا کہ میں یہاں ڈپٹی کے اوپر کھڑا ہوں جب تمہیں اور صوبے دار کو دیکھا تو بڑے بابو نے چپکے سے پانچ روپے نکال کر دے دیے۔"

☆☆☆☆☆

مجید کی برات واپس آ چکی تھی گھر میں عورتیں دلہن کے گرد جمع تھیں مجید کی ماں، دادی اور چچیوں کو مبارک باد دی جا رہی تھی ایک معمر عورت نے مجید کی دادی سے پوچھا "تحصیلدار کی ماں! سلیم کی شادی کب کرو گی؟"

"بہن! اگر میرے بس میں ہو تو آج ہی کر دوں لیکن علی اکبر کہتا ہے کہ اگر اسے کوئی ملازمت نہ ملی تو وکالت کے لیے تین سال اور پڑھنا پڑے گا اس لیے شادی ایک بوجھ ہو گا۔"

"ہے ہے! ساری عمر پڑھتا ہی رہے گا اس کے ساتھی تین تین بچوں کے باپ ہو گئے ــــــــ اور وہ تین سال اور پڑھے گا کہیں رشتہ تلاش کیا ہے؟"

"بہن! بہت رشتے آتے ہیں لیکن سلیم کی ماں کو ایک لڑکی پسند آ گئی ہے اور وہ کسی اور کا نام نہیں لینے دیتی دو سال ہوئے، اس کی ماں بھی آ کر کہہ گئی تھی کہ لڑکے کی منگنی کہیں نہ کرنا۔ کل علی اکبر کو ان کی طرف سے خط آیا تھا شاید اگلے مہینے وہ خود آئیں۔"

باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کا ہجوم تھا اور قریباً اسی قسم کے سوالات سلیم کے باپ اور دادا سے پوچھے جا رہے تھے۔ سلیم گھر سے کوئی چیز لینے آیا تو اس کی بہن زبیدہ نے اسے دیکھتے ہی دوسری لڑکیوں کو آواز دی ''امینہ، صغریٰ، حلیمہ، عائشہ بھائی جان آ گئے'' اور آن کی آن میں سلیم کی چچا زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد، اور ماموں زاد بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ امینہ نے ابتدا کی ''بھائی جان! بھابی کب لاؤ گے؟''

''کون سی بھابی؟ چڑیل چپ رہو، نہیں تو مار کھاؤ گی''

امینہ نے ہنس کر کہا ''دیکھو بھائی جان! مجھے مار لو لیکن بھابی ضرور لاؤ''

لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا سلیم انہیں اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا باہر نکلا۔ صحن میں اس کی ماں نے کہا ''سلیم مجھے یاد نہیں رہا، تمہارے دو خط آئے ہوئے ہیں، میں نے تمہاری میز کی دراز میں رکھ دیے تھے۔''

سلیم نے جلدی سے اندر جا کر میز کی دراز سے خط نکالے۔ ایک مختصر سا خط اختر کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں رضا کاروں کی جماعت کے ساتھ بہار جا رہا ہوں اگر تم جانا چاہو تو دو چار دن میں لاہور پہنچ جاؤ۔

دوسرا خط ناصر کی طرف سے تھا اور یہ کسی قدر طویل تھا سلیم نے جلدی سے آخری صفحہ الٹ کر لکھنے والے کا نام دیکھا اور اسے اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی نیت سے باہر نکل آیا باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کی محفل گرم تھی، اس لیے وہ بیٹھک میں چلا گیا۔ ناصر علی کے خط کا مضمون یہ تھا:

میرے پاکستانی بھائی!

میں یہ خط کلکتہ کے ایک ہسپتال سے لکھ رہا ہوں بہار میں آگ اور خون کے طوفان سے گزرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ بیان نہیں کرسکتا۔ اگر بیان کر بھی سکوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا تمہیں یہ کیسے یقین آئے گا کہ دو ہزار انسانوں کی ایک بستی جہاں ایک صبح زندگی کی مسکراہٹیں بیدار ہو رہی تھیں، شام تک راکھ کا ایک انبار بن چکی تھی جہاں سورج کی ابتدائی کرنوں نے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسانوں کو دیکھا تھا، وہاں آفتاب کی واپسیں نگاہیں بے گور وکفن لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ سلیم! یہ میرا گاؤں تھا اور یہ صوبہ بہار کی ان سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھا جہاں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے اہنسا اور شانتی کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضا کاٹ کر ہماری مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے گئے۔ بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کی عصمت اور عفت کی دھجیاں اڑائی گئیں اور باپ اور بھائیوں کو بنوک سنگین مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ذلت اور رسوائی کا تماشا دیکھیں۔

تم شاید ہمیں بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دو لیکن یقین کرو کہ یہ وہ طوفان ہے جس کے لیے ہم قطعاً تیار نہ تھے کانگرسی حکومت ہم پر

بھیڑیے چھوڑنے سے پہلے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ چکی تھی۔ وہ پولیس جو ہمارے گھروں کی تلاشیاں لے کر چھوٹے چاقو تک ضبط کر چکی تھی، ہندوؤں کو بندوقوں اور پستولوں سے مسلح کر چکی تھی۔ حکومت ان کی تھی قانون ان کا تھا۔ پولیس ان کی تھی اسلحہ اور بارود ان کا تھا۔۔۔۔ہم کب تک لڑتے اور کہاں تک مقابلہ کرتے؟ وہ خالی ہاتھ جو مدافعت کے لیے اٹھے، کٹ کر رہ گئے، وہ سینے جن میں غیرت اور ایمان تھا گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ میرے گاؤں کے پانچ سو نوجوانوں نے لاٹھیوں کے ساتھ چار گھنٹے ان بلوائیوں کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ان سے آٹھ دس گنا زیادہ تھے جن میں سے بعض بندوقوں اور پستولوں اور باقی تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے اور ہم نے انہیں بھگا دیا۔۔۔۔وہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ آئے تو ان کی تعداد دس ہزار تھی اور پولیس کی سنگینیں ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ انہیں فتح ہوئی لیکن کیا یہ ہماری شکست تھی؟۔۔۔اگر گولیوں کی بارش میں پانچ سو نوجوان دس ہزار حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں اور ان کے بعد بچوں اور بوڑھوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور بستی کو آگ لگا دی جائے تو کیا اسے مدافعت کرنے والوں کی شکست کہا جائے گا؟ اور پھر اگر کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور بربریت کے ہاتھوں

میں اس کی نوجوان بیٹیاں تڑپنے، چیخنے اور چلانے کے بعد ختم ہو جائیں اور پھر ان کی لاشوں کے ساتھ بھی۔۔۔۔۔سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا میں حیران ہوں کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں سورج اب تک کیوں طلوع ہوتا ہے۔ستارے اب تک کیوں چمکتے ہیں؟

یہ خط میں نے تمہیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم میرے خاندان اور میرے گاؤں کی تباہی پر اظہار افسوس کرو۔ بہار میں ایک خاندان یا ایک بستی تباہ نہیں ہوئی، اب تک قریباً ساٹھ ہزار انسان مارے جا چکے ہیں اور چار لاکھ بے خانماں ہو چکے ہیں لیکن اس قدر تباہی اور بربادی کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی ہندو فاشزم اپنی تمام تخریبی قوتوں کے ساتھ میدان میں نہیں آیا۔ بہار میں ابھی چھوٹے پیمانے پر ایک تجربہ کیا گیا ہے، ابھی تک وہ خنجر جو عدم تشدد کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں، پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے ہندو آتشیں پہاڑ سے صرف چند چنگاریاں نکلی ہیں اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں بالخصوص اکثریت کے صوبوں کے مسلمان جن کی قوت مدافعت کے ساتھ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی زندگی اور بقا کی امیدیں وابستہ کر چکے ہیں اگر ہمارے لیے نہیں تو کم از کم اپنی بقا کی جنگ کے لیے ہی پنجاب کے

مسلمانوں کو تیار کرو۔۔۔۔اگر بہار کے واقعات کے بعد بھی آپ لوگوں کی آنکھ نہ کھلی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔

ہمارے لیڈروں کی یہ حالت ہے کہ وہ ابھی تک قوم کے ہر درد کے علاج کے لیے اپنا تازہ بیان کافی سمجھتے ہیں وہ دنیا کو یہ بتا دینا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہندو کیا کر رہا ہے۔اس نے اتنے گھر جلا ڈالے، اتنے آدمیوں کو مار ڈالا۔۔۔۔دفاعی کمیٹی بنی اس کے بعد مجلس عمل بنی، لیکن ان کی تمام سرگرمیاں بیان بازی تک محدود ہیں خدا کے لیے قوم کے نوجوانوں کو بیدار کرو۔پانی اب سر کے برابر آچکا ہے۔

میرے زخم ٹھیک ہو چکے ہیں اور پانچ چھ روز تک میں رضا کاروں کے ایک وفد کے ساتھ بہار جا رہا ہوں

تمہارا مخلص

ناصر علی

خط پڑھنے کے بعد سلیم بے حس وحرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔بیٹھک سے باہر اسے مردوں اور عورتوں کے قہقہے ناخوش گوار محسوس ہو رہے تھے۔یوسف ہانپتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا ''بھائی جان! میں آپ کو کتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، آپ کے دوست آئے ہیں۔''

''کون؟''سلیم نے سوال کیا

’’مہندر سنگھ‘‘

’’اچھا! انہیں یہاں لے آؤ!‘‘

یوسف بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر میں مہندر سنگھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ سلیم نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب کرسی پر بٹھالیا۔مہندر سنگھ نے کہا’’میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں کل بلونت سنگھ کو آنا تھا اس لیے میں مجید کی برات میں شریک نہ ہوسکا۔‘‘

’’آ گیا وہ؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘

’’اسے یہاں کیوں نہیں لائے۔اس سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے!‘‘

’’وہ آج صبح اپنی سسرال چلا گیا تھا۔کل یا پرسوں وہ آپ کے پاس آئے گا۔‘‘

’’ابھی تک وہ کشمیر کی فوج میں ہے نا؟‘‘

’’جی ہاں! اب تو وہ کہتا ہے کہ میں بہت جلد کیپٹن بننے والا ہوں۔‘‘

سلیم نے سوچ کر کہا’’مہندر چائے پیو گے؟‘‘

’’نہیں چائے تو میں پی کر آیا ہوں۔میں آپ کو یہ کہنے آیا تھا کہ پرسوں اگر آپ کو فرصت ہو تو شکار کو چلیں۔‘‘

’’پرسوں تک شاید میں یہاں نہیں رہوں گا۔‘‘

’’کہاں جارہے ہیں آپ؟‘‘

’’میں بہت دور جارہا ہوں!‘‘

’’آپ کچھ پریشان ہیں؟‘‘

سلیم نے کچھ دیر پریشان رہنے کے بعد کہا ’’مہندر! الیکشن کے دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک طالب علم یہاں آیا ہوا تھا میں نے اس کے ساتھ تمہاری ملاقات بھی کرائی تھی۔‘‘

’’ہاں! مجھے ابھی تک وہ غزل یاد ہے جو اس نے یہاں سنائی تھی۔ بہت اچھی آواز تھی اس کی۔‘‘

’’وہ بہار کا رہنے والا تھا۔‘‘

مہندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا ’’اس کے متعلق کوئی بری خبر آئی ہے؟‘‘

’’اس کا خط آیا ہے‘‘

’’بہار کے متعلق بڑی افسوسناک خبریں آرہی ہیں کیا لکھتا ہے وہ؟‘‘

’’یہ اس کا خط ہے۔۔۔۔۔‘‘ سلیم نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ’’تم اسے پڑھ سکتے ہو‘‘

خط پڑھنے کے بعد مہندر کچھ دیر سلیم کی طرف دیکھتا رہا بالآخر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا ’’تو آپ بہار جارہے ہیں؟‘‘

’’ہاں!‘‘

''کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔۔۔۔کاش مجھ جیسے ایک آدمی کی قربانی تباہی و ہلاکت کے اس طوفان کو روک سکتی۔۔۔میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ طوفان کسی دن یہاں بھی آئے گا۔۔۔ہندو فاشزم انسانیت کو ختم کرنے کے لیے جو چتا تیار کر رہا ہے، پنجاب میں میری قوم اس کا ایندھن بنے گی۔۔۔۔بھائی سلیم! اس آگ کو یہاں آنے سے روکیے۔۔۔۔ورنہ پانچ دریا کسی دن سرخ ہو جائیں گے۔۔۔۔لیکن نہیں آپ اسے نہیں روک سکتے۔۔۔۔اسے کوئی نہیں روک سکتا۔میری قوم ان فاشسٹوں کو اپنے گوردوارے استعمال کرنے کی اجازت دے چکی ہے۔سکھ مسلمانوں کا گھر جلانے کے شوق میں اپنے گھر بھی جلا ڈالیں گے اور ہندو آگ اور تیل مہیا کرنے کے بعد مزے سے تماشا دیکھے گا۔۔۔۔''

سلیم نے کہا ''مہندر! جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں، میں پنجاب کا مستقبل اس قدر ہولناک نہیں سمجھتا۔''

اس وقت مجھ جیسے لوگوں کی آواز نہیں سنے گا۔اس وقت ایسی آواز نکالنے والے آدمی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

آگ پھیلتی گئی۔بمبئی اور بہار میں انسانیت کا دامن نوچنے والے ہاتھ یوپی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ہندو اکثریت کے صوبوں میں غنڈوں اور بلوائیوں کی جو افواج منظم ہو رہی تھیں، انہیں کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی

لیکن پنجاب اور سرحد کی وزارتوں نے مسلمان کے بازوئے شمشیر زن کو اپنی مصلحتوں کی بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔

پنجاب کے ملت فروش نے اپنے ہندو سرپرستوں کو اور زیادہ مطمئن کرنے کے لیے مسلم لیگ کے رضا کاروں کی جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا بظاہر یہ حکم پنجاب کو پرامن رکھنے کے لیے دیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی قوت مدافعت کچل کر بھارت کے بھیڑیوں کے لیے میدان صاف کیا جائے۔ اس اقدام کو غیر جانب دارانہ رنگ دینے کے لیے مہاسبھا کے سیوا دل وغیرہ پر بھی پابندیاں عاید کر دی گئیں لیکن کانگرس کے رضا کاروں کو پوری آزادی تھی دوسرے الفاظ میں مہاسبھائی رضا کاروں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے فقط اپنے سائن بورڈ بدل دینے کی ضرورت تھی اس حکم کا عملی نفاذ فقط مسلمانوں تک محدود تھا۔

پنجاب کے مسلمان اس وزارت کا تختہ الٹنے پر مجبور ہو گئے جس نے ان کی اکثریت کے صوبہ میں بھی ان پر اقلیت کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں شروع ہوئیں۔ چند لیڈر گرفتار ہوئے دوسروں نے نیک نامی میں حصہ دار بننے کے لیے ان کی تقلید کی۔ چنانچہ چند دن میں ملت کے وہ اکابر جو معمولی غصے کی حالت میں قدرے نرم اور زیادہ غصے کی حالت میں قدرے گرم بیان دے کر ملت کے تمام دکھوں کا علاج کر دیا کرتے تھے، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سرپٹ دوڑتے ہوئے جیلوں میں جا پہنچے۔ ان میں سے کئی بزرگ ایسے تھے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر وہ ایک دن لیٹ جیل پہنچے تو شاید لیڈروں کی پچھلی صف میں دھکیل

دیے جائیں۔

بظاہر یہ تحریک عمر رسیدہ لیڈروں کی رہنمائی سے محروم ہو چکی تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ قیادت متوسط درجہ کے باعمل نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور یہ تحریک عوامی تحریک بن گئی۔قوم خضر حیات خاں اوران کے سر پرستوں کا چیلنج قبول کر چکی تھی۔ قوم کے فرزند،قوم کی بیٹیاں اورقوم کی مائیں میدان میں آ چکی تھیں۔ باہمت مسلم نوجوان ملت فروشوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر چکے تھے جیلیں بھر چکی تھیں، پولیس کی لاٹھیاں ٹوٹ چکی تھیں اشک آور گیس کے بم ناکارہ ہو چکے تھے مسلم اخبارات بند تھے لیکن پنجاب میں کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں پولیس کی تمام کوششوں کے باوجود خفیہ تحریک کی طرف سے ہدایات نہیں پہنچتی تھیں خضر اور سچر کے قانون کے مطابق ایک جگہ چار مسلمانوں کا جمع ہونا جرم تھا لیکن کوئی قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں ہزاروں انسانوں کا جلوس نہیں نکلتا تھا پنجاب کا ملت فروش یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی قوم کو مردہ سمجھ کر ہندو کے ساتھ اس کی عزت اور آزادی کا سودا کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔

یہی حال صوبہ سرحد کا تھا۔۔۔۔۔۔کانگرس نے درہ خیبر پر رام راج کا جھنڈا گاڑنے کی نیت سے جس شتر بے مہار پر سواری کی تھی، وہ دلدل میں پھنس چکا تھا۔۔۔پٹھان کی نگاہوں میں چرخے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

گورداسپور کی طرف سے آنے والی ایک لاری امرتسر کے اڈے پر آ کر رکی۔ سلیم اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان جلدی سے اتر کر پاس ہی ایک دکان سے لسی پی رہے تھے کہ کسی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''چودھری جی! السلام علیکم''

سلیم نے مڑ کر اس کے سلام کا جواب دیا لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا۔ ''آج کدھر چڑھائی کی ہے؟''

سلیم اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ اس نے جواب دیا ''میں لاہور جا رہا ہوں۔''

''اور میاں محمد صدیق بھی لاہور جا رہے ہیں؟'' اس نے سلیم کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جی میں سیالکوٹ جا رہا ہوں'' سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔

''بتائیے! میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟''

سلیم کے ساتھی نے جواب دیا ''نہیں آپ کی بڑی مہربانی''

پاس ہی سڑک کے دوسرے کنارے امرتسر سے لاہور جانے والی بس کا کلینر پکار رہا تھا ''چلو بھئی لاہور ۔۔۔۔۔ موٹر تیار ہے'' اور سلیم اور صدیق اس آدمی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد موٹر پر سوار ہو گئے۔

جب موٹر چل پڑی تو سلیم نے اپنے ساتھی سے پوچھا ''صدیق! یہ کون تھا۔۔۔۔۔؟''

''یہ کریم بخش حوالدار ہے آپ بھول گئے الیکشن کے دنوں میں اس نے آپ سے تھوڑا سا جھگڑا کیا تھا۔''

''ارے یار! میں پہچان نہیں سکا۔ اصل میں یہ وردی کے بغیر تھا۔''

صدیق نے کہا ''یہ تبدیل ہو کر امرتسر آ گیا ہے میرے خیال میں اب یہ سی، آئی، ڈی میں ہے۔''

''بھئی! یوں بھی تو خضر کی پولیس آج کل سفید کپڑوں میں ڈیوٹی دینا زیادہ آسان سمجھتی ہے۔ وہ ہمیں بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔''

لاہور پہنچ کر سلیم نے صدیق سے کہا ''تم یہیں اڈے پر رہو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد سلیم شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا ایک مسجد کے ساتھ پان فروش کی دکان پر رکا۔ اس نے دکاندار کو غور سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ ''کیوں جی نرگس کے پھول کہاں ملیں گے؟''

دکاندار نے سر سے لے کر پاؤں تک چند بار اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بولا'' میرے ساتھ آئیے!''

سلیم اس کے پیچھے چل دیا۔ دکاندار گلی کے موڑ پر ایک مکان کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے واپس چلا گیا۔ سلیم نے تھوڑے وقفے کے بعد پانچ مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے اندر سے آواز دی۔ ''کون ہے؟''

سلیم نے کہا ''مکان نمبر اکیس یہی ہے؟''

ایک نوجوان نے دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا اور سلیم سے پھر سوال کیا ’’آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’اختر صاحب یہاں ہیں؟‘‘

’’نہیں! وہ کہیں جا چکے ہیں آپ کا نام سلیم ہے؟‘‘

’’جی ہاں! مجھے دس بجے سے پہلے یہاں پہنچنا تھا لیکن موٹر نہ مل سکی۔‘‘

’’آپ اندر آ جائیے!‘‘

سلیم اندر داخل ہوا تو نوجوان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ’’آپ کی چیز ہمارے پاس موجود ہے، آئیے!‘

سلیم اس کے پیچھے ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک کونے میں پانچ لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے سلیم نے اپنی جیب سے چند کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا ’’میں پمفلٹ کے لیے یہ مضمون لکھ کر لایا ہوں۔ اختر صاحب کب واپس آئیں گے؟‘‘

ایک نوجوان نے جو بظاہر اس گروہ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، جواب دیا:

’’ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کے پمفلٹ کے متعلق وہ ہمیں ہدایت دے گئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آپ کو ایک سائیکلو اسٹائل مشین دے دی جائے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی مقامی لیگ کے پاس ایک سائیکلو اسٹائل مشین بھی نہیں ہے؟‘‘

’’بھئی! ہماری لیگ کے دفتر میں ایک ٹوٹا ہوا حقہ تھا، اب وہ بھی شاید پولیس اٹھا

کر لے گئی ہے۔''

''اچھا سلیم صاحب! آپ ہمارے ساتھ کچھ کام کرائیں گے یا جانا چاہتے ہیں؟''

''مجھے آپ حکم دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میں آج رات واپس پہنچ جاؤں۔ ہمارے علاقے میں پروپیگنڈے کا کوئی انتظام نہیں۔''

دس گیارہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے کہا ''ہم نے بیس ہزار اشتہار چھاپ دیے ہیں۔ بڑی آپا کہتی ہیں، بلیٹن کا مضمون دیجیے اور کاغذ کا انتظام بھی کیجیے۔''

لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور نوجوان نے سلیم کی طرف متوجہ کر کہا:

بھئی! ہماری بہنوں نے بہت کام کیا ہے۔ یہ ہمیں ایک لمحہ بیکار نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اچھا ہوا آپ کا پمفلٹ آ گیا۔ ہم انہیں چند گھنٹے اور مصروف رکھ سکیں گے۔۔۔۔ اچھا آپ جائیں۔ اصغر وہ سوٹ کیس سلیم صاحب کو دے دو لیکن بھائی ذرا احتیاط کرنا۔ آج کل پولیس ان چیزوں کو بم سے زیادہ خطرناک سمجھتی ہے۔ اگر پکڑے جاؤ تو پولیس والوں کو اس جگہ کا پتہ نہ دینا۔ اگر کہو تو تمہارے ساتھ امرتسر تک کسی کو بھیج دیں۔

سلیم نے کہا ''میرے ساتھ ایک آدمی ہے، میں اسے اڈے پر چھوڑ آیا ہوں۔''

☆☆☆☆☆

شام کے پانچ بجے سلیم اور اس کا ساتھی موٹر پر دوبارہ امرتسر پہنچے تو کریم بخش حلوائی کی دکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ موٹر سے اترتے وقت صدیق کی نگاہ اچانک اس پر جا پڑی اور اس نے سلیم سے کہا ''ارے یار وہ بدمعاش ابھی تک یہاں ہے۔''

''کون؟''

کریم بخش اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔

سلیم نے کہا ''دیکھو صدیق، اگر معاملہ خراب ہو گیا تو میں اس کے ساتھ نپٹنے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں اگر سوٹ کیس لے کر بھاگنے کا موقع مل جائے تو میری پروانہ کرنا۔ امرتسر میں کسی کو جانتے ہو؟''

''میرے یہاں کئی رشتہ دار ہیں۔''

اتنی دیر میں کریم بخش دوکان سے اٹھ کر ان کے قریب آ چکا تھا ''چودھری جی! بہت جلد آ گئے آپ لاہور سے؟'' اس نے آتے ہی کہا۔

''جی ہاں! مجھے وہاں کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔''

''آج رات میرے پاس ٹھہریں۔''

''مہربانی! لیکن مجھے گھر میں بہت ضروری کام ہے۔''

''کوئی جلسہ ولسہ ہو گا؟''

''ہاں! جلسے بھی تو ہوتے رہتے ہیں اچھا خدا حافظ! اب دیر ہو رہی ہے۔ کہیں گورداسپور کی موٹر نہ نکل جائے۔''

''موڑیں بہت آپ فکر نہ کریں میاں محمد صدیق، آپ کو تو شاید سیالکوٹ جانا تھا؟''

صدیق کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک غلطی کر چکا ہے۔

اس نے گھبرا کر جواب دیا ''بس جی! میں بھی ان کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔''

کریم بخش نے سلیم سے کہا ''صبح شاید آپ کے پاس یہ سوٹ کیس نہیں تھا؟''

سلیم نے جواب دیا ''نہیں، میرا سامان لاہور میں پڑا ہوا تھا۔ صدیق چلو! دیر ہو رہی ہے۔ اچھا حوالدار صاحب! السلام علیکم!''

حوالدار نے کہا ''اس اڈے پر تو کوئی لاری نہیں ہے۔ دوسرے اڈے پر آپ کو لاری مل جائے گی۔ چلئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔۔۔۔۔ لایئے! میں اٹھا لیتا ہوں آپ کا سوٹ کیس۔''

''نہیں! مہربانی، یہ بھاری نہیں ہے۔''

صدیق نے کہا ''لایئے میں اٹھا لیتا ہوں''

سلیم نے سوٹ کیس صدیق کے ہاتھ میں دے دیا۔ پولیس کا ایک سپاہی سڑک پر لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ کریم بخش نے چلتے چلتے مڑ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ سلیم اس کی یہ حرکت دیکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے سامنے سڑک پر جانے والے کسی آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ارے صدیق! وہ منور جا رہا ہے، بلاؤ اس گدھے کو'' اور صدیق ''منور! منور! ارے منور کے بچے!!'' کہتا ہوا تیزی سے آگے چل دیا۔ آن کی آن میں صدیق کوئی تیس قدم آگے جا چکا

تھا۔

حوالدار اور کانسٹیبل پریشانی کی حالت میں سلیم کے قریب کھڑے تھے اچانک کریم بخش سلیم کا بازو پکڑ کر چلایا ''گنڈا سنگھ، بھاگو اس سوٹ کیس والے کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ بھاگ رہا ہے۔ سیٹی بجاؤ!''

گنڈا سنگھ سیٹی بجاتا اور لاٹھی ہلاتا ہوا بھاگا لیکن صدیق کی رفتار اس سے بہت تیز تھی۔ رائے عامہ پولیس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔ ایک ہٹے کٹے نوجوان نے اچانک اپنی ٹانگ آگے کر دی اور گنڈا سنگھ ''تیری ماں۔۔۔۔۔'' کہہ کر منہ کے بل گر پڑا۔۔۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔

وہ غضب ناک ہو کر اٹھا۔ سوٹ کیس والے مجرم سے زیادہ اسے ٹانگ پھنسانے والے کی تلاش تھی۔

''کیا ہوا سنتری جی؟'' ایک عمر رسیدہ بنیے نے آگے بڑھ کر سوال کیا اور گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

اتنی دیر میں کریم بخش بھی سلیم کا بازو پکڑے ہوئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ چلایا ''گنڈا سنگھ بھاگو اس کا پیچھا کرو۔''

گنڈا سنگھ دوبارہ بھاگا لیکن اب اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے۔ ''صدیق سامنے مظاہرین کے ایک جلوس میں غائب ہو چکا تھا۔''

دو اور کانسٹیبل کریم بخش کے پاس پہنچ چکے تھے، اور وہ انتہائی غضبناک لہجے میں سلیم سے کہہ رہا تھا ''بابو جی! بتاؤ اس سوٹ کیس میں کیا تھا اور اسے کہاں بھیجا ہے تم

نے؟''

سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا ''تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو تم ہو کون؟''

ایک سپاہی نے کہا ''حوالدار صاحب کے ساتھ ہوش سے بات کرو''

''اچھا یہ حوالدار صاحب ہیں؟''

کریم بخش چلایا ''لے چلو اسے تھانے میں اس کے پاس بم تھے۔''

☆☆☆☆☆

پولیس کی مار پیٹ کے بعد سلیم حوالات میں منہ کے بل پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ تھانیدار اپنے علاقے میں گشت کرنے کے بعد رات کے آٹھ بجے واپس آیا اور دو سپاہی سلیم کو حوالات سے نکال کر اس کے سامنے لے گئے۔

سلیم کو تھانیدار کی میز کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سلیم کے دانتوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ تھانیدار نے تھوڑی دیر میز پر پڑے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کرنے کے بعد سلیم کی طرف دیکھا۔ دونوں پہلی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ سب انسپکٹر منصور علی کالج میں اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ندامت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلیم کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ چند سیکنڈ قریب پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینے کے بعد فرش پر گر کر بیہوش ہو گیا۔ تھانیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ مکر کرتا ہے جی!'' ایک سپاہی نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

تھانیدار نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا اور سپاہی دہلیز کے پاس جا گرا اور پھر اس نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''گنڈا سنگھ! اس کی پیٹی اتار لو۔ میراں بخش! اس کے لیے پانی لاؤ!''

تھوڑی دیر بعد سلیم کو ہوش آ چکا تھا۔ تھانیدار کے حکم سے سپاہیوں نے اسے برآمدے میں چارپائی پر لٹا دیا۔

وہ سپاہی جس نے ٹھوکر ماری تھی، پریشانی، اور گنڈا سنگھ جسے اس کی پیٹی اتارنے کا حکم ملا تھا، تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

تھانیدار نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''اسے کس نے مارا ہے؟''

سپاہی گنڈا سنگھ اور میراں بخش کی طرف دیکھنے لگے۔

گنڈا سنگھ بولا ''جی اس کے پاس بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تھا، ہم نے حوالدار صاحب کے حکم سے اسے مارا ہے۔''

''اچھا۔ وہ بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کہاں ہے؟''

''جی اسے ایک اور آدمی لے کر بھاگ گیا ہے۔''

''سوٹ کیس والا بھاگ گیا اور جو خالی ہاتھ تھا، تم اسے پکڑ کر یہاں لے آئے یہی بات ہے نا؟''

''جی ہاں!''

''شاباش! تم بہت سمجھدار آدمی ہو، لیکن اسے پکڑ کر کیوں نہ لائے جس کے پاس بم تھے، وہ کہاں ہے؟''

''جی اسی کے متعلق تو ہم پوچھ رہے تھے اس سے یہ تین دفعہ بیہوش ہوا ہے لیکن نہیں بتاتا کہ وہ سوٹ کیس والا کہاں گیا ہے؟''

تھانیدار چلایا ''لیکن تم نے اسے کیوں نہیں پکڑا، اپنے اس باپ کو کیوں پکڑ کر لائے؟''

''جی میں گر پڑا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔''

''تم نے اس کا سوٹ کیس دیکھا تھا؟''

''جی دیکھا تو تھا''

''کیا رنگ تھا اس کا؟''

''شاید سبز تھا''

''تم نے بم دیکھے تھے؟''

''جی نہیں، حوالدار صاحب نے دیکھے ہوں گے''

''تھانیدار نے گرج کر کہا'' حوالدار کہاں ہے؟

''جی وہ ابھی تھک کر گئے ہیں''

''کیسے تھک گیا وہ؟''

''جی ملزم کو پیٹ کر۔ وہ کہتے تھے میں تھک گیا ہوں، ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں۔''

حوالدار داخل ہوا۔ اور اس نے آتے ہی کہا ''جی مجھے بلایا ہے؟''

''ہاں! تم نے کوتوالی میں مجھے ٹیلی فون کیا تھا کہ تم نے کہیں بم دیکھے ہیں، کہاں

ہیں وہ؟''

''جی وہ سوٹ کیس لے کر بھاگ گیا ہے، یہ اس کا ساتھی ہے۔میں اسے جانتا ہوں''

''اور تم نے سوٹ کیس میں بم دیکھے تھے؟''

''نہیں! مجھے شک ہے بلکہ یقین ہے یہ صبح لاہور گئے تھے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔''

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا''کیوں گنڈا سنگھ امرت سر اور لاہور کے درمیان صبح سے شام تک کتنے آدمی سفر کرتے ہیں؟''

''جی ہزاروں''

''اچھا یہ بتاؤ، وہ سب بموں کا کاروبار کرتے ہے؟''

''جی نہیں''

حوالدار نے کہا''جی ان کے پاس سوٹ کیس تھا صبح جب وہ گئے تھے۔۔۔ تو۔۔۔''

تھانیدار نے پھر اس کی بات کاٹ دی''اچھا یہ بات ہے کیوں گنڈا سنگھ! اگر امرتسر اور لاہور کے درمیان سفر کرنے والے کسی آدمی کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھو تو تم اسے گولی مار دو گے؟''

گنڈا سنگھ نے گھبرا کر کہا''جی وہ کیوں؟''

''کیونکہ تمہارے حوالدار کا خیال ہے کہ سوٹ کیس میں بموں کے سوا کچھ نہیں

ہوتا۔“

”جی اگر حوالدار صاحب حکم دیں تو پھر مجھے گولی چلانی پڑے گی، ورنہ ہر سوٹ کیس میں بم تو نہیں ہوتے۔“

کریم بخش نے کہا ”جی! میں آپ کو سارا واقعہ سناتا ہوں“

تھانیدار نے گرج کر کہا ”میں کچھ نہیں سنتا تم نے ایک شخص کو بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا کر بھاگنے کا موقع دیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو تم پرلے درجے کے بیوقوف ہو کہ اسے چھوڑ کر دوسرا آدمی پکڑ لائے۔ اگر یہ غلط ہے اور اس شخص کو تم نے بلاوجہ مارا ہے تو بھی میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ ایس، پی شاید یہ بات برداشت نہ کرے کہ امرتسر میں کوئی شخص بموں کا ایک سوٹ کیس بھر کر لایا ہے اور دو آدمی اسے پکڑ نہیں سکے۔ تم گنڈا سنگھ کو لے جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ اور میں ایس پی کو ٹیلی فون کرتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے انعام تیار رکھے۔“

کریم بخش ملتجی ہو کر بولا ”خان صاحب! ہوسکتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہو لیکن میں انہیں جانتا ہوں، یہ اور اس کا ساتھی دونوں سخت لیگی ہیں۔۔۔۔ الیکشن کے دنوں میں۔۔۔۔“

تھانیدار نے کہا ”کیوں گنڈا سنگھ، آج شہر میں کتنے مسلم لیگیوں کا جلوس نکلا ہے؟“

”وہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے“

”اپنے حوالدار سے کہو، ان سب پر بم رکھنے کے جرم میں مقدمہ چلائے“

''ہاں کریم بخش! اس سوٹ کیس کا رنگ کیا تھا؟''

''جی سیاہ تھا''

''کیوں گنڈا سنگھ کیا رنگ تھا اس کا؟''

گنڈا سنگھ تھانیدار کے تیور دیکھ چکا تھا، وہ بولا ''جی میں نے جو سوٹ کیس دیکھا تھا، وہ تو شاید سبز تھا۔''

کریم بخش نے بدحواس ہو کر کہا ''خدا کی قسم! سیاہ تھا''

تھانیدار نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا ''کریم بخش! صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس سے ذاتی عداوت کا بدلہ لینا چاہتے ہو تم نے بہت زیادتی کی ہے میں سول سرجن کو فون کرتا ہوں۔''

کریم بخش نے کہا ''خان صاحب آدمی سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔''

''لیکن آئندہ میں ایسی غلطی برداشت نہیں کروں گا وہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے اب مجھے تمہاری طرف سے معافی مانگنی پڑے گی۔''

گنڈا سنگھ نے کہا ''جی یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے حوالدار صاحب نے اس کی پیٹھ پر تیس بید مارے ہیں لیکن گالی دینا تو درکنار اس نے اف تک نہیں کی۔''

تھانیدار نے کہا ''میراں بخش اسے ویگن میں لٹادو۔''

☆☆☆☆☆

رات کے دس بجے پولیس کی ویگن شہر کی ایک گلی میں آ کر رکی۔ سب انسپکٹر منصور علی نے نیچے اتر کر ٹارچ کی روشنی میں ایک مکان کا سائن بورڈ دیکھتے ہوئے کہا ''بھئی یہی مکان ہے۔''

پھر اس نے سلیم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر موٹر سے اتارا اور کہا ''چلو تمہیں پہنچا آؤں۔''

''نہیں آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں''

منصور علی نے انگریزی میں کہا ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے پرسوں اس تھانے کا چارج لیا ہے اگر تم یہاں ہوئے تو میں کل یا پرسوں کسی وقت تم سے ملوں گا۔''

جب سلیم اس کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، منصور نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ''ہمت کرو غداروں کا اقتدار دم توڑ رہا ہے۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔ ڈرائیور چلو۔''

موٹر چلی گئی اور سلیم تذبذب کی حالت میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد ڈگمگاتا ہوا مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!! اس نے آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نحیف و لاغر آواز ڈیوڑھی اور صحن سے گزر کر سونے کے کمروں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ شاید گھر پر کوئی نہ ہو، شاید وہ گاؤں چلے گئے ہوں اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ اپنے سر کو جو درد سے

پھٹ رہا تھا، دونوں ہاتھوں میں دبا کر دہلیز کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر ہاتھ سے دروازہ ٹٹولنے لگا۔ باہر کی کنڈی کھلی تھی اس نے ہمت کر کے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

گلی کی دوسری طرف سے کسی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا ''کون ہے؟''

سلیم کو یہ آواز بے حد ناخوشگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلانے والے کی مداخلت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے آواز دی ''ڈاکٹر صاحب!''

پڑوسی نے کہا ''ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو گئے ہیں'' سلیم کا دل بیٹھ گیا۔ پڑوسی نے پھر کہا ''بھئی اگر گھر والوں سے کوئی کام ہے تو گھنٹی بجاؤ۔''

سلیم کو اب تک گھنٹی کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے تاریکی میں ہاتھ مارنے کے بعد گھنٹی کا بٹن دبایا اور دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگا۔ قریباً ایک منٹ کے بعد اسے مکان کے اندر چند مانوس آوازیں سنائی دینے لگیں اس نے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کسی نے ڈیوڑھی میں بجلی کی بتی جلائی اور دروازے کی دراڑ اور روزن سے روشنی نمودار ہونے لگی۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی

سلیم نے نحیف آواز میں کہا ''میں ہوں، سلیم!''

ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور راحت نے باہر جھانکتے ہوئے سوال کیا ''بھائی جان آپ؟ اس وقت؟''

سلیم جواب دیے بغیر لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر راحت کی ماں اور اس کے پیچھے عصمت کھڑی تھی اچانک راحت کو سلیم کے قمیض اور کوٹ پر خون کے دھبے اور چہرے پر ضربوں کے نشان دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کرتی ہوئی چلائی ’’امی جان! یہ زخمی ہیں؟‘‘

ماں نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا ’’بیٹا! کیا ہوا تمہیں؟‘‘

سلیم نے اپنی نیم وا آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ’’میں پولیس کے قابو آ گیا تھا‘‘

ماں نے کہا ’’چلو بیٹا اندر چلو!‘‘

سلیم نے کہا ’’چلئے میں ٹھیک ہوں یوں ہی چکر آ گیا تھا‘‘ معاً سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر گردن جھکا لی۔۔۔ عصمت جو ابھی تک چند قدم دور بے حس و حرکت کھڑی تھی، اچانک آگے بڑھی۔ امی! یہ بیہوش ہو رہے ہیں! یہ کہتے ہوئے اس نے سلیم کا دوسرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سلیم جیسے خواب کی حالت میں کہہ رہا تھا ’’میں ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں یونہی چکر آ گیا تھا۔ اس نے میرے سر پر ٹھوکریں ماری ہیں۔‘‘

عصمت اور اس کی ماں اسے سہارا دے کر کمرے میں لے گئیں اور وہ بدستور کہہ رہا تھا ’’آپ چھوڑ دیں، آپ چھوڑ دیں آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔‘‘

ماں نے کہا ’’بیٹا! لیٹ جاؤ یہاں!‘‘

اس نے گردن اٹھائی بستر کی طرف دیکھا اور بے اختیار منہ کے بل اس پر گر پڑا۔

عصمت نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے منہ پر دوائی لگاتے ہوئے کہا ''امی! یہ پولیس والے بالکل قصاب بن گئے ہیں دیکھیے! یہ بیدوں کے نشان ہیں۔راحت جلدی سے پانی گرم کرو۔سر کے زخم پر خون جم گیا ہے۔''

جب عصمت اس کے سر پر گرم پانی سے ٹکور کر رہی تھی، سلیم نے آنکھیں کھولیں عصمت کی ماں نے جھک کر پوچھا ''کیوں بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟''

''جی میں بالکل ٹھیک ہوں''

عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا ''امی جان انہیں بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔''

ماں نے مسکرا کر کہا ''بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!''

عصمت نے زخم پر پھاہا رکھ کر پٹی باندھی اور اس کے بعد میز سے گلاس اٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ پی لیجئے!''

سلیم نے اٹھ کر گلاس پکڑ لیا اور متذبذب سا ہو کر عصمت کی طرف دیکھنے لگا اس کی ماں نے کہا ''پی لو بیٹا!''

''سارا؟'' اس نے پریشان ہو کر کہا

راحت بولی ''یہ دوا نہیں، پانی اور گلوکوز ہے۔''

میٹھے پانی کا گلاس پینے کے بعد سلیم نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب کب گرفتار ہوئے تھے؟''

عصمت کی ماں نے کہا پولیس انہیں کل شام پکڑ کر لے گئی۔ وہ مظاہرہ کرنے کے لیے باہر کے دیہات سے پانچ سو آدمیوں کا جلوس لے کر شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارا نوکر بھی ان کے ساتھ گرفتار ہو گیا ہے۔

''میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی اب آپ آرام کریں۔''

''بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے میں تم سے سب باتیں صبح پوچھوں گی۔۔۔۔ اب تم آرام کرو ڈاکٹر صاحبہ مجھے گھور رہی ہیں۔''

ساتھ والے کمرے سے امجد آنکھیں ملتا ہوا آیا اور بستر پر سلیم اور اس کے گرد اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا ''بھائی جان کو کیا ہوا؟'' وہ بولا

''کچھ نہیں، چلو بیٹا سو جاؤ''

''نہیں امی جان! پہلے بتائیے نا بھائی جان کو کیا ہوا ہے؟''

''آؤ! بتاتی ہوں'' ماں اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

راحت نے کہا ''بھائی جان! اب آپ کے سر میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟''

''نہیں، آپ آرام کریں''

عصمت نے راحت کو اشارے کے ساتھ کچھ سمجھایا اور اس نے کہا

''بھائی جان! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپا جان کا خیال ہے کہ آپ کو ایک انجکشن دے دیا جائے۔''

ماں نے دوسرے کمرے سے کہا ''ہاں بیٹی! انجکشن ضرور دے دو۔''

سلیم نے کہا ''ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ

نہیں۔"

عصمت نے اپنے باپ کے تھیلے سے انجکشن لگانے کا سامان نکالا۔ پانی ابال کا پچکاری کو صاف کیا۔ دوا بھری راحت، سلیم کی قمیص کی آستین اوپر چڑھا کر سپرٹ لگا رہی تھی کہ ماں نے آواز دی "بیٹی! ذرا احتیاط کرنا"

عصمت ہچکچائی ہوئی آگے بڑھی، سکول کے اس بچے کی طرح جو امتحان دینے کے لیے جا رہا ہو، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔۔۔۔ سلیم نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عصمت نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اچانک سوئی بازو میں اتار دی اور راحت نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انجکشن لگانے کے بعد عصمت نے راحت کی طرف مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ماں نے دروازے میں آ کر کہا "کیوں بیٹی لگا دیا انجکشن؟"

اس کے منہ سے حیا میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی "جی ہاں!"

امجد اپنی چارپائی سے اٹھا اور نظر بچا کر دبے پاؤں چلتا ہوا راحت کے پاس آ پہنچا "آپا! ان کو کیا ہوا ہے؟"

ماں نے کہا "دیکھو بے ایمان میں سمجھتی تھی یہ سو گیا ہے۔ چلو بیٹی جب تک تم یہاں ہوا سے نیند نہیں آئے گی۔"

وہ دوسرے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئیں سلیم دیر تک جاگتا رہا۔ قدرت اسے اس کی توقع کے خلاف یہاں تک لے آئی تھی اب اسے

پولیس کے ڈنڈوں کا کوئی افسوس نہ تھا۔عصمت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھے تھے، اوراس کے نزدیک ان زخموں کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔۔۔۔اس کے کانوں میں وہ میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی۔وہ ان کانپتے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کا تصور کررہا تھا، وہ ان آنکھوں کا تصور کررہا تھا جن میں محبت کے دریا موجزن تھے اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ حسین چہرہ آرہا تھا جس میں دودھ شہداور گلاب کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

صبح کے وقت راحت نے سلیم کے بستر کے قریب تپائی پر چائے اور ناشتہ رکھتے ہوئے کہا ''بھائی جان! چائے پی لیجئے ابھی ڈاکٹر صاحبہ تشریف لانے والی ہیں۔''

سلیم نے پوچھا ''راحت تمہاری آپا ڈاکٹر کب سے بن گئیں؟''

راحت نے دروازے سے دوسرے کمرے میں جھانک کردیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی سلیم کی طرف متوجہ ہوئی ''بھائی جان! آپ کو معلوم نہیں؟ آپا جان تو اس شہر کی بہت مشہور ڈاکٹر ہیں انہیں نزلے اور زکام کا علاج آتا ہے کھانسی کی گولیاں مفت تقسیم کرتی ہیں گلی کے بچوں کی آنکھوں میں دوائی بھی ڈال دیتی ہیں۔''

امجد نے اندر داخل ہوکر کہا ''بھائی جان! آپا جان سے آنکھوں میں دوائی نہ ڈلوانا بہت لگتی ہے کان کے درد کو بھی ان کی دوائی سے کوئی آرام نہیں آتا۔''

عصمت شرماتی اور جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، امجد اس کے تیور دیکھ کر دوسرے دروازے سے صحن کی طرف نکل گیا۔راحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب مبارک ہو! آپ کا علاج کامیاب ہے۔''

عصمت کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ ایک نظر سلیم کی طرف دیکھنے کے بعد بولی ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں'' سلیم نے جواب دیا

راحت بولی ''اجی اتنے مشہور ڈاکٹر کا علاج ہوا اور آپ ٹھیک نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

عصمت نے گھور کر راحت کی طرف دیکھا ''بڑی چڑیل ہو تم؟''

''ڈاکٹر بننا بری بات تو نہیں'' سلیم نے کہا

عصمت نے کہا ''جی یہ مذاق کرتی ہے میں نے میٹرک کے بعد فسٹ ایڈ سیکھی تھی اور انہوں نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا۔''

سلیم نے کہا ''بہر حال مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک اچھے ڈاکٹر سے مجھے اس سے بہتر علاج کی توقع نہ تھی۔''

''جی مجھے ابا جان نے چند دوائیاں بتا دی ہیں''

عصمت کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے سلیم کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''بیٹا! میں پچھلے پہر تمہیں دیکھنے کیلئے آئی تھی، تم سو رہے تھے۔ اب طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''جی ہاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں''

''تم یہاں پولیس کے ہاتھ کیسے آ گئے بیٹا؟''

عصمت اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن ماں کا یہ سوال سن کر وہ

دروازے کے قریب رک گئی۔۔۔۔۔ ماں نے کہا "بیٹی بیٹھ جاؤ" اور وہ جھجکتی ہوئی کمرے کے کونے میں کرسی پر بیٹھ گئی سلیم نے مختصراً اپنی سرگذشت سنادی۔

عصمت کی ماں نے کہا "بیٹا! یہ وزارت کب ختم ہوگی؟"

سلیم نے جواب دیا "یہ ہماری ہمت پر منحصر ہے میرے خیال میں اگر مسلمانوں کا یہی جوش وخروش رہا تو موجودہ حکومت دو ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکتی۔"

ماں بولی "ارشد کے ابا کا بھی یہی خیال تھا۔"

تیسرے دن سلیم وہاں سے یہ احساس لے کر رخصت ہو رہا تھا کہ عصمت اس کے دل و دماغ اور روح کی پرواز کا مرکز بن چکی ہے۔ اس نے اس کے ساتھ بہت کم باتیں کی تھیں اور شائد کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اس کے دل کی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی۔ تاہم سلیم نے ہر لفظ کے ساتھ اس کے سادہ اور معصوم دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔ وہ ان جھکی جھکی اور شرمائی ہوئی نگاہوں کو دیکھ چکا تھا جو کہہ رہی تھیں "میں تمہاری ہوں، میں روز ازل سے تمہاری ہوں اور تم میرے ہو، ہمیشہ کے لیے میرے!"

عصمت کی ماں نے رخصت کے وقت سلیم کو ایک لفافہ دے کر تاکید کی تھی کہ وہ اسے اپنی ماں کے سوا کسی کو نہ دکھائے اور سلیم دیکھے بغیر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس خط کا اس کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

☆☆☆☆☆

یونینسٹ وزارت کے ہندو سرپرستوں کا خیال تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا جوش وخروش ہنگامی ہے اور اسے پولیس کی لاٹھیوں سے ٹھنڈا کرنے کے بعد شمال مغرب میں ہندو فاشزم کی یلغار کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ نے کسی منظم پروگرام اور تیاری کے بغیر یہ تحریک چلائی ہے اور جس طرح انگریز نے کئی بار اگلی صف کے لیڈروں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر کر کے کانگرس کی بڑی سے بڑی تحریک کو ٹھنڈا کر دیا تھا، اسی طرح مسلم لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم عوام کا مورچہ ٹوٹ جائے گا لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈروں کی جماعت کی تحریک نہ تھی۔ خضر نے ہندو مقاصد کی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ کر پنجاب کے مسلم جمہور کو چیلنج دیا تھا اور اس چیلنج کے بعد اسے معلوم ہوا کہ لیگ اور پنجاب کے ننانوے فی صدی مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ اجتماعی خطرہ اجتماعی قوت مدافعت کو بیدار کر چکا تھا اور کرائے کے وہ ٹٹو جنہیں ہندو نے وزارت کا توبرا دکھا کر اقتدار کے رتھ میں جوت لیا تھا، اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ دلدل میں پاؤں رکھ چکے ہیں۔

پاکستان کے نعرے کو جو تقویت برسوں میں حاصل نہ ہوئی تھی، وہ اس چونتیس دن کی عملی جدوجہد میں حاصل ہو چکی تھی بالآخر خضر حیات خان کانگرس کے رتھ سے اچانک اپنا رسا تڑا کر بھاگا اور گورنر نے مجبوراً مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیل وزارت کی دعوت دی لیکن کانگرس اس صورت حالات کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ مکڑی جس نے

برسوں کی محنت سے مکروفریب کے سنہری تاروں کا جال تیار کیا تھا، منہ میں آیا ہوا شکار جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئی۔ ہندو ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس لیے حکمران تھا کہ وہاں ہندو کی اکثریت تھی ہندو مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس لیے برسر اقتدار رہنا چاہتا تھا کہ وہاں بعض ماؤں نے ملت فروشوں کو جنم دیا تھا۔ اب ہندو اس لیے برہم تھا کہ پنجاب کی مسلم اکثریت اس کے تسلط سے آزاد ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک پنجاب میں مسلم اکثریت کی نمائندہ وزارت کا قیام پانچ دریاؤں کی سرزمین کے عملی طور پر پاکستان میں شامل ہو جانے کے مترادف تھا، اس لیے پنجاب میں بھی کانگرس کو اپنا قدیم چولا تبدیل کرنا پڑا۔ مسلمان بھی عدم تشدد کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ رہے تھے۔ کانگرسی فاشزم اپنے قدیم ہتھیار بے کار دیکھ کر نئے حربوں کے ساتھ میدان میں آچکا تھا۔ گاندھی کی آتما تارا سنگھ کی زبان سے بول رہی تھی ''ہندوؤ اور سکھو! تمہارے امتحان کا وقت آچکا ہے۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہماری ماتر بھومی خون کے لیے پکار رہی ہے ہم خون کے ساتھ اس کی پیاس بجھائیں گے۔ ہم نے مغلستان کو ختم کیا تھا اور ہم پاکستان کو پاؤں تلے روندیں گے۔ ہم زندہ رہیں یا مر جائیں لیکن پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار قبول نہیں کریں گے۔''

ڈاکٹر گوپی چند کہہ رہا تھا ''ان دنوں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں سے کوئی بھگوڑا بن کر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔''

ہندو اور سکھ پریس بیک زبان چلا رہا تھا۔ ''ہم ایسے حالات پیدا کر دینا اپنا فرض

سمجھتے ہیں جن کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کا قیام ناممکن ہو جائے۔"
چنانچہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے۔ کانگرس، سکھوں اور سنگھیوں کی قوت کے
بل بوتے پر اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ماسٹر تارا
سنگھ کو پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ محاذ کا لیڈر بنایا گیا۔ اس نے
پنجاب اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی کرپان بے نیام کی اور مسلمانوں
کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ گاندھی کے امن پسند چیلے سکھوں کی تیاریوں کے
پیش نظر پنجاب میں بہار کی تاریخ دہرانے کے متعلق پر امید تھے لیکن ان کی یہ توقع
غلط ثابت ہوئی۔ ماسٹر تارا سنگھ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکا کہ "سکھ پنجاب سے مسلمانوں
کو نکال کر دم لیں گے" ماسٹر تارا سنگھ کے سورما اٹک تک پہنچے بغیر دم نہ لینے کا عہد کر
کے میدان میں آئے تھے لیکن بھارت کے بیٹے حیران تھے کہ امرتسر اور لاہور کے
بازاروں میں نہتے مسلمان ان سورماؤں کی کرپانیں چھین رہے ہیں ــــــ
راولپنڈی، ملتان اور دوسرے شہروں میں بھی وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکے۔
سکھوں کا سب سے بڑا محاذ امرتسر تھا ــــــ امرتسر کے گوردوارے اور
مندر ان افواج کے باورچی خانے تھے جو پنجاب کے مسلمان کے ذہن سے پاکستان کا
تصور مٹانے کے لیے میدان میں آنے والی تھیں لیکن ان فوجوں کی کامیابیاں
مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو جلانے اور عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے تک
محدود رہیں۔ امرتسر کے مسلمانوں نے چانک حملے کے باعث شروع میں کافی
نقصان اٹھایا۔ سکھوں نے نہتے راگیروں پر بندوقوں اور پستولوں سے نشانہ بازی

کی مشق کی بچوں اور عورتوں پر اپنی کرپانوں کی دھار کی تیزی آزمائی لیکن جب باہمت نوجوانوں کا ایک گروہ میدان میں آ گیا تو یہاں بھی لاہور اور دوسرے شہروں کی طرح یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ سفاکی اور بزدلی ایک ہی برائی کے دو نام ہیں۔

پنجاب کے مسلمان زیادہ دیر خاموش تماشائیوں کی حیثیت میں سکھوں اور ہندوؤں کو اپنے گھر جلانے کی اجازت نہ دے سکے۔ انہوں نے ان کرپانوں کو چھیننے کی کوشش کی جو رام راج کے قیام کے لیے بے نیام ہوئی تھیں۔ اس لیے کانگرس کی نظر میں وہ مفسد تھے۔ انہوں نے اکالی دل، سیوا دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو سورماؤں کو بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتل عام سے روکا لہٰذا وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست تھے۔ ان کی قوت مدافعت نے کانگرس کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ وہ سکھوں کی قوت کے بل بوتے پر پنجاب کو اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر سکتی ہے۔ اس لیے کانگرس جو ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کو گائے کے دو حصوں میں کٹ جانے کے مترادف قرار دے چکی تھی، اب پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بنگال اور آسام کو بھی تقسیم کروانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔ اور تقسیم کے لیے کانگرس کے یہ دلائل تھے کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تو مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے علاقوں کی ہندو اکثریت کو بھی پاکستان میں مسلم اکثریت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں ہندو اور دوسری اقلیتوں کے جان و مال اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لیے ان صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔

ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو کانگریس کا یہ استدلال پسند آ گیا۔اس لیے 3 جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔آسام کے ضلع سلہٹ ،صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے ریفرنڈم تجویز ہوا۔

☆☆☆☆☆

یہ کہنا غلط ہو گا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم فسادات کا نتیجہ تھی فسادات بہار، یو پی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی ہوئے تھے، اور ان صوبوں میں ایسے علاقے بھی تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اگر مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے ہندو کو پاکستان کی مسلم اکثریت سے خطرہ تھا تو بہار، یو پی اور دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے کم خطرہ نہ تھا۔اگر پنجاب اور بنگال کے دو کروڑ غیر مسلموں کو پاکستان کے وسیع اور زرخیز علاقے کاٹ کر دیے جا سکتے تھے، تو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی ہندوستان کے بعض حصوں پر اپنا حق رکھتے تھے۔ اگر ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم ہوتی تو دس کروڑ مسلمان ایک چوتھائی سے زیادہ کے حق دار تھے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یو پی، بہار اور آسام کے کچھ حصے پاکستان میں شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں بھی مسلمانوں کی ایک پاکٹ بنتی تھی۔

لیکن ایسا نہ ہوا ہندو اور انگریز کی سازش نے ایسا نہ ہونے دیا۔پنجاب اور بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی تھی، اور وہ اس بے انصافی کا مقابلہ کرنے

کے لیے تیار نہ تھے۔ قدرت انہیں یہ سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ قوم جو بے انصافی اور بد دیانتی کے خلاف لڑنے کی ہمت نہیں رکھتی، دیانت اور انصاف کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں نے آزاد وطن کی تمنا کی تھی انہوں نے زندہ ہو اور زندہ رہنے دو کا اصول پیش کیا تھا۔ ان کے لیڈروں نے پاکستان کے حق میں دلائل دیے تھے، نعرے لگائے تھے، تقریریں کی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان، انگریز، کانگرس اور ان کے درمیان منطق کی ایک گتھی ہے، اور جب یہ سلجھ جائے گی، پاکستان انہیں مل جائے گا لیکن بہت کم ایسے تھے جنہیں یہ احساس تھا کہ تاریخ کی بعض گتھیاں قلم اور زبان سے زیادہ نوک شمشیر کی محتاج ہوتی ہیں۔

مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے اس نا منصفانہ فیصلے کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری نہیں کی تھی۔۔۔۔ مسلم لیگ کے سپاہی بد قسمتی سے ابھی تک لکڑی کے گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے ڈیڑھ سو برس قبل ہندوستان کے راجوں اور نوابوں سے سودا بازی کی بدولت انگریزی سامراج کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اب یہ سامراج اپنا بوریا بستر باندھنے سے پہلے ہندو سرمایہ داروں سے سودا کر رہا تھا۔ فرنگی طبیب کسی راجے یا نواب کا علاج کرنے کے بعد اس کی ریاست میں اپنی قوم کے لیے تجارتی مراعات حاصل کیا کرتے تھے اور مونٹ بیٹن وہ جراح تھا جو انگریز تاجر اور ہندو مہاجن میں ناطہ جوڑنے کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی شاہ رگ کاٹ چکا تھا۔ مسلم لیگ کی آنکھیں بند نہ تھیں، وہ اس نشتر کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس کے پاس وہ ہاتھ

نہ تھے جو لارڈ مونٹ بیٹن کا نشتر پکڑ لیتے۔۔۔!مسلم لیگ مجبور تھی کہ اس نشتر کا چرکا برداشت کرے لیکن مونٹ بیٹن اور ہندو کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ زخم ان کی توقع سے کہیں زیادہ گہرا ہو گا۔۔۔اور مونٹ بیٹن کی ناانصافی کے بعد ریڈ کلف کی بددیانتی تاریخ انسانیت کے سب سے المناک حادثے کا باعث بن جائے گی۔

☆☆☆☆☆

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ دوئم

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006